سہ ماہی

پیغام آشنا

شمارہ-۲۱ (بہار)

اپریل تا جون، ۲۰۰۵ء

Marfat.com

Marfat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ٹائیٹل

۱۔ موسم بہار کا ایک منظر

بیک ٹائیٹل

۲۔ خوشنما بہاری پھول جنگل کے پس منظر میں

اندرونی ٹائیٹل

۳۔ بہشت زہرا (تہران) میں امام خمینیؒ کا مزار مبارک۔

اندرونی بیک ٹائیٹل

۴۔ طوس میں فردوسی کا مقبرہ اور مجسمہ

Marfat.com

Marfat.com

سہ ماہی

پیغام آشنا

شمارہ ۲۱

اپریل ۔ جون ۲۰۰۵ء

ایران اور پاکستان کے درمیان ثقافتی تعلقات کے بارے میں مطالعات اور تحقیقات پر مشتمل سہ ماہی مجلہ

مدیر اعلیٰ

علی اورسجی

کلچرل کونسلر اسلامی جمہوریہ ایران

مدیر اعزازی

ڈاکٹر محمد سلیم اختر

مدیر معاون

جاوید اقبال قزلباش

ثقافتی قونصلیٹ اسلامی جمہوریہ ایران

مکان نمبر 25 ' اسٹریٹ نمبر 27 ' F-6/2 ' اسلام آباد

فون نمبر: 8-2827937، فیکس: 2821771

http://islamabad.icro.ir

Marfat.com

از هر چه می رود سخن دوست خوشترست
"پیغام آشنا" نفس روح پرورست

سعدیؒ

دوست کی بات ہر چیز سے زیادہ خوبصورت ہے، اُس کے پیغام کا ملنا ایک روح پرور لمحہ ہوتا ہے۔

به این بهانه درین بزم محرمی جویم
غزل سرایم و "پیغام آشنا" گویم

اقبالؒ

اس بہانے سے بزم میں محرم راز کی تلاش کرتا ہوں، میں غزل سرا ہوں اور دوست کو پیغام دیتا ہوں۔

Marfat.com

اہم گزارشات

ایران اور پاکستان صدیوں سے دوستی اور اخوت کے بے شمار رشتوں میں منسلک ہیں۔پیغام آشنا کے اجراء کا مقصدِ وحید ان دونوں ملکوں کے درمیان اس خطے کی مشترکہ میراث اور دورِ حاضر میں زندگی کے مختلف شعبوں میں دیگر اشتراکات کے بارے میں مناسب شعور پیدا کر کے ان تعلقات کو مزید مضبوط اور مستحکم بنانا ہے۔ اس سلسلے میں پیغام آشنا برصغیر پاک و ہند کے اہلِ علم و قلم کے ہر قسم کے تعاون کا بالعموم اور پاکستانی دانشوروں کی تحریروں کا بالخصوص خیر مقدم کرتا ہے۔

❁ پیغام آشنا ہر سال چار مرتبہ شائع ہوتا ہے۔

❁ پیغام آشنا میں معمولاً غیر مطبوعہ علمی، تنقیدی، ادبی اور ثقافتی مقالات شامل کیے جاتے ہیں، جن میں تحقیقی رنگ غالب ہونا چاہیے۔ مطبوعہ مقالے کے لکھنے والے کو متعلقہ شمارہ کے اس نسخے کے علاوہ اعزازیہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔

❁ پیغام آشنا میں شائع ہونے والے مواد کے نفس مضمون کے بارے میں تمام تر ذمہ داری متعلقہ مصنف و مترجم پر عائد ہوتی ہے اور ادارہ کا تمام حقائق، آراء اور تعبیرات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

❁ بغرض اشاعت ارسال کیے گئے تمام مضامین کاغذ کے ایک طرف ٹائپ یا صاف ستھرے خط میں، دونوں جانب مناسب حاشیے کے ساتھ لکھے ہوئے ہونے چاہئیں۔ حوالہ جات اور حواشی مآخذ کی ضروری تفاصیل کے ساتھ مقالے کی آخر میں منسلک کرنا نہ بھولیں۔ ضروری مکمل حوالوں کے بغیر موصول ہونے والے مقالات پیغام آشنا میں بالعموم شائع نہیں کیے جاتے۔

❁ پیغام آشنا میں کسی مقالے کی اشاعت کے لیے ادارہ کی طرف سے نامزد کردہ ماہرین کی تائید ضروری ہے اور اس سلسلے میں ادارہ ناقابل اشاعت تحریروں کی مصنفین کو واپسی کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔

❁ اشاعت کے لیے قبول کیے جانے والے مقالات میں ادارہ ضروری ادارتی ترمیم، تنسیخ اور تلخیص کا حق محفوظ رکھتا ہے۔

❁ پیغام آشنا میں اشاعت کے لیے جملہ نگارشات مدیر اعلیٰ، پیغام آشنا، کلچرل کونسلیٹ اسلامی جمہوریہ ایران، مکان نمبر 25، گلی نمبر 27، F-6/2، اسلام آباد۔ فون نمبر 8-2827937 فیکس نمبر: 2821771 کے پتے پر ارسال کی جاسکتی ہیں۔

❁ پیغام آشنا میں شائع شدہ مواد سے ماخذ کے ذکر کے بغیر استفادہ ممنوع ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

مجلس مشاورت

افتخار عارف	صدر نشین، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد
بشیر انور	سابق استاد، ایجوکیشن کالج، ملتان
صغریٰ بانو شگفتہ موسوی	سابق صدر شعبہ فارسی، نمل، اسلام آباد
ظفر اسحاق انصاری	ڈائریکٹر جنرل، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد
سید علی رضا نقوی	سابق صدر، شعبہ فقہ اسلامی، اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد
غضنفر مہدی	سیکرٹری، انجمن تاریخ و آثار، اسلام آباد
گوہر نوشاہی	استاد زبان و ادبیات اردو، دانشگاہ نمل، اسلام آباد
سید محمد اکرم شاہ	پروفیسر و صدر شعبہ اقبالیات، پنجاب یونیورسٹی، لاہور
محمد صدیق خان شبلی	سابق صدر شعبہ اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد
مرتضیٰ موسوی	سابق ڈائریکٹر جنرل، پاکستان نیشنل سنٹرز، اسلام آباد

☆☆☆

Marfat.com

فہرست

آرامگاہ نبوی صلی اللہ علیہ و الہ وسلم	افتخار احمد قادری	۱
دیگر متون کے مقابلے میں کتابت قرآن کا امتیاز	انٹرویو خانم زیبا مقصود کرمانشاہی	۶
علم بالوجی اور علم بالحواس کا باہمی تعلق	اللہ دتہ کمال	۱۴
گاہے گاہے باز خواں... جذباتی ہم آہنگی کے کچھ تاریخی واقعات	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	۲۲
تہذیبوں کے مابین مکالمہ، کیا، کیوں اور کس طرح؟	محسن اراکی	۴۹
تجلیل عمر خیام اور عطار نیشاپوری کی مناسبت سے آقای محمود محمدی عراقی کے پیغامات		۵۶
سعدی تفکر اور ثقافت کے نقطہ نظر سے	ڈاکٹر مہناز جعفریہ	۶۰
جشن نوروز اور وصف بہار	ڈاکٹر رشیدہ حسن	۷۴
جام ڈرک	مسز صوفیہ یوسف	۸۸
نواب یکتا اور اسکی فارسی مثنوی ہیر رانجھا	ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی	۹۶
ضلع اٹک کے بعض قدیم فارسی گو شعرا	راجہ نور محمد نظامی	۱۰۷
رباعی	نیساں اکبرآبادی	۱۱۷
نصاب شاعری اور فارسی بلتی لغت	ڈاکٹر محمد حسن عماچہ	۱۲۴

Marfat.com

جدید اردو شاعری پر فارسی روایت کی چھاپ	یوسف حسین	۱۲۸
مرزا ادیب۔ محبتیں اور روشنیاں	ثاقبہ رحیم الدین	۱۳۸
اردو انشائیہ کی جمالیات	پروفیسر جمیل آذر	۱۴۴
علامہ اقبال کے فارسی متون پر تحقیق کے مسائل	ڈاکٹر مہر نور محمد خان	۱۵۲
کلام اقبال میں ذکر حسینؓ	عاشق خواجہ جہانگرد	۱۵۹
اقبال اور ایران	محمد عباس	۱۶۵
اقبال کا ذوق جمال	ڈاکٹر فقیرا خان جدون فقری	۱۷۲
اقبال کا تصور خودی	یونس حسن	۱۸۹
کتاب محمود کشف المحجوب سید علی ہجویری	ڈاکٹر عارف نوشاہی	۱۹۸
دیوان امام خمینیؒ... صحیفہ عرفان (امام خمینیؒ کی برسی کی مناسبت سے)	جاوید اقبال قزلباش	۲۰۳
اردو ہے جس کا نام... ایک تاثر	رابعہ سرفراز	۲۱۰
لوح ایام	شفیق عجمی	۲۱۳

☆☆☆

Marfat.com

آرامگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حقائق و واقعات

افتخار احمد قادری ☆

حضرت علامہ نور الدین علی بن احمد السمہودیؒ (متوفی 911 ہجری، مدفون جنت البقیع، مدینہ منورہ) اپنی مشہور زمانہ کتاب وفاء الوفاء باخبارِ دار المصطفیٰؐ کے ابتدائیہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ آرامگاہِ نبوی کے متعلق میرے پاس ایسی معلومات ہیں کہ جن کا ذکر تاریخ مدینہ منورہ کی کسی بھی کتاب میں نہیں ملے گا کیونکہ مجھے اس مقام مقدس و مطہر پر حاضری کا شرف عظیم اور اس مقام عظیم کی مٹی کو آنکھوں کا سرمہ بنانے کی سعادت حاصل ہوئی۔

مسجد نبویؐ کی تعمیر کے وقت ازواج مطہراتؓ کے لیے جو حجرے تعمیر کیے گئے انہی میں سے ایک حجرہ مبارکہ حضرت عائشہؓ کے لیے بھی تعمیر ہوا جس کی دیواریں کچی اینٹوں سے اور چھت میں کھجور کے تنوں کو استعمال کر کے اوپر مٹی کا گارا لگایا گیا۔ بعد میں اسی حجرۂ مبارکہ میں نبی اکرمؐ نے پردہ فرمایا اور اس مقام مقدس کو تا قیام قیامت آپؐ کی آرامگاہ ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

جو ہے پیوست محبوب خدا کے جسم اطہر سے
زمین کا، عرشِ اعظم سے بھی وہ ممتاز ہے ٹکڑا

یہ وہی حجرۂ مقدسہ ہے جہاں آپؐ کو غسل مبارک دیا گیا اور پھر صحابہ کرامؓ اندر داخل ہو کر آپؐ پر سلام پیش کرتے رہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں فرشتوں کا نزول اور انوار و برکات کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ یہی وہ مقام مقدس ہے جو اللہ تبارک و تعالیٰ کے ہاں سب سے بہترین بقعہ مبارکہ ہے (عند اللہ خیر البقاع)۔ سفر ہجرت پر روانہ ہوتے وقت نبی اکرمؐ کے لب مبارک سے جو دعا نکلی اس کا قریب ترین ترجمہ کچھ اس طرح سے ہے: ''اے اللہ جب تو نے مجھے میرے محبوب شہر (مکہ مکرمہ) سے ہجرت کا حکم فرمایا ہے تو اب اپنے پسندیدہ ترین مقام پر سکونت عطا فرما!'' (حاکم نے اسے المستدرک میں روایت کیا ہے)۔

☆ افشاں کالونی، راولپنڈی، صدر

Marfat.com

نبی اکرمؐ کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کو بھی اسی رشکِ فردوس حجرہ مبارکہ میں دفن ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی حیات مبارکہ تک حجرہ مبارکہ کھلا رہتا تھا۔ صحابہ کرامؓ حجرہ کے دروازہ شرقی پر حاضر ہوکر سلام پیش کیا کرتے اور جب صحابہ کرامؓ نے اندر بھی حاضری دینی ہوتی تو حضرت عائشہ صدیقہؓ کی اجازت سے اندر حاضر ہوکر سلام پیش کرتے۔ ۵۷ ہجری میں حضرت عائشہؓ کے وصال کے بعد اس آرامگاہِ مقدسہ کا دروازہ بند کردیا گیا اور بعد میں حجرہ کے اس مقام مقدس پر حاضری کا شرف بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا اور جن معدودِ چند افراد کو حجرہ مبارکہ کے اس اصل مقام کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ان عظیم شخصیات کے اسما کتب تاریخ میں محفوظ ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ۸۸ ہجری میں اس آرامگاہ مبارکہ کو ایک مخمس نما (پانچ پہلو) عمارت بنام ''حظار مزور'' (حرمت والا احاطہ) کے اندر محفوظ کردیا۔ یہ عمارت نہایت قیمتی پتھروں سے تعمیر کی گئی۔ سوا چودہ صدیاں گذرنے کے بعد بھی آرامگاہِ نبویؐ اب تک اُسی اصلی صورت و حالت میں موجود ہے۔ شاہان و سلاطین نے سرکارؐ کی بارگاہِ اقدس میں جو بھی اپنی تعمیرات کروائیں وہ سب کی سب حجرۂ مقدسہ کے بیرونی اطراف میں ہوئیں۔

خلیفہ ہارون الرشید کی والدہ خیزران ۱۷۱ ہجری میں جب حج کرکے روضہ نبویؐ کی زیارت کو آئی تو پوری مسجد نبویؐ میں عطر لگوایا اور سب سے پہلے اسی خاتون کو یہ شرف حاصل ہوا کہ اس نے حجرۂ نبویہؐ کے بیرونی اطراف میں قائم پانچ پہلو عمارت پر غلاف چڑھایا۔ بعد میں مختلف شاہان مصر و بغداد کو غلاف چڑھانے کی سعادت حاصل ہوتی رہی۔ حضرت علامہ سمہودیؒ فرماتے ہیں کہ آج ہمارے زمانے میں اس عمارت پر تین غلاف اوپر نیچے چڑھے ہوئے ہیں۔ سلطان اسماعیل ناصر قلاون نے مصر میں ایک گاؤں خرید کر غلاف بنانے کے لیے وقف کیا جہاں پر خانہ کعبہ کے لیے غلاف ہر سال اور ہر پانچ سال بعد حجرہ شریفہ اور منبر شریف کے لیے غلاف تیار ہوتا رہا۔ جب نیا غلاف چڑھایا جاتا تو شیخ الحرم پُرانا غلاف خدام اور جن کو مناسب خیال کرتے ان میں تقسیم کردیتے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے جب سلاطینِ عثمانیہ کو حرمین شریفین کی خدمت کا شرف بخشا تو ان کا یہ معمول تھا کہ ہر بادشاہ کی تخت نشینی کے وقت نیا غلاف مبارک مذکورہ بالا عمارت پر چڑھایا جاتا۔

۵۴۸ ہجری کا واقعہ ہے کہ آرامگاہِ نبویؐ کے اندر سے آواز سنی گئی۔ اس امر کی اطلاع امیر قاسم الحسینی کو دی گئی۔ آپ نے سوچ بچار کے بعد منظوری دی کہ کسی نیک اور بزرگ شخصیت کو حجرہ شریف کے اندر اتار کر اس امر کا پتہ لگایا جائے چنانچہ ایک طویل عرصہ

Marfat.com

کے بعد یہ سعادت عظیم حضرت شیخ عمر النسائی الموصلیؒ کے حصہ میں آئی۔آپ کو رسیوں کے ساتھ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے تعمیر کردہ حظیرہ میں اتارا گیا، جہاں سے آپ آرامگاہِ نبویؐ میں داخل ہوئے۔ روشنی کے لیے آپؒ کے پاس شمع بھی تھی آپؒ نے دیکھا کہ حجرہ مبارکہ کی چھت سے کوئی چیز قبور مبارکہ پر گرگئی ہے۔ آپؒ نے اسے ہٹا دیا اور قبور پر ٹھہری مٹی کو اپنی داڑھی مبارکہ سے صاف کردیا۔(وفاء الوفاء، جلد ا، صفحہ ۴۰۷)

۵۵۷ ہجری کا واقعہ ہے کہ سلطان نور الدین زنگیؒ کو نبی اکرمؐ بار بار خواب میں نظر آئے اور دو آدمیوں کی طرف اشارہ کر کے ارشاد فرمایا کہ انکو اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔ نبی اکرمؐ کے اس حکم مبارک پر سلطان نور الدین زنگیؒ روز و شب کی طویل مسافتیں طے کر کے مدینہ منورہ پہنچا اور ان دو نصرانیوں کو اسی مقام پر قتل کروا دیا جہاں سے وہ سرکارؐ کے روضہ اقدس میں سرنگ لگائے ہوئے تھے۔ خدائے بزرگ و برتر نے سلطان نور الدین زنگیؒ کے ذریعے ان کو اپنے ناپاک ارادے میں کامیاب نہ ہونے دیا۔سلطان نے ان نصرانیوں کا کام تمام کرنے کے بعد روضۂ مبارک کے اردگرد (حظارِ مزور کے بیرونی اطراف میں) پانی کی تہہ تک کھدائی کروا کر سیسہ کی دیواریں بنوا دیں جو اب تک قائم ہیں۔ مقام فکر ہے کہ دنیا میں کسی اور نبی یا رسول کی کتاب، گھر اور قبر کی حفاظت کا انتظام اس طرح نہ ہوا جسطرح اللہ تبارک تعالیٰ نے اپنے محبوب کریمؐ پر نازل شدہ کتاب قرآن مجید، حجرہ مبارکہ اور آرامگاہ کی حفاظت کا انتظام کیا ہوا ہے۔غرض یہ کہ سلطان نور الدین زنگیؒ نے جب اللہ تعالیٰ کی یہ عنایت دیکھی کہ روئے زمین کے تمام بادشاہوں میں سے سرکارؐ نے مجھ سے یہ کام لیا ہے تو اپنی خوش نصیبی پر شرف کے آنسو بہائے۔ اُس نے سیسہ سے بھری ہوئی دیواروں کے اوپر ایک جنگلہ نصب کروا دیا جس سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی تعمیر کردہ پانچ پہلو عمارت ''حظار مزور'' صاف نظر آتی تھی۔ اس عظیم عاشق رسولؐ سلطان نور الدین زنگیؒ کا مزار مبارک شام کے دارالحکومت دمشق میں ہے۔آپ شہرِ دمشق کے مشہور زمانہ بازار بنام ''سوقِ حمیدیہ'' ختم ہونے سے پہلے ایک چھوٹے بازار ''سوق الخیاطین'' کے عین درمیان مین ایک کمرے میں آرام فرما ہیں۔مزار مبارک کے ساتھ ایک مسجد ہے جس میں محافلِ ذکر منعقد ہوتی رہتی ہیں۔

۶۶۸ ہجری میں سلطان رکن الدین بیبرس(Bebrus) نے مذکورہ بالا پانچ پہلو عمارت کے بیرونی اطراف میں تعظیم اور تقدس کے پیش نظر لکڑی کا جالی دار جنگلہ نصب کروایا جس کی اونچائی تین میٹر تھی۔ اس جنگلہ میں تین دروازے بھی رکھے گئے۔ ایک دروازہ جانب قبلہ، ایک مشرق اور ایک مغرب میں۔ اس طرح آرامگاہ نبویؐ پہلے ایک حجرہ میں، پھر حضرت عمر بن

Marfat.com

عبدالعزیزؒ کی تعمیر کردہ عمارت میں اور اب ایک جنگلہ کے اندر مقصور ہوگئی۔ بعد میں یہ ساری عمارت "مقصورہ شریف" کے نام سے مشہور ہوئی اور اب بھی اسی نام سے پہچانی جاتی ہے۔

۶۹۴ ہجری میں ملک زین الدین نے تین میٹر اونچے جنگلے کو چھت تک بلند کروا دیا۔

۷۳۲ ہجری میں ملک ناصر حج سے فارغ ہونے کے بعد جب مدینہ منورہ میں حاضر ہوا تو اس نے "مقصورہ شریف" کے اندر عورتوں اور بچوں کا رش دیکھا جو اس مقام کے تقدس اور عظمت کے خلاف تھا۔ چنانچہ "مقصورہ شریف" کو ایام حج میں بند کیا جانے لگا۔

۸۳۰ ہجری میں سلطان اشرف برسبائی نے اس مقامِ مقدس کی رفعت اور عظمت کے پیش نظر تمام دروازوں کو زائرین کے لیے بند کروا دیا۔ چنانچہ وہ جالیوں کے باہر کھڑے ہو کر صلوۃ وسلام پیش کرتے۔

سلطان مصر اشرف قاتیبای کے دور حکومت میں مسجد نبویؐ کی تعمیر و تجدید پر خصوصی توجہ دی گئی۔ اسی دور میں حجرۂ مبارکہ کی مرمت کی ضرورت بھی پیش آئی۔ حضرت علامہ سمہودیؒ فرماتے ہیں کہ میں اس مقام متبرک کی تعمیر و مرمت کا بغور مشاہدہ کرنے کے ساتھ ساتھ خدمت کرنے کا بھی شرف حاصل کرتا رہا۔ ۲۵ شعبان ۸۸۱ ہجری کو صبح کے وقت عمارت مقدس کے متولی نے مجھے پیغام بھیجا کہ حجرہ مبارکہ کی زیارت کا شرف حاصل کرلیا جائے۔ میں نے اس عظیم اور مقدس مقام میں داخل ہونے سے پہلے اس حاضری مبارک کی قبولیت کے لیے دعا کی اور اجازت طلب کرنے کے بعد میں نہایت ادب و احترام سے حجرہ مبارکہ میں داخل ہوا اور ابھی اس مقام مقدس پر پہنچ بھی نہ پایا تھا کہ ایسی خوشبو آئی کہ اس جیسی مبارک اور معطر خوشبو میں نے ساری زندگی محسوس نہ کی تھی۔

بطیب رسول اللہ طاب نیسمھا
فما المسک ما الکافور ما المندل الرطب

(ترجمہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوشبو مبارک سے ساری فضا معطر ہوگئی جس کے سامنے کستوری، کافور اور عنبر کی کیا حیثیت ہے۔

حضرت علامہ سمہودیؒ فرماتے ہیں کہ پھر میں نے آپؐ کی بارگاہِ اقدس میں سلام کا نذرانہ پیش کیا، دعائیں کیں اور پھر اس خاک مقدس و مبارک سے کچھ خاک اٹھا کر اسے آنکھوں کا سرمہ بنانے کی سعادت حاصل کی۔ قارئین کرام اس بات کو ساڑھے پانچ صدیاں بیت چکی ہیں اور اس طویل عرصہ میں کوئی شخص بھی آرامگاہ نبویؐ کے اس اصل مقام پر حاضری نہ دے سکا اور اگر ایسا ہوتا تو کتب تاریخ میں اس کا ذکر ضرور ہوتا۔

Marfat.com

ایک عرصہ سے کچھ تصاویر کو بغیر تحقیق کیے نبی کریمؐ کی قبر اطہر سے منسوب کر کے مختلف انداز میں استعمال کیا جارہا ہے جو کسی طور پر بھی ایک گناہ سے کم نہیں، کیونکہ ۸۸۱ ہجری کے بعد حجرہ نبویہؐ کے اصل مقام تک کسی ظاہری آنکھ کی رسائی ممکن نہیں ہوئی تو اتنی جدید تصاویر کا حصول کس طرح ممکن ہوا جبکہ تینوں قبور مبارکہ بغیر کسی تغیر و تبدل کے اصلی حالت میں موجود ہیں جبکہ ان تصاویر میں آپؐ کی قبر مبارک سطح زمین سے کافی اونچی اور خوبصورت چادروں سے ڈھکی ہوئی نظر آتی ہے اور سرہانے کی طرف عمامہ بھی دکھائی دیتا ہے، جبکہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (متوفی ۱۱۱ ہجری، مزار مبارک در شہر حمص شام) کے ایک ہم عصر کا بیان ہے کہ حجرہ مبارکہ میں تینوں قبور مبارکہ سطح زمین سے صرف چار انچ اوپر ہیں اور بقول حضرت علامہ سمہودیؒ جنہیں خود اس مقام پر حاضری کا شرف حاصل ہوا، تینوں قبور مبارکہ تقریباً زمین کے برابر تھیں، تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کن قبور مبارکہ کی تصاویر ہیں جو اس وقت گردش میں ہیں۔ دراصل یہ تصاویر ترکی فن تعمیر کا شاہکار ہیں اور وہیں سے شائع ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک انتہائی خوبصورت ■ دلکش تصویر تو حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کے مزارِ مبارک کی ہے جو ترکی کے ایک خوبصورت شہر قونیہ شریف میں واقع ہے۔ ایک بلند اور طویل چبوترہ پر ساٹھ عدد قبور مبارکہ ہیں جن کے عین درمیان میں حضرت مولانا رومؒ کا مزار پرانوار ہے جس پر ایک خوشنما غلاف پڑا ہوا ہے۔ تصویر میں آپ کے پائنتی آپ کے والد محترم کی قبر مبارک اور ساتھ فانوسوں کے نیچے تین اور قبور مبارکہ کے بھی کچھ حصے نظر آرہے ہیں یعنی تصویر مذکورہ میں پانچ قبور تو سامنے نظر آرہی ہیں جبکہ سرکارؐ کے حجرہ مبارکہ میں صرف تین قبور مبارکہ ہیں اور ان کی ترتیب بھی ان سے مختلف ہے۔ بحمداللہ اس بندہ ناچیز کو دو مرتبہ (نومبر ۱۹۹۵ء اور پھر جولائی ۲۰۰۴ء میں) اس مقام مقدس پر نہ صرف حاضری کا شرف حاصل ہوا ہے بلکہ تصویر میں موجود مزار مبارک پر چادریں پیش کرنے اور مثنوی شریف بھی حضرت مولانا رومؒ کے مزار مبارک کے سامنے پڑھنے کی سعادت عظیم حاصل ہو چکی ہے۔ پتہ نہیں اس قسم کی تصاویر تیار کروانے اور فروخت کرنے والے جہالت سے یہ کام کر رہے ہیں یا صرف مالی منفعت حاصل کرنے کے لیے، بہر دو صورت ■ اپنی عاقبت کے لیے اچھا نہیں کر رہے۔ قارئین کرام، آپ بھی اپنے دوست اور احباب کو یہ اہم پیغام پہنچا کر ثواب حاصل کریں۔ مدینہ منورہ کے متبرک و تاریخی مقامات کی مزید تفصیل کے لیے بندۂ ناچیز کی تصنیف ”دیارِ حبیبؐ“ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں حقیقت سے آشنا فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

☆☆☆

Marfat.com

دیگر متون کے مقابلے میں کتابتِ قرآن کا امتیاز

خانم زیبا مقصودی کرمانشاہی

ترجمہ و تلخیص از ڈاکٹر ناصر زیدی ☆

محترمہ زیبا مقصودی کرمانشاہی ۱۹۶۱ء میں پیدا ہوئیں، وہ انجمن خوش نویسان ایران کی مدرس ہیں۔ انہوں نے خوش نویسی کا فن ابوالفضل عطوفی کرمانشاہی، عبداللہ جواری کرمانشاہی، معین الکتاب اصفہانی، غلام حسین امیر خانی اور حضرت آیت اللہ سید مرتضی جیسے اساتذہ سے پندرہ برس تک سیکھنے کے بعد خوش نویسی کا آغاز کیا اور بہت سے اہم علمی آثار کی کتابت کی۔ ان کی تخلیقات کی متعدد نمائشیں منعقد ہو چکی ہیں اور ان کے بہت سے انٹرویو بھی شائع ہو چکے ہیں۔ وہ پہلی اور واحد ایرانی خطاط خاتون ہیں جن کی کتابت کے متعدد شاہکار زیور طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ انہوں نے ''یادنامہ علامہ طباطبائی''، ''یادنامہ استاد شہید مطہری''، ''مناسک حج''، ''تاریخ شعر و ادبیات'' (پانچ جلدیں) ''کنز العرفان''، ''دیوان سید یعقوب ماہی دشتی کرمانشاہی''، ''دیوان پرتوی کرمانشاہی''، ''شرح زیارت عاشورہ'' از آیت اللہ میر خانی، ''خطبہ ہای حضرت فاطمہ زہرا'' وغیرہ کے علاوہ تین مرتبہ قرآن کریم کی مکمل کتابت کی ہے۔

س: آپ نے قرآن کے لیے خطِ نستعلیق کا انتخاب کیوں کیا؟

ج: اگر قرآن جیسی آسمانی کتاب کو مختلف رسوم الخط میں لکھنے کے اسباب و علل سے متعلق بحث و گفتگو کے حوالے سے یہ سوال اٹھایا جاتا تو شاید اس کے جواب کے لیے کسی مقدمہ اور تمہید کی ضرورت نہ ہوتی لیکن بہرحال میں عرض کروں گی کہ ہم پر ایرانی اور مسلمان ہونے کے ناتے سے علم و دانش اور آرٹ کی خدمت کرنے کی ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں۔ ایران اور اسلام نے ایک دوسرے کی جو خدمت کی ہے اسے اس دعوے کی کمترین دلیل کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ جب ہمارے اسلاف نے اسلام جیسا الٰہی مکتب قبول کیا تو وہ اس زمانے کی سماجی مشکلات اور انسانیت سوز مسائل کے باوجود ایک تہذیب یافتہ معاشرے میں زندگی گزار رہے تھے۔ جس کا اندازہ اس دور کے لوح نویسی اور سنگ تراشی جیسے تاریخی، فنی اور ہنری آثار سے لگایا جاسکتا ہے لیکن جونہی ان تک اسلام کا پیغام پہنچا انہوں نے اپنے آرٹ، اپنی ثقافتی اور اپنے گہرے تہذیبی مظاہر کو اسلام کی خدمت کے لیے وقف کردیا اور بعض مقامات پر

☆ بشکریہ از گزارش گفت و گو، شمارہ ۱۲، مہر ماہ ۱۳۸۳ ش

Marfat.com

تو اپنے اہم ثقافتی اور فنی ذخائر کو بالکل ہی ترک کر دیا۔ جن آثار کو ترک کیا گیا ان میں سے ایک اسلام سے پہلے ایران میں رائج خطاطی کی ایک مخصوص طرز بھی تھی۔ اگر چہ نومسلم ایرانی مختلف قسم کی خطاطی کا فن جانتے تھے حتی اہل فن ایسی خطاطی کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ جس کے ذریعے اس دور کے پرندوں کی آوازوں تک کو بھی محفوظ کیا جاتا تھا۔ بہر حال یہاں اس کی تفصیل بیان کرنے کا موقع نہیں۔ مختصر یہ کہ اس متمدن معاشرے نے اپنی دنیوی اور اخروی آزادی کے منشور یعنی قرآن کریم کے ظاہر و باطن کے ادراک کو اپناتے ہوئے اپنے تمام ثقافتی اور تہذیبی سرمائے کو نظر انداز کر دیا اور اپنی تمام تر فنی صلاحیت اور علمی استعداد کو قرآنِ کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ پس ایرانیوں نے اس رسم الخط کو قرآن کی وجہ سے اپنایا اور ترقی دی ہے۔ قرآن مجید کے سلسلے میں، جو پوری تاریخ میں انسانوں کی فلاح و نجات کے لیے حبل المتین کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ امتیاز اسے ہمیشہ حاصل رہے گا، ابتدائی دور کے ایرانی مسلمانوں کے رویوں کا اندازہ اس شعر سے لگایا جاسکتا ہے:

دنیا و دین بہ یک نگہش ما فروختیم		سودا چنان خوش است بہ یک جا کند کسی

یعنی دین و دین کو اس کی ایک نظر کے عوض ہم نے بیچ ڈالا۔ اگر کوئی ایک مقام پر اس طرح سے کر سکے تو یہ سودا بہت اچھا ہے۔

دراصل اس خرید و فروخت کے نتیجے میں ایرانیوں نے جو کچھ حاصل کیا وہ عشق تھا۔ پھر جب ایمان، عشق اور صلاحیت یکجا ہوئے تو قرآنی فن مسلمان ایرانیوں کی آغوش میں پروان چڑھا، یعنی جہاں بھی قرآن گیا وہاں ایرانی فن پوری آب و تاب کے ساتھ موجود تھا۔

لیکن آج عرب دنیا میں خطِ نسخ ایک اور حیثیت اختیار کر گیا ہے، جبکہ اس کا پہلا مقصد متن اور بطنِ قرآن تھا اور دوسرا مقصد اس کو پیش کرنے کا طریقہ۔ اس سے زیادہ میں کیا عرض کروں؟ آپ تو خود قرآن کے سلسلے میں ایرانی فن سے بخوبی واقف ہیں۔ ایسے میں کیا قرآنی فن و ہنر خاص کر قرآن کی کتابت و خطاطی کے حقیقی خدمت گاروں کے لیے یہ بات صحیح ہے کہ برصغیر، ایران اور وسطی ایشیا کے لاکھوں مسلمانوں کو جو رائج خطِ نسخ سے مانوس نہیں، خط نستعلیق سے محروم رکھیں اور اس سلسلے میں اپنی ذمہ داری کو انجام نہ دیں؟ آج جب کہ ایران میں عالمی شہرت یافتہ بہترین اور قرآن سے وابستہ اعلیٰ ترین شخصیات موجود ہیں تو یہ بات کسی صورت بھی زیب نہیں دیتی کہ اس میدان میں بالکل خاموشی اختیار کر لی جائے اور اپنی قوت و توانائی کے مطابق کوئی بنیادی اور ہمیشہ رہنے والا کام نہ کیا جائے؛ کیونکہ جس طرح برسہا برس تک ایرانی فن و ہنر کا ارتقا اسلام کی ترویج و اشاعت کا مرہون منت رہا اور

Marfat.com

جہاں بھی اسلام پہنچا ایرانی آرٹ بھی وہاں جلوہ گر ہوا ہے اسی طرح عصر حاضر میں قرآن ہی وہ واحد ورثہ ہے جس کی آغوش میں ایرانی آرٹ مزید پروان چڑھ سکتا ہے۔

س: عربی اور فارسی رسوم الخط میں موجود قرآنی نسخوں کے ہوتے ہوئے، جن سے لوگ بھی واقف ہیں، نستعلیق جیسے رسم الخط میں قرآن کی کتابت اور اشاعت کی کون سی ایسی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

ج: شاید آپ نے گذشتہ جواب سے اس سوال کا جواب بھی حاصل کرلیا ہوگا۔ لیکن اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ ہمارے پاس عربی اور فارسی نسخ کے عنوان سے کوئی رسم الخط نہیں ہے، البتہ نسخ عثمانی، اور ''نسخِ ایرانی'' ضرور ہیں جن سے اہل فن '' طغرا''، ''رقاع''، '' ریحان''، ''ثلث'' اور ''محقق'' جیسے رسوم الخط کے اندر اپنے تمام شعری اور نثری آثار میں استفادہ کررہے ہیں۔ اس میدان میں بڑے بڑے ماہر اور زبردست اساتذہ موجود ہیں جو خط نستعلیق کے میدان میں بھی اہل نظر ہیں لیکن ایران میں شاہ اسماعیل صفوی کے عہد سے جب پہلی مرتبہ خط نستعلیق میں قرآن کی کتابت کی گئی، یہ روش دگرگوں ہوگئی حتی کہ جو افراد حوزہ ہائے علمیہ میں بھی رہے ہیں اور جنہوں نے اس دور سے آج تک کی درسی کتب کا جائزہ لیا ہے وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ اگرچہ دینی کتب کے تمام متون اور حواشی عربی زبان میں ہیں لیکن انہیں خط نستعلیق میں لکھا گیا ہے۔ اسی لیے اس رسم الخط نے ایران، ہندوستان، ماوراء النہر حتی کہ ترکی جیسے ممالک کے اسلامی ثقافتی معاشرے پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ درحقیقت اسلامی ممالک میں خط نستعلیق، علویوں کا سرکاری رسم الخط بن گیا۔ اگرچہ بعد میں نسخِ ایرانی کے وجود میں آنے کے بعد یہ خط پہلے کتابت قرآن کے لیے پھر دعا و مناجات کی کتب کی کتابت میں استعمال ہوا اور تقدس مآب سلاطین اور طبقہ اشراف کی طرف سے، جنہیں شاید خط نستعلیق پڑھنے میں دشواری پیش آتی تھی، ایک عرصہ تک دوبارہ نسخ (وہ بھی ایران کی حدود میں خط نسخ ایرانی) کو پذیرائی ملتی رہی۔ بنابرایں ہمیں اپنی مذہبی ذمہ داری کو انجام دینے کے لیے خط نستعلیق کی ترویج اور اس کی عظمت رفتہ کو واپس لانے کی ضرورت ہے۔ یہ مسئلہ بہت زیادہ سنجیدگی کا حامل ہے یعنی ہمیں صرف ضرورت ہی نہیں بلکہ ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ خط نستعلیق کو دوبارہ زندہ کریں۔

س: گویا دوسرے خطاط پہلے قرآن کو خط نستعلیق میں لکھتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ پھر کن دلائل کی بنا پر آپ نے اس رسم الخط میں قرآن کی کتابت کا کام شروع کیا؟

ج: جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کرچکی ہوں خط نستعلیق میں قرآن کی کتابت شاہ اسماعیل صفوی

Marfat.com

کے دور میں شروع ہوئی اور جب قرآن مجید کی اس حقیر کاتب کو خط نستعلیق میں قرآن کی کتابت کی سعادت اور توفیق حاصل ہوئی تمام قرآن ایرانی خط اور املا میں لکھے جاتے تھے۔ اسلامی ممالک میں جو سفر کیا اور وہاں جب خطاطی اور کتابت قرآن کے ماہر اساتذہ سے ملاقات ہوئی تو وہ خط نستعلیق میں لکھے جانے والے قرآنی نسخوں پر توجہ رکھنے کے باعث اس بات پر معترض تھے کہ قرآن کی موجودہ املا اور کتابت نسخہ امام سے، جو عالم اسلام میں بہت زیادہ مشہور اور مقبول ہے، منطبق نہیں ہے۔ لہٰذا میں نے اللہ کی بارگاہ میں دعا کی، حضرت فاطمہ زہراؑ اور حضرت علی مرتضٰیؑ کی ذات سے متوسل ہوئی اور نبی کریمؐ کے حضور سے ہمت و حوصلہ کی طلبگار ہوئی اور یوں میری دیرینہ آرزو پوری ہوئی اور میرا سچا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ بنا براین میں نے پہلی مرتبہ نسخہ امام کی بنیاد پر خط نستعلیق کو پرواز کی صلاحیت عطا کی اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ میں معاصر دنیا میں پہلی مسلمان خطاط خاتون ہوں جسے یہ عظیم سعادت نصیب ہوئی ہے۔

س: خطاطی کے اساتذہ کا خیال رہا ہے اور اس وقت بھی یہی خیال ہے کہ قرآن اور حافظ اور مولانا روم جیسے عظیم شعرا اور عرفا کے کلام کی کتابت بہت مشکل کام ہے اور ایک ماہر خطاط کے کام کا اختتام اسی طرح کی گراں قدر کتابوں کی کتابت پر ہونا چاہیے۔ سید حسن میرخانی مرحوم کے ایک شاگرد نے بھی اپنے استاد سے اسی طرح کا ایک قول نقل کیا ہے۔ کیا آپ کی بھی یہی رائے ہے؟

ج: البتہ عقیدہ اور ایمان رکھنے میں فرق ہے۔ مختلف عقاید و نظریات قابل احترام ہوتے ہیں اور کسی بھی بڑے خطاط نے اس قسم کی رائے کو تحریر نہیں کیا۔ صرف نقل قول پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ استاد سید حسن میرخانی مرحوم نے اگر اس قسم کی رائے کا اظہار کیا ہے تو معاذ اللہ ان کے کام کا اختتام بھی اس پر نہیں ہوا یعنی انہوں نے قرآن کی کتابت نہیں کی، جبکہ ▪ اساتذہ کے استاد تھے۔ بہرحال اصل بات یہ ہے کہ کتابت ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ قدیم اساتذہ کا خیال ہے کہ خطاطی کی معراج کتابت ہے۔ البتہ اس سلسلے میں کچھ اختلافی آرا بھی موجود ہیں جن کی تفصیل میں نہیں جانا چاہوں گی۔ لیکن خطاطی کے ایک معاصر استاد کے بقول اپنے فن سے محبت رکھنے والا ہر نیا خطاط کچھ عرصے تک مشق کرنے کے بعد عماد الکتاب مرحوم کے شائع شدہ معروف قطعات میں سے ایک معروف قطعہ (ولیعہد گردون مہد) کی پورے اور مکمل طور پر نہیں تو ایک بڑی حد تک کتابت کرسکتا ہے۔ عمادالکتاب تو وہ ہیں کہ جنہوں نے شاہنامہ کے ۶۰ ہزار اشعار کی ایک ہی طرح اور پورے طور پر اول سے آخر تک خطاطی کی ہے، اور اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتی چلوں کہ کوئی بھی استاد ۵۰ برس کی عمر کے بعد طویل اور مشکل

Marfat.com

متن کی حامل کتاب کی کتابت نہیں کرسکتا کیونکہ کتابت کے لیے جن جسمانی، روحانی اور فنی و تکنیکی لوازمات کی ضرورت ہوتی ہے ان کی وجہ سے ادھیڑ عمر میں کوئی شخص ذاتی آرٹ کو پیش کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ یہ نعرہ یا آپ کے بقول اعتقاد ایک ایسی منحوس لوری ہے جو خطاطی کے حلقے کو سلا رہی ہے۔ جب تک ایک باصلاحیت اور مخلص نوجوان اپنے ہوش میں آئے گا پانی سر سے گذر چکا ہوگا کیونکہ وقت بڑی تیزی کے ساتھ گذر رہا ہے۔ ایک شاعر کے بقول:

ای کہ دستت می رسد کاری بکن　　پیش از آن کز تو نیاید ہیچ کار

یعنی جب تک تجھ میں ہمت ہے کچھ کرلے، قبل اس کے کہ تو کچھ بھی کرنے کے قابل نہ رہے۔

اپنی ثقافتی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتی ہوں کہ کسی بھی ماہر سالک پر یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ قدیم الایام سے اب تک حتی کہ نبی اکرمؐ کی روایت کے مطابق علم الابدان (طب) اور علم الادیان (دینی علوم) کو تمام علوم پر برتری حاصل ہے۔ اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان دو علوم کی برتری کی وجہ انسانی معاشرے میں ان کی اہمیت کے علاوہ ان دو علوم میں پائی جانے والی باریک بینی، حساسیت اور حد سے زیادہ تفصیلات و جزئیات ہیں؛ کیونکہ ایک کا تعلق انسان کے جسم وجان سے ہے اور دوسرے کا تعلق اس کے عقیدے اور ایمان سے، اور ان دونوں علوم سے متعلق کسی ایک مسئلے کی تفسیر وتشریح اور اصلاح میں معمولی ترین انحراف بھی ناقابل تلافی نقصان کا باعث بن سکتا ہے۔ آپ واضح طور پر دیکھتے ہیں کہ نابغہ شخصیات کے علاوہ بھی متعدد شخصیات کو جوانی ہی میں مجتہد اور ماہر بننے کی سعادت حاصل ہوگئی تھی۔ آج ایک ۳۳، ۳۴ سالہ نوجوان ماہر امراض دل اور ماہر امراض چشم ہے۔ اسی تہران میں نوجوان ماہر ڈاکٹر دل اور آنکھ کے قرینہ کی پیوندکاری کررہے ہیں۔ ان افراد کی عمر کو دیکھتے ہوئے اگر یہ سوال کیا جائے کہ انہوں نے کتنے سال تعلیم حاصل کی ہوگی؟ زیادہ سے زیادہ ۲۰ برس !! یعنی یہ لوگ اپنی ذاتی صلاحیت اور ذہانت اور کئی برس کی تعلیم کی وجہ سے اس مرحلے تک پہنچے ہیں تو پھر خطاطی کا یہ کون سا فن ہے کہ جس میں اسی ذہانت اور ذاتی صلاحیت کی بنا پر، [illegible] برس کی محنت وکوشش اور عرق ریزی کے بعد بھی دوسروں کا دست نگر رہنا پڑتا ہے۔ یعنی ایک شخص مثلاً ہزاروں مرتبہ مختلف انداز میں دائرہ بنانے کے بعد بھی ایک ابتدائی طالب علم کی حیثیت ہی میں رہتا ہو؟ کون سی عقل سلیم اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے کہ صرف ''ن'' کا لفظ لکھنے کے لیے آنکھ کے قرینے کے پیوند یا آیات

Marfat.com

و روایات سے فلاں فقہی حکم کے استنباط سے زیادہ مہارت کی ضرورت ہے۔

نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس صورت حال نے ایران میں خطاطوں کے حلقے کو ایک ایسی فوجی چھاؤنی میں تبدیل کردیا ہے جو کئی برس تک ایک ہی جگہ پر مستقر رہتی ہے اور جس کے کمانڈروں نے ان کی آزادی اور ان کے اختیار کو اپنے قبضے میں کررکھا ہے اور اپنی اندھی اطاعت پر مجبور کردیا ہے۔ انہوں نے کبھی بھی میدان میں آنے کی اجازت نہیں دی اور انہیں صرف پریڈ ہی میں شرکت پر مامور کررکھا ہے۔ لیکن میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں اور اب بھی کہتی ہوں کہ ہر فن کار صرف ایک حد تک آرٹ و ہنر کے راستے پہ چلتے ہوئے ابتدائی طالب علم رہ سکتا ہے اور کچھ مراحل طے کرنے کے بعد وہ صاحب اختیار اور اپنے پیروں پہ کھڑا ہوجاتا ہے۔ ہمارے ملک کے خطاطوں کی طرف سے علمی سرگرمیوں کا آغاز ہوئے ۵۰ برس کا عرصہ گذرنے کو ہے لیکن ایسے فنکاروں کی تعداد انگشت شمار بھی نہیں جنہیں باضابطہ طور پر ماہر فن سمجھا جاسکے۔ ایسا کیوں ہے، جبکہ خطاطی بھی انسانی علوم کی بارہ شاخوں میں سے ایک شاخ ہے۔ قدیم زمانے میں گیارہ علوم کے ساتھ ساتھ اس آرٹ کو بھی سیکھا جاتا تھا اور سیکھنے والا خطاط اور ادیب کہلاتا تھا۔ آج انسانی علوم کے مختلف شعبوں میں سینکڑوں باصلاحیت نوجوان ۴۰ برس سے بھی کم عمر کے عرصے میں تہران ، شیراز اور مشہد جیسی یونیورسٹیوں اور ملک کی اعلیٰ ترین درسگاہوں میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کررہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے اساتذہ کے ہمراہ تعلیم و تدریس کے فرائض بھی انجام بھی دے رہے ہیں جبکہ دوسری طرف فن خطاطی میں ایک طویل عرصہ مہارت حاصل کرنے کے بعد بھی سینکڑوں باصلاحیت نوجوان سرکاری طور پر ماہر خطاط کا لقب حاصل کرنے سے محروم ہیں حتیٰ کہ جن تھوڑے بہت خطاطوں کو باضابطہ طور پر مکمل خطاط کا درجہ دیا گیا ہے وہ بھی عملی طور پر مراتب و درجات کے لحاظ سے ایک سطح پر نہیں ہیں۔ اس وقت بہت سے ممتاز اور ماہر نوجوان اساتذہ خطاطی کے منصف مزاج مسلم اساتذہ کے مطابق فن و ہنر کے بہترین نمونے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کیا یونیورسٹیوں کے تعلیمی بورڈز میں تمام اساتذہ ایک جیسی صلاحیت و مہارت کے حامل سمجھے جاتے ہیں؟ یقیناً نہیں!! لیکن چونکہ وہاں اجارہ داری اور سفارش نہیں ہے اور قواعد و ضوابط روابط پر مقدم ہیں لہٰذا ہر شخص اسی مقام اور درجے تک پہنچتا ہے جتنی اس نے محنت کی ہوتی ہے۔

اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتی چلوں کہ میں نے ۸۰-۱۹۷۹ء میں خطاطی کا آغاز کیا تھا۔ چار سال کے عرصے میں چوتھے اور آخری مرحلے کو جسے درجۂ ممتاز کہتے ہیں،

Marfat.com

طے کیا اور تقریباً ۲۰ برس سے خطاطی کے میدان میں مسلسل کام کررہی ہوں۔ ایران کی خطاطی کی تنظیم کے علاوہ یونیورسٹی میں اور عمومی طور پر بھی کلاسیں لے رہی ہوں۔ میں نے خطاطی کی تھیوری کے بھی کئی کورسز مکمل کیے ہیں اور مجھے ایران اور دوسرے اسلامی ملکوں میں خطاطی کے بزرگ اساتذہ سے کسب فیض کا موقع بھی ملا ہے۔ اب تک خطاطی پر مبنی میرے ۱۵ آثار شائع ہوچکے ہیں اور آرڈر پر بھی خطاطی کرتی رہی ہوں اور کئی علمی مراحل طے کرنے اور طویل مشق اور زحمت و کوشش کے بعد ایک لاکھ سے زائد سطور کی نمائش کرچکی ہوں پھر کہیں جاکر میں قرآن کی کتابت پر کمربستہ ہوئی اور اس کام سے عہدہ برآ ہوسکی۔ یہ بھی بتاتی چلوں کہ ایران میں خاص کر خطاطی کے میدان میں حالیہ چالیس برسوں کے اندر کسی اور آرٹسٹ کے اصل مقام کو اپنے زمانہ حیات میں اپنے ہم عصروں کی طرف سے تسلیم نہیں کیا گیا، مگر یہ کہ اس دنیا سے چلے جانے کے بعد جب ہر قسم کا خطرہ ٹل گیا تو اس کو اصل مقام دیا گیا۔ اس سلسلے میں کہنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ بہر حال خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ میں نے اپنی ذاتی فکر و استعداد اور منطق کی بنیاد پر مسلسل محنت کی ہے اور اپنی عمر کے بہترین ایام فن خطاطی کے میدان میں گذارے ہیں۔ میں نے ریاضی کے شعبے میں اپنی تعلیم مکمل کی ہے اور اپنے فن میں اپنی بھرپور صلاحیت سے استفادہ کیا ہے۔

س: کیا قرآن کی کتابت کے لیے جو ایک مشکل کام ہے اور اس کے لیے بہت زیادہ مہارت کی ضرورت ہے، کسی روحانی اور معنوی محرک کی بھی ضرورت ہے؟

ج: یہ ایک واضح سی بات ہے قرآن کی کتابت کا کام ہر دوسرے متن سے مختلف ہے۔ اس کے لیے عشق و محبت اور عنایت الٰہی کی ضرورت ہے۔ میں نے اپنی گفتگو میں اپنے سچے خواب کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ بہرحال اس سوال کے جواب میں علامہ طباطبائی کے اس شعر کو پڑھا ہے:

من خسی بی سر وپایم کہ بہ سیل افتادم　　　او کہ می رفت، مرا ہم بہ دل دریا برد

یعنی میں پانی میں اس بے سہارا تنکے کی مانند ہوں جس کی پرتلاطم امواج خود ہی مجھے سمندر کی گہرائیوں میں لے گئی۔

س: کیا آپ خط نستعلیق میں قرآن کی کتابت کے وقت کسی استاد یا اساتذہ کی پیروی کرتی ہیں؟

ج: نہیں، ایک لاکھ سطور، دسیوں کتابوں کی خطاطی اور ایک عشرے تک تدریس کے بعد میری نگاہوں نے کسی اور کا سہارا لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میں نے فن نستعلیق کو قرآن کی خدمت کے لیے وقف کردیا اور اس راہ میں مجھے جدت بھی عطا ہوئی اور انوکھا پن بھی۔ اس

Marfat.com

بات کی طرف بھی اشارہ کرتی چلوں کہ اس اہم کام کو انجام دینے کے لیے میرے لیے کوئی نمونۂ عمل موجود نہیں تھا۔ اس طرز کا یہ پہلا نسخہ ہے اور میں ایک عشرے کی کوشش اور ہزاروں نمونوں پر کام کرنے کے بعد اس کو منصۂ شہود پر لانے میں کامیابی حاصل ہوئی ہوں۔

س: اس قرآن اور اس کی کتابت میں استعمال ہونے والے قلم کی خصوصیات کے بارے میں کچھ آپ کہنا پسند کریں گی۔

ج: اس قرآن میں اسی شائع شدہ قرآن کے رسم الخط کو استعمال کیا ہے جو نسخہ امام کے مطابق ہے اور جسے عالم اسلام میں مقبولیت حاصل ہے۔ اس کی صفحہ بندی عثمان طٰہ کے نسخہ قرآنی کے مطابق ہے۔ یعنی عثمان طٰہ نے جس طرح آیات پر زیر زبر اور پیش لگائی ہے اور ایک صفحہ پر جتنی آیات لکھی ہیں اسی طرح سے میں نے نستعلیق میں اسے منطبق کیا ہے۔

اہل نظر اور فن خطاطی کے کہنہ مشق ماہرین اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ خط نسخ میں چھ سو سے زائد صفحات کی تطبیق، انہیں طرز نستعلیق میں ڈھالنا اور پھر انہیں منطبق کرنا جہاں بہت زیادہ فنی مہارت کا متقاضی ہے وہاں اس کے لیے بہت زیادہ انتقادی صلاحیت، فہم و فراست اور مستعد ذہن کی ضرورت بھی ہے۔ یعنی کوئی بھی قرآنی مرکز اگر چاہے تو اپنے باترجمہ قرآن کی صفحہ بندی کو تبدیل کیے بغیر اپنے قرآن کے صفحات کو عثمان طٰہ کے نسخہ قرآنی کے صفحات کی جگہ رکھ سکتا ہے۔ اس سے غلطی کی صورت میں صفحات کو تبدیل یا مرتب کرنے کا کام بہت آسان ہو جائے گا لیکن اس نسخے کو قدما کی طرز پر اجزا کی صورت میں پیش کیا گیا ہے اور قرآن کی برکت سے نمونوں میں تمام تر تکرار کے باوجود صفحات کی تطبیق میں پورے متن میں کسی ایک جگہ بھی نہ تو کوئی لفظ لکھنے سے رہا ہے اور نہ ہی کوئی غلطی ہوئی ہے۔

س: آپ نے قرآن کی جو کتابت کی ہے کیا اس کی کوئی عملی افادیت بھی ہے یا یہ کہ صرف آرٹ و ہنر کے حوالے سے اس کی قدر و قیمت ہے؟

ج: یہاں پر آرٹ کو قرآن کی خدمت کے لیے وقف کیا گیا ہے۔ چنانچہ اہل دل افراد اور مسلمانوں کے استفادے اور ہنر کے درمیان میں کسی امتیاز کی قائل نہیں۔

☆☆☆

Marfat.com

علم بالوحی اور علوم بالحواس کا باہمی تعلق

اللہ دتہ کمال ☆

ایک تحقیق کے مطابق قرآن کریم میں حقوق اللہ کے بارے میں ۱۹۳ آیات، حقوق العباد کے بارے میں ۶۷۳ اور کائنات سے متعلق سائنسی علوم پر ۷۵۰ آیات ہیں جس سے یہ واضح اشارہ ملتا ہے کہ خلاقِ عالم نے انسان کو اپنے گرد و پیش میں غور و فکر اور تدبر و تفکر کی ترغیب دی ہے۔ اس کے علاوہ بھی جابجا غور و فکر کرنے کے واضح احکامات ہمیں ملتے ہیں۔ انبیا اور ائمہ کا وظیفہ ہی کتب الہیہ کی تشریح ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ ان پاکباز ہستیوں نے اپنے فرض کو کس قدر تسلسل اور جان فشانی سے ادا کیا ہے۔ ایک حدیث کے مطابق رسول کریمؐ نے فرمایا کہ ''علم کا مذاکرہ بندوں کے درمیان مردہ قلوب کو زندہ کرتا ہے۔'' ایک جگہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ ''سائنس میں برتری بلند ترین اعزاز ہے۔'' کتاب اللہ کے مزاج ، مدینۃ العلم اور باب العلم کے فرمودات پر بطور ایک اکائی غور کرنے سے اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ حسی علوم یعنی علوم سائنس میں غور و تحقیق و تدقیق عین منشائے الٰہی کے مطابق پسندیدہ ترین عمل ہے، لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ ہمیں یہ مشق بالکل آزادانہ طور پر کرنے کی کھلی چھٹی ہے یا ہمیں اپنی تحقیق وجستجو کو علم بالوحی کے حوالے سے پرکھنا اور اس پر کوئی قدغن لگانا بھی ضروری ہے؟ یہی اس مضمون کا موضوع ہے۔ قرآن، کتب مقدسہ اور فرمودات و ادعیہ ائمہؑ میں سائنسی حوالہ جات اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ علم بالوحی حسی علوم کے لیے پیش رو اور محرک کا کام کرتا ہے اور موجودہ سائنسی حقائق کی موجودہ حیثیت اضافی (Relative) ہے نہ کہ حتمی، جب کہ علم بالوحی ناقابل التباس حتمیت کا حامل ہے۔ اس طرح کسی بھی صورت میں حسی علوم کو علم بالوحی کے ضمن میں شک اور ضعفِ یقین کا باعث نہ بننے دینا چاہیے کہ یہی طرز فکر آج ملت اسلامیہ کی علمی پسماندگی کی بڑی وجہ ہے۔

علم بالوحی اللہ کی طرف سے ہے جو ہر صاحب عقیدہ اہل کتاب کے لیے چاہے مسلم ہو یا غیر مسلم بالیقین کامل و اکمل ذات ہے، اور پھر یہ علم انبیائے کرام کے ذریعے انسانوں تک پہنچا

☆ پرنسپل، ایف جی ہائر سیکنڈری اسکول برائے طلبا، G-6/2، اسلام آباد

Marfat.com

اور معصوم ہونے کے ناتے سے انبیا سے غلطی ممکن ہی نہیں۔ اس لیے علم بالوحی کی صحت ■ حیثیت لاریب ہے اور یہی اعلان خلاق عالم نے قرآن مقدس کی ابتدا ہی میں فرما دیا ہے کہ ذٰلک الکتاب لاریب فیہ ۔ اب سائنسی علوم پر غور کریں تو آج کی لحہ بہ لحہ ترقی کرتی بدلتی دنیا سائنسی علوم میں برق رفتار تحقیق و تفتیش کا ثمر ہے۔ یہ اس بات کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ سائنس تاحال ارتقائی مدارج طے کر رہی ہے۔ سائنس مختلف ادوار میں کئی مواقع پر خود اپنی تردید اور تصحیح کر چکی ہے، مثلاً ڈالٹن کے ایٹمی نظریہ میں اب تک کئی اصلاحات اور ترمیمات ہو چکی ہیں۔ روشنی کی ماہیت کے بارے میں کئی نظریات مروج رہے جبکہ آج کل بھی روشنی کی دوہری نوعیت کا غیر معین نظریہ طلبا کو پڑھایا جا رہا ہے۔ ہر آواز کی جداگانہ کیفیت (Quality) کی وجہ تاحال ماہرین سائنس کے لیے معما ہے۔ یہ چند نمونے مشتے از خروارے کے مصداق ہیں ورنہ سائنسی علوم میں گہری دسترس رکھنے والے لوگ کئی اور ایسے مظاہر کی نشاندہی بھی کر سکتے ہیں۔

ایک اور پہلو بھی اس ضمن میں لائق اعتنا اور ضروری ہے۔ علم سائنس دراصل کسی بھی چیز کا ادراک بالحواس ہے۔ حواس حصول ادراک میں دائمی طور پر غیر خاطی نہیں ہوتے بلکہ ان کے لیے غلطی کے امکانات فزوں ہی نہیں فزوں تر ہوتے ہیں۔ اس سادہ سی مثال پر غور فرمائیں کہ کوئی شیریں چیز کھانے کے فوراً بعد کوئی دوسری شیریں چیز لینے سے اس کی شیرینی کا احساس واضح طور پر دھندلا جاتا ہے، اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ ایک بوٹی گڑمار نامی چبا لینے کے بعد زبان ذائقے کی شیرینی کا احساس کھو دیتی ہے۔ نزلہ زکام (فلو) کی صورت میں قوتِ شامہ (سونگھنے کی طاقت) خطا کر جاتی ہے اور سامعت کی حس ویسے ہی سائنس کی اپنی تحقیق کے مطابق بیس سے کم تعدد (Frequency) اور بیس ہزار سے زیادہ تعدد کی صوتی لہروں کے احساس سے بے بس ہے جبکہ بصری حس دوربین (Telescope) اور خوردبین (Microscope) کی محتاج ہے۔ حس لامسہ یعنی چھونے کی حس اس قدر ناقص ہے کہ حالت کا ادراک تو کر سکتی ہے لیکن حقیقت یا ماہیت کا نہیں مثلاً محض چھونے سے تیل کی چکناہٹ تو محسوس کی جا سکتی ہے لیکن یہ پتا نہیں چل سکتا کہ تیل کی نوعیت کیا ہے۔

معیار یہ مانا گیا ہے کہ سائنسی علوم کی جس شاخ میں ریاضی کا جتنا زیادہ استعمال ہو گا وہ شاخ اتنی ہی زیادہ ترقی یافتہ اور Precise یعنی معین ہو گی۔ اس لحاظ سے علم طبیعیات کو سرفہرست سمجھا جاتا ہے، جبکہ یہاں بھی کئی مقامات کی صحت محل نظر ہے، مثلاً نیوٹن کے قانون تجاذب کے ضمن میں ریاضیاتی کلیہ کے استعمال کے وقت محض زمین کے مدار کی مقدار کو شامل کیا جاتا ہے، جبکہ زیر زمین جسم کے سطح زمین سے فاصلہ کو اندازہ (Approximation) کی

Marfat.com

نذر کر کے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ماہرین کو دعوت فکر ہے کہ قانون تجاذب کے مطابق قوت اور دو زیر مشاہدہ اجسام کے درمیانی فاصلے کا مربع (خود کا حاصل ضرب) باہم معکوس ہیں۔ اس لیے کسی بھی جسم کا وزن زمین کے مرکز ثقل پر زیادہ سے زیادہ (Maximum) ہونا چاہیے جبکہ علم سائنس اسے صفر مانتا ہے۔ کئی اور مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن اس سمت میں طوالت عام قاری کے لیے باعث گرانباری ہوگا۔ اتنا ضرور عرض ہے کہ علم ریاضی جسے تمام سائنسی علوم کی ماں کا مقام دیا جاتا ہے خود لامتناہی مقدار (Infinity) خالی سیٹ اور مقداروں کی تکمیل (Rounding of the figure) یعنی 1.5 یا اس سے زیادہ کو 2 اور 1.25 کو 1 لکھنے جیسے مشکوک مظاہر سے پُر ہے۔

اس بحث سے بلاشبہ یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ سائنس غیر کامل اور ارتقا پذیر ہونے کے باعث علم بالوحی کی رہنما کبھی نہیں ہوسکتی اور علم بالوحی کی حسی علوم پر تطبیق کی کوشش ایک ایسا رائیگاں عمل ہے جس سے علم بالوحی انسانی علم (حسی علم) کے ناقص نمونے پر ڈھال دیا گیا اور نوع انسانی کی ترقی میں اپنا وظیفہ ادا کرنے سے معذور ہورہا ہے۔ اسی لیے آج زندگی جہاں سائنس کے ذریعہ بہت آسان ہوگئی ہے وہاں اس کی حشر سامانیوں کے صدقے مہلک نیوکلیائی ہتھیاروں سے عالم مسلسل جان کنی میں بھی ہے۔ غالباً اسی کیفیت کا ادراک کرتے ہوئے حضرت علامہ اقبال نے فرمایا تھا "مسلمان کے لیے لازم ہے کہ علم کو مسلمان کرے۔"

امت مسلمہ کے لیے علم بالوحی کی روشنی میں انسانی علوم کے کماحقہ ارتقا کے ذریعے موجودہ پسماندگی، بے عملی اور اس بے عملی کے باعث اقوام عالم میں بے توقیری سے نجات ہے اور اس کا بین ثبوت مسلم امہ کا وہ تابناک ماضی ہے جب مسلم دنیا رجوع الی اللہ کے ساتھ تحقیق و تفکر کے باعث دنیا کے لیے منبع فیض و علوم بنی ہوئی تھی اور یورپ اپنی تاریخ کے دور تاریک (Dark Ages) میں ٹاک ٹوئیاں مار رہا تھا اور اس دور میں مسلم معاشرہ تحقیقی، تخلیقی، معاشی، معاشرتی، سماجی اور ماحولیاتی حسن سے مزین تھا۔ مسلمان تمام علمی سرگرمیوں میں اقوام عالم کے استاد تھے۔

آیئے! کیوں نہ اپنے تابناک ماضی سے اپنے اسلاف سے ولولۂ عمل حاصل کرنے کی سعی مشکور کریں کہ بقول شاعر:

توفیق عمل مانگ نیاکان کہن سے
شاہان چہ عجب گر بنوازند گدا را

ثابت ہوا کہ حسی علوم کا علم بالوحی رہنما ہے نہ کہ مخالف۔ علم بالوحی ہمیشہ غور وفکر اور

Marfat.com

حقیقت شناسی کی کاوش کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور یہی سائنس ہے۔ اصول کافی کے باب العلم میں درج امام صادقؑ کا ایک فرمان ہے۔ "اللہ قبول نہیں کرتا کسی عمل کو بغیر معرفت کے اور معرفت مفید نہیں بغیر عمل کے۔" کیا سائنسی طریق کار کے یہی دو اہم مدارج نہیں، اول غور و خوض کرنا اور ثانیاً اس غور وفکر کے نتیجہ میں حاصل شدہ علم کی تعمیم اور پھر اطلاق۔

امیر المومنین علیؑ کا فرمان اقدس ہے "کہ کمال دین طلب علم اور اس پر عمل کرنے میں ہے۔" غرضیکہ خانوادۂ رسالت مآب کے ہر فرد نے تمام علوم اور ان کے ارتقا کے عمل میں سرگرم ہونے کی تلقین کی ہے۔ کہیں بھی حسی علوم کو نظرانداز کرنے کی طرف اشارہ تک نہیں۔ آیئے بغرض یقین دیکھیں کہ قرآن اور بعد از قرآن فرامین معصومینؑ میں سائنسی اشارات و آثارات کی صورت کیا ہے؟

قرآن حکیم میں ذکر ہے "کیا ان لوگوں نے جو کافر ہو گئے غور نہیں کیا کہ یقیناً آسمان اور زمین دونوں بند تھے پس ہم نے ان دونوں کو شگافتہ کیا۔ ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا پھر بھی وہ ایمان نہیں لاتے، اور ہم نے زمین میں بوجھل پہاڑ بنادیے تاکہ وہ (زمین) ان (لوگوں) کو لے کر کسی طرف جھک نہ پڑے اور ہم نے اس میں کھلے راستے بنا دیے تاکہ وہ راہ پائیں اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا اور یہ لوگ اس کی نشانیوں سے روگرداں ہیں اور وہ خدا ہی ہے جس نے ابتدائے زندگی پر یوں روشنی ڈالی ہے کہ:

۱۔ آسمان اور زمین بند بمعنی اس کے ہیں کہ آسمان سے بارش نہ ہوتی تھی اور زمین سے نباتات نہ اگتی تھی۔

۲۔ پھر اللہ پاک نے ان دونوں کو اس طرح شگافتہ کیا کہ آسمان سے بارش برسنا شروع ہوئی اور پانی سے اللہ تعالیٰ نے جانداروں کو پیدا کیا۔ زمین نے نباتات پیدا کرکے رزق اور سامان ضروریات مہیا کیا۔ ماہرین کو دعوت ہے کہ (Big Bang Theory) کا اس آیت کی روشنی میں مطالعہ کریں۔

۳۔ زمین میں بوجھل پہاڑوں کا وجود وزن اور توازن کے نظریہ کی طرف اشارہ ہے۔

۴۔ زمین میں کھلے راستے ہونا کوئی غیر مانوس تصور نہیں بلکہ اب تو aerial routes ہوائی راستے بھی متعین ہیں۔

۵۔ سائنس دانوں کے مطابق آسمان گیس یا گیسوں کی تہہ ہے اور یہی تصور (Concept) محفوظ چھت کا قرآن کریم نے دیا ہے۔" کیا ہم اوزون (Ozone) کی تہہ کو محفوظ چھت سمجھنے میں حق بجانب نہیں جو سورج کی بالائے بنفشی شعاعوں سے روک مہیا

Marfat.com

کرتی ہے؟

۶۔سورج اور چاند کی پیدائش سے متصل رات اور دن کا ذکر اور پھر سورج اور چاند کے آسمان میں تیرنے سے نظام شمسی، اس کی منظم حرکت اور نتیجتاً پیدا ہونے والی گردش لیل و نہار کی طرف اشارہ ہے۔

ہمارے خیال میں یہ اللہ تبارک تعالیٰ کا طریقہ ہے کہ کسی بھی علمی مظہر یا مظاہر کو اس قدر مبرہن بیان نہیں فرمایا کہ جذبۂ جستجو ماند پڑ جائے بلکہ انداز قرآن متجس نوعیت کی فطرت انسانی کو مہمیز دینے کا ہے تاکہ انسان صلاحیتِ غور وفکر کو استعمال کرے کہ یہی صلاحیت انسان کو بے شعور حیوان سے ممتاز کرتی ہے۔ ایک اور جگہ آیا ہے۔ ترجمہ: ''پتھروں میں سے تو ایسے بھی ہیں کہ جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں اور بعض ان میں سے ایسے ہیں جو پھٹ جاتے ہیں اور ان میں سے پانی نکلتا ہے اور بعض ان میں سے ایسے بھی ہیں جو خوف خدا سے گر پڑتے ہیں۔'' (پارہ ۱، سورۃ البقرہ ۲، آیت نمبر ۷۴) یہاں پہاڑوں سے چشمے پھوٹنے کی طرف اشارہ ہے بلکہ پتھروں کا خوف خدا سے گرپڑنا یقیناً جدید اصطلاح میں پہاڑوں پر لینڈ سلائیڈنگ (Land Sliding) ہے۔

ایک اور موقع پر خداوند عالم کا ارشاد ہے'' یقیناً ہم نے آسمان میں برج مقرر کیے ہیں اور اسے دیکھنے والوں کے لیے زینت دی اور ہم نے ہر مردود شیطان سے اس کی (آسمان کی) حفاظت کی ہے مگر جو چوری سے سن لے تو اس کا پیچھا ایک چمکتا ہوا ستارہ کرتا ہے اور زمین ہم نے پھیلا دی اور ہم نے اس میں پہاڑ نصب کر دیے اور ہم نے اس میں ہر مناسب چیز اگا دی اور ہم نے اس میں تمہارے لیے سامان زندگی مقرر کردیے اور ان کے لیے جن کے تم رازق نہیں ہو کوئی چیز ایسی نہیں مگر یہ کہ ہمارے پاس اس کے خزانے موجود ہیں۔ ہم اس (خزانے کو) ایک جانے بوجھے ہوئے انداز کے مطابق اتارتے ہیں اور ہم نے ایسی ہوائیں بھیجیں جو درختوں کو باردار اور بادلوں کو پُرآب کردیں۔ پھر ہم نے تم کو وہ پانی پلایا حالانکہ تم اس کے جمع کرنے والے نہیں ہو۔'' (پارہ ۱۴، سورۃ الحجر ۱۵، آیات نمبر ۲۶۔۱۶)

۱۔آسمانوں میں برج، جدید تحقیق نے بارہ برج ثابت کردیے بلکہ ان بروج پر قائم کردہ علم اب باقاعدہ سائنس بن چکا ہے۔

۲۔آسمان سے چمکتا ہوا ستارہ شہاب ثاقب ہے جس کا مطالعہ خلائی جہازوں کی ساخت میں اختیار کی جانے والی کئی احتیاطی تدابیر کا باعث بنا ہے۔

۳۔ زمین میں پہاڑ، زمین کا پھیلاؤ، میدانی علاقے اور اس میں نباتات کا وجود حرفت

Marfat.com

زراعت اور علوم زرعی کی ترقی کا محرک ہے۔

۴۔زمین میں سامان زندگی معدنیات کے وجود کی طرف اشارہ ہے۔

۵۔سامان زندگی ان کے لیے بھی جن کے تم رازق نہیں ہو زیر زمین رہنے والے حشرات کے وجود کی طرف اشارہ ہے۔ اب تو زرعی ماہرین باضابطہ ایسے حشرات کا ذکر کرتے ہیں جو ایک خاص مدت زیر زمین سوئے رہتے ہیں اور پھر فصلوں پر حملہ آور ہوتے ہیں۔

۶۔اللہ کے پاس خزانے موجود ہیں انسان کے لیے مفید اور باعث رزق، مثلاً بارش بھی باعث رزق ہے اور دھوپ بھی کہ Photosynthesis کے ذریعہ نباتات کی خوراک کا سامان ہوتا ہے۔ غالباً دھوپ کی ضرورت کے مطابق ہی خلاقِ عالم کبھی مطلع صاف رکھتا ہے اور کبھی ابرآلود۔ اس طرح شمسی توانائی کا حصول ایک اور خزانہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ فضا میں مفید بیکٹیریا عمل تخمیر (Fermentation) کے ذمہ دار ہیں جو خدا کی طرف سے انسان کے لیے خزانہ ہے۔ ابھی نہ جانے اور کتنے خزائن ہیں جو منتظر تحقیق ہیں۔

۷۔درختوں کو باروار بنانے والی ہوائیں پودوں میں Asexual Reproduction کا حوالہ ہے بلکہ اگر ہم یہ کہیں کہ صرف ایک زوج ہے اس جنس کے کئی جانداروں کی تخلیق یعنی کلوننگ بھی اسی سائنسی اشارے کا نتیجہ ہے تو غلط نہیں اور ابھی آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا!

۸۔پانی جمع کرنے کا حوالہ سطح زمین پر اور زیر زمین پانی کے ذخیرہ کا یقینی حوالہ ہے۔

جس طرح ابتدائے مضمون میں اشارہ کیا گیا ہے قرآن کریم میں کائنات کے بارے میں تمام سائنسی آیات پر سرسری تبصرہ بھی ایک علیحدہ کتاب کا متقاضی ہے جبکہ تحقیق و تفتیش تو بے انتہا اسرار کا انکشاف کرسکتی ہے۔

انجیل مقدس میں بھی Genesis کے باب میں زیر مضمون تخلیق کائنات پر بحث کی گئی ہے جو دعوتِ فکر دیتی ہے۔ اب ہم فرامین آئمہؑ میں سے صرف چند ایک کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔ حضرت علیؑ خطبہ اشباح میں فرماتے ہیں:'' اس (اللہ تعالیٰ) نے اپنی قدرت سے متضاد چیزوں میں انس و محبت اور ربط و ضبط پیدا کردیا۔ یہ attraction between unlikes کا واضح ذکر ہے۔ اسی طرح ایک اور جگہ فرمایا '' خداوند عالم نے کسی رابطہ کے بغیر آسمانوں کی بلند و پست منزلوں کو منظم کیا۔ اس کے وسیع شگافوں کو باہم ملادیا اور جذب و تجاذب کی طاقت دے کر انہیں ایک دوسرے سے جکڑ دیا۔ آسمان دھوئیں کی شکل میں تھے۔''

سائنس کا معمولی علم رکھنے والے ان بیانات اور سائنس میں بہت کچھ مماثلت گویا باہمی تائید کا مشاہدہ کرسکتے ہیں۔ یہ پورا خطبہ ماہرین علوم سائنس کو دعوت فکر دیتا ہے۔

Marfat.com

صفات باری تعالیٰ کے ضمن میں ارشاد ہے کہ ''اس کے سوا ہر سننے والا لطیف آوازیں نہیں سن سکتا اور بڑی آوازیں اسے بہرہ کردیتی ہیں اور دور کی آوازیں اس تک پہنچ نہیں پاتیں۔ اس کے سوا دیکھنے والا پوشیدہ رنگوں اور لطیف جسموں کے دیکھنے سے پھر بھی نابینا ہے۔''

اس میں واضح اشارات Audible frequency range اور اس طرح روشنی کی طیف کے غیر مرئی حصہ یعنی Spectrum کے Ultra violet اور Infra red کی طرف ہیں۔

ایک خطبہ میں امیرالمومنینؑ نے ارشاد فرمایا: ''خدا کی قسم جب تک دنیا کا قصہ چل رہا ہے اور ایک ستارہ دوسرے کی طرف کھینچ رہا ہے۔'' گویا دوام کائنات ستاروں کی باہمی کشش سے ہے۔ امامؑ قوت تجاذب کے فلسفہ سے اس تیقن کے ساتھ آشنا تھے کہ آپؑ نے کئی جگہ اس کا ذکر فرمایا ہے۔

زبور آل محمد یعنی صحیفہ سجادیہ میں امام زین العابدینؑ خدائے بزرگ و برتر کی حمد و ستائش میں رقم طراز ہیں: ''تمام تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے ہمارے جسموں میں پھیلنے والے اعصاب (آلات البسط) اور سکڑنے والے عضلات (ادوات القبض) ترتیب دیے۔'' اس میں اعصاب اور عضلات کا فرق ملاحظہ کریں۔ پھر روشنی کی مطلوبہ مقدار حاصل کرنے کے لیے حسب ضرورت آنکھ کا بند ہونا اور کھلنا اور عمل تنفس کے دوران سینے کے زیر و بم پر غور فرمائیں کہ کس طرح دینی علوم حسی علوم کے نقیب بن گئے ہیں۔

آخر میں ہم تسبیح و تقدیس الٰہی کے ضمن میں امام علی زین العابدینؑ کی ایک دعا کا جائزہ لے کر اپنے موقف کی حقانیت ثابت کرتے ہوئے اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

جو کچھ تہہ خاک ہے تو اسے دیکھتا اور سنتا ہے۔ پاک ہے تیری ذات تو ہر رازدارانہ گفتگو پر مطلع ہے۔ پاک ہے تو جو کچھ پانی کی گہرائی میں ہے اسے دیکھتا ہے۔ پاک ہے تیری ذات کہ تو سمندروں کی گہرائی میں مچھلیوں کے سانس لینے کی آواز سنتا ہے۔ پاک ہے تیری ذات تو آسمان کا وزن جانتا ہے۔ پاک ہے تیری ذات جو زمین کے وزنوں سے واقف ہے۔ پاک ہے تیری ذات جو تاریکی اور روشنی کے وزن سے آگاہ ہے۔ پاک ہے تیری ذات تو سایہ اور ہوا کا وزن جانتا ہے۔ پاک ہے تیری ذات تو ہوا کے جھونکے کے وزن سے آگاہ ہے کہ وزن کتنے ذروں کے برابر ہے۔

اس دعا میں زیر زمین معدن و مخلوق کی طرف اشارہ ہے، تو ہر قطرہ آب میں موجود کروڑوں خوردبینی مخلوق اور غیر خوردبینی آبی مخلوق پر امامؑ کی نظر بھی۔ سائنس ہوا کے وزن کی قائل بھی ہے اور روشنی کے ذراتی نظریہ کے مطابق روشنی کے وزن کی بھی، بلکہ فوٹو الیکٹرک اثر روشنی کے وزن اور قوت کا ثبوت ہے۔ زمین کا وزن تو کلیۂ تجاذب کے ذریعہ معلوم بھی کیا جا چکا ہے جبکہ آسمان سائنس کے دعویٰ کے مطابق گیسوں کا تہہ در تہہ غلاف ہے، تو گیسیں

Marfat.com

یقیناً وزن رکھتی ہیں۔ اس دعا میں ذروں کو اگر ایٹم، مالیکیول یا مول (Mole) جدید تجزیاتی کیمیا کی اصطلاح میں لیا جائے تو یہ بعید از حقیقت بالکل نہیں جبکہ مثقال پیمائش اوزان کا پیمانہ ایٹمی وزن a.m.u ہوسکتا ہے۔

آخر میں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ آئمہؑ کا علم رسول اللہؐ کے علم سے ماخوذ ہونے کے باعث علم بالوحی کے مترادف ہے۔ چنانچہ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہؐ سے اس طرح علم حاصل کیا جس طرح اونٹنی کا بچہ اپنی ماں سے خوراک حاصل کرتا ہے۔

آیئے اس عہد کے ساتھ اپنی کوششوں کا رخ متعین کریں کہ عصری علوم میں اس قدر مہارت حاصل کریں کہ امامؑ کے اس فرمان کی تعمیل ہو کہ انسان کی سب سے بڑی خوبصورتی تبحر علمی ہے اور یقین کی اس منزل پر پہنچیں کہ بقول شاعر:

میری ہر سوچ کا محور تو ہے
میرے اندر میرے باہر تو ہے
مجھ کو تسلیم ہے مالک میرے
میرا اول میرا آخر تو ہے

ماخذ

۱۔ قرآن کریم، ترجمہ سید امداد حسین
۲۔ نہج البلاغہ خطبات ۶۵، ۹۰، ۱۲۶، ترجمہ مفتی جعفر حسین
۳۔ صحیفۂ کاملہ، مجموعہ ادعیۂ امام زین العابدینؑ
۴۔ *Spirit of Islam by Ameer Ali*
۵۔ کتاب اردو جماعت نہم مطبوعہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ
۶۔ قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل مصنفہ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، سروسز بک کلب
۷۔ المصلوب، از شاہد مختار، شاہد پبلی کیشنز، لاہور

☆☆☆

Marfat.com

گاہے گاہے باز خواں...

جذباتی ہم آہنگی کے کچھ تاریخی واقعات

سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم☆

ہر قوم اور ملک کی تاریخ میں کچھ واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں، جنہیں پیش کر کے اس کے افراد کے دل توڑے جاسکتے ہیں، لیکن اسی قوم اور ملک کی تاریخ میں ایسے بھی واقعات ہوتے ہیں، جنہیں قلمبند کر کے اس کے افراد کے دل جوڑے جاسکتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک کی تاریخ میں ایسی ہی تفصیلات زیادہ درج کی گئی ہیں، جن کو پڑھ کر یہاں کے باشندوں میں ایک دوسرے سے نفرت اور کدورت پیدا ہوئی۔ ۱۹۳۰ء میں مولانا محمد علی نے لندن کی پہلی گول میز کانفرنس میں جو معرکتہ آلارا تقریر کی تھی، اس میں انگریزوں کو مخاطب کر کے کہا تھا:

> آپ کا جس طرح یہ گناہ ہے کہ آپ نے ہندوستان کو اس کے مردانہ اوصاف سے محروم کیا، اسی طرح آپ کا یہ بھی گناہ ہے کہ آپ نے ہندوستان کی غلط تاریخیں لکھیں، اسکولوں میں پڑھوائیں، جس کی بنا پر اسکول کے بچوں کے ذہن میں ہندوستان کی تاریخ کا ایک غلط تصور پیدا ہوا۔ سڑکوں پر چھٹیوں میں جو جھگڑے ہوا کرتے ہیں، یا ہمارے پڑھے لکھے لوگوں کا جو ذہن بنا ہے وہ زیادہ تر ان تاریخوں کے مطالعہ کا نتیجہ ہے، جو سیاسی اغراض کے تحت لکھی گئی تھیں؛ اسی کے مطالعہ کی وجہ سے سیاست میں انتقامی جذبہ پیدا ہوا۔

۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ فسادات کے زمانہ میں گاندھی جی نے اپنی پرارتھنا سبھا سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ جب تک ہمارے ملک کے اسکولوں اور کالجوں میں تاریخ کی کتابوں کے ذریعہ ہماری تاریخ غلط انداز میں پڑھائی جاتی رہے گی، اس ملک میں مستقل طور پر فرقہ وارانہ رواداری پیدا نہیں ہوسکے گی۔

پنڈت جواہر لال نے اپنی تصنیف ہندوستان کی دریافت میں لکھا ہے کہ انگریزوں

☆اعظم گڑھ، یو پی، انڈیا

Marfat.com

کی لکھی ہوئی کتابوں میں ان کے دور کی تو مدح سرائی ہوتی ہے، لیکن ان سے پہلے کے ہزاروں برس کے دوران میں جو کچھ ہوا، اس کا ذکر بہت مختصر اور حقارت آمیز لہجہ میں ہوتا ہے۔

راقم کو ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر کئی کتابیں مرتب کرنے کا اتفاق ہوا ہے، انہیں لکھتے وقت یہ خیال غالب رہا کہ قلم سے کوئی فقرہ یا ایسی بات نکلنے نہ پائے، جس سے یہاں کے باشندوں کی جذباتی ہم آہنگی کے نشوونما میں خلل پیدا ہو، لیکن اس جذباتی ہم آہنگی کا تخیل میرا اپنا ہے، جو ممکن ہے سیاستدانوں سے کچھ مختلف ہو۔

یہ مقالہ لکھتے وقت دل کی اندرونی آواز کی پکار ہوئی کہ کچھ ایسے واقعات جمع کردیے جائیں جو اس ملک میں موانست، یگانگت اور یکجہتی کی فضا قائم کرنے میں معاون ہوں۔اس مقالے میں جو روایتیں یا حکایتیں قلم بند کی جارہی ہیں، وہ دادِ تحقیق حاصل کرنے کے لیے نہیں۔ ان کے حوالے میری مختلف تصانیف میں آئے ہیں، اس لیے ممکن ہے کہ بعض ناظرین کو یہ پہلے سے معلوم ہوں اور ان کے لیے یہ نئی نہ ہوں؛ لیکن ان منتشر واقعات کو یکجا کرنے کا جو مقصد ہے وہ پورا ہوجائے، تو یہی اس مقالے کے لکھنے کا اصلی صلہ ہے۔ ضرورت ہے کہ چھان بین کر کے اس قسم کے واقعات کو زیادہ سے زیادہ جمع کر کے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں پھیلایا جائے۔

سدید الدین محمد عوفی، سلطان شمس الدین التمش (ف ۱۲۳۶ء) کے عہد کا ایک مشہور مصنف گذرا ہے۔ اس نے پہلے لباب الالباب لکھی جو فارسی شعرا کے تذکروں میں قدیم ترین تذکرہ سمجھا جاتا ہے؛ پھر جوامع الحکایات و لوامع الروایات لکھی، جو تاریخی حکایتوں کی رنگارنگی، بوقلمونی، دلنشینی اور سچائی کی وجہ سے بہت مشہور ہوئی۔ اس میں بعض حکایتیں ایسی بھی ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ سدید الدین محمد عوفی گجرات کے بعض ہندو راجاؤں اور وہاں کے ہندو باشندوں کے اخلاقی اور مذہبی سیرت و کردار سے بہت متاثر تھا۔

عوفی کا بیان ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی باضابطہ حکومت قائم ہونے سے پہلے نہروالہ (گجرات) کا حکمران راے جے سنگھ تھا۔ اس کے عہد حکومت میں اس کے حدودِ مملکت میں کھمبایت میں ایک جامع مسجد تھی، جس کے مینار پر چڑھ کر مؤذن اذان دیا کرتا تھا۔ ایک دن ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملہ کردیا، اور اسی (۸۰) مسلمان تلوار کے گھاٹ اتار دیے گئے؛ مسجد جلا دی گئی؛ مینار مسمار کردیا گیا۔ مسلمانوں کا خطیب علی نامی بھاگ کر نہروالہ آیا۔ اس نے راجہ تک پہنچنے کی کوشش کی، لیکن درباریوں نے اس کی رسائی نہ ہونے دی۔ ایک دن راجہ شکار کو جارہا تھا، خطیب جھپٹ کر سامنے آیا۔ اس نے راجہ کے ہاتھی کو روکا اور کھمبایت کے

Marfat.com

دردناک حادثے کی پوری تفصیل دو ہندی شعروں میں راجہ کے گوش گزار کی۔ یہ سرگزشت سن کر راجہ نے خطیب کو اپنے ایک مصاحب کے حوالے کیا اور حکم دیا کہ اس کی خاطر مدارات کی جائے، اور دوسرا حکم ملنے پر اسے پیش کیا جائے۔ شکار سے واپسی پر راجہ نے اپنے ایک وزیر کو بلا کر کہا کہ میں تین دن تک نہ تو محل سے نکلوں گا نہ کسی کو باریابی کی اجازت دوں گا؛ تم ان دنوں امور مملکت کی اچھی طرح نگرانی رکھنا اور میرے آرام میں مخل نہ ہونا۔ اسی رات راجہ جے سنگھ ایک سانڈنی پر سوار ہو کر تنہا کھمبایت کی طرف چل دیا۔ نہروالہ کھمبایت سے چالیس فرسنگ دور ہے۔ راجہ نے یہ مسافت ایک رات اور ایک دن میں طے کی۔ جب کھمبایت پہنچا تو پایکوں کا بھیس بدل کر تلوار کمر میں لٹکائی اور رات کے اندھیرے میں شہر کے اندر داخل ہوگیا۔ اس نے شہر کے بارونق حصوں اور بازاروں میں ہر موڑ اور ہر ناکے پر ٹھہر ٹھہر کر سن گن لی، اور پوچھ گوچھ کی۔ ہر ایک کی زبانی یہی سننے میں آیا کہ مسلمانوں پر بڑا ظلم ہوا ہے اور بیچارے بیگناہ، بے قصور مارے گئے ہیں۔ مسلمانوں کی مظلومی کا یقین ہوجانے پر راجہ شہر سے باہر نکلا۔ دریا کے پانی سے اپنی چھاگل بھری اور نہروالہ کی طرف واپس چل پڑا؛ تیسرے دن رات کے وقت اپنی راجدھانی میں پہنچا۔ صبح کو دربار ہوا۔ مصاحبوں اور درباریوں کو بار ملا، راجہ نے خطیب کو بلا کر حکم دیا کہ وہ اپنا معاملہ پیش کرے۔ خطیب نے استغاثہ پیش کیا تو درباریوں نے اسے جھٹلانے کی کوشش کی۔ راجہ نے اپنے آبدار کو حکم دیا کہ رات کو پانی کی جو چھاگل تمہیں دی تھی، وہ لاؤ اور درباریوں کو اس کا پانی چکھاؤ۔ درباریوں نے پانی چکھا، تو اس کے کھاری ہونے کی وجہ سے سمجھ گئے کہ سمندر کا پانی ہے۔ اب راجہ نے بتایا کہ مذہبی اختلافات کو ملحوظ رکھتے ہوئے مجھے تم میں سے کسی پر اعتماد نہیں تھا، اس لیے میں خود کھمبایت گیا تھا اور وہاں سے مسلمانوں کی مظلومی اور دوسرے فریق کی ستم گاری کا حال معلوم کر کے آیا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں پر ظلم ہوا ہے۔ میں یہ برداشت نہیں کرسکتا، کہ جو لوگ میری پناہ میں آگئے ہیں، ان پر ظلم کیا جائے۔ یہ کہہ کر اس نے حکم دیا کہ کھمبایت کے برہمنوں، پایکوں اور آتش پرستوں کے سرداروں کو سزا دی جائے۔ اس نے اپنی طرف سے ایک لاکھ بالوترے (اس زمانے کا سکہ) عنایت کیے کہ مسجد اور مینار از سرنو تیار کیے جائیں۔ خطیب کو بھی چار چھتر بخشے جو بڑے قیمتی رنگین اور ریشمی کپڑے سے تیار کیے گئے تھے۔ (۱)

عوفی نے گجرات کے ایک دوسرے ہندو راجہ کی ایک بہت ہی پُر کیف داستان لکھی ہے۔ لکھتا ہے کہ نہروالہ کا ایک راجہ گورپال تھا۔ وہ بہت ہی نیک، انصاف پسند، اور عقلمند تھا۔ راج پاٹ پانے سے پہلے وہ برسوں سادھوؤں کی زندگی بسر کر کے دنیا کے بُرے بھلے سے

Marfat.com

واقف اور دکھ درد سے آشنا ہوچکا تھا؛ زمانے کی سردی اور گرمی کا مزہ چکھے ہوئے تھا۔ اسی لیے جب وہ گدی پر بیٹھا، تو اس نے راج کی قدر جانی اور پرجا کی عزت پہچانی۔ عدل و انصاف کو ملحوظ رکھا اور بخشش و کرم سے کام لیا۔ ایک دن وہ ہاتھی پر سوار ہوکر نہروالہ کے دروازے سے باہر جارہا تھا کہ اس کی نظر ایک خوبصورت دھوبن پر پڑی، جو سرخ رنگ کے کپڑے پہنے، گھاٹ کی طرف کپڑے دھونے کو جارہی تھی۔ راجہ نے اس کا حسین چہرہ دیکھا تو جی جان سے اس پر فریفتہ ہوگیا۔ بے اختیار حکم دیا کہ ہاتھی اس کی طرف بڑھایا جائے۔ ہاتھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ راجہ کو ہوش آیا۔ دل ہی دل میں سوچا کہ میں یہ کیا کررہا ہوں؛ پرائی عورت سے ملنے کا خیال بڑا پاپ ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے ہاتھی لوٹایا۔ محل میں پہنچ کر برہمنوں کو بلایا، اور کہا کہ لکڑیاں اکٹھی کرکے آگ جلاؤ، میں جلنا چاہتا ہوں۔ برہمنوں نے حیران ہوکر پوچھا آپ نے ایسا کون سا پاپ کیا؟ راجہ نے قصہ سنایا، تو برہمنوں نے ایک زبان ہوکر کہا: ''بیشک اگر راجہ پرجا کی بہو بیٹیوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے تو ان خاندانوں کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپ خود جل کر اپنے پاپ کو جلا ڈالیں۔'' چنانچہ لکڑیوں کا ڈھیر لگا کر گھی چھڑک کر آگ جلائی گئی۔ جب آگ خوب بھڑک اٹھی، تو راجہ آگ میں کودنے کے خیال سے آگے بڑھا۔ آگ کے قریب پہنچا ہی تھا کہ پیچھے سے برہمنوں نے آکر دامن پکڑ لیا اور کہا: بس کیجیے مہاراج! آپ کا پاپ مٹ چکا۔ آپ نے اس کا بدلہ چکا دیا، کیونکہ پاپ جو کچھ تھا، آپ کے من کا تھا، جسم کا نہیں تھا۔ آپ کا جسم اگر پاپ کرتا تو ہم اسے جلا دیتے۔ چونکہ من نے پاپ کیا تھا اور وہ اب تک برائی کے احساس کی آگ میں جلتا رہا۔ اس لیے اس کی سزا ختم ہوگئی۔ اس پر برہمن راجہ کو آگ کے پاس سے ہٹا لے گئے۔ راجہ نے ایک لاکھ بالوترے دان (صدقہ، خیرات) کیے۔(۲)

گجرات کے سوداگروں کی دیانتداری سے متعلق بھی عوفی نے ایک حکایت لکھی ہے۔ نہروالہ میں کسی سوداگر نے ایک دلال کے پاس نو لاکھ بالوترے امانت رکھوائے۔ کچھ عرصے کے بعد سوداگر کا انتقال ہوگیا، تو دلال نے اس کے بیٹے کو بلا کر کہا کہ بہت عرصہ ہوا، جب تمہارے باپ نے نو لاکھ بالوترے میرے پاس امانت رکھوائے تھے، وہ لے لو۔ لڑکے نے جواب دیا، مجھے اس سے متعلق کچھ علم نہیں، شاید بہی میں کچھ لکھا ہو؛ منگوا کر دیکھتا ہوں۔ اس پر بہی کھاتے منگوا کر دیکھے گئے، تو کسی میں بھی اس رقم کا اندراج نہ ملا۔ لڑکے نے کہا کہ اگر میرے باپ نے تمہارے پاس یہ رقم رکھی ہوتی، تو ضرور کہیں درج ہوتی۔ چونکہ ایسا نہیں ہے، میں تم سے یہ رقم نہیں لے سکتا۔ دلال اصرار کرتا رہا کہ یہ تمہاری رقم ہے تمہیں لینی ہوگی۔ لڑکا انکار کرتا رہا کہ

Marfat.com

میں ہرگز نہیں لے سکتا کیونکہ یہ میرے کھاتے میں کہیں درج نہیں ہے۔ ہوتے ہوتے یہ جھگڑا اتنا بڑھا کہ دونوں کو راجہ جے سنگھ کے دربار میں جانا پڑا۔ راجہ نے دونوں کے بیان سن کر کہا کہ اگر تم دونوں میں سے کوئی بھی یہ رقم رکھنے کو تیار نہیں تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کو کسی ایسے مصرف میں لاؤ جس سے خدا کی مخلوق کو فائدہ اور مرنے والے سوداگر کی روح کو ثواب پہنچتا رہے۔ چنانچہ اس رقم سے نہروالہ میں نولکھا تال بنایا گیا، جو بہت مشہور ہوا۔ (۳)

عوفی ہی کی روایت ہے کہ سلطان شہاب الدین محمد غوری نہروالہ میں راجپوتوں سے لڑا، لیکن لڑائی میں ناکام رہا۔ اس ناکامی کے بعد اسے غزنین لوٹے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے اور وہ اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے جنگی تیاریوں میں مصروف تھا کہ کسی نے اسے لکھ بھیجا کہ نہروالہ میں ایک مشہور ہندو سوداگر ہے، جس کا نام دسالہ ابھر ہے، وہ ہمیشہ لاکھوں کا مال تجارت کی غرض سے ان علاقوں میں بھجوایا کرتا ہے؛ چنانچہ اس وقت بھی اس کا قریب دس لاکھ کا مال غزنین میں پڑا ہے۔ اگر بادشاہ سلامت چاہیں، تو اس مال کو ضبط کرلیا جائے، اس سے نہ صرف خزانہ معمور ہوگا، بلکہ شاہی شان وشوکت میں بھی اضافہ ہوگا۔ سلطان نے جواب میں کہلا بھیجا کہ دسالہ ابھر کا یہ مال اگر نہروالہ میں ہوتا اور وہاں اس پر قبضہ کیا جاتا، تو ہمارے لیے حلال تھا، لیکن غزنین میں اس مال پر قبضہ کرنا ہمارے لیے حرام ہے۔ (۴)

لال قلعے کے عجائب گھر میں ایک کتبہ ہے، جو کبھی پالم کے ایک کنویں میں نصب تھا۔ پالم موجودہ دلی سے بارہ میل باہر اسی نام کے ہوائی اڈے کے قریب واقع تھا۔ کتبے کی زبان سنسکرت ہے۔ البتہ اس کا آخری حصہ مقامی زبان میں ہے جو ہریانہ میں بولی جاتی ہے۔ اس پر سمبت ۱۳۳۷ بکرمی (مطابق ۱۲۸۰۔۱۲۸۱ء) درج ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دلی میں سلطان غیاث الدین بلبن (ف ۱۲۸۷ء) حکمران تھا۔ اس کتبے کی حقیقی اہمیت ان خیالات میں ہے جن کا اظہار پنڈت یوگیشوار اور ان کے زیر اثر لوگوں نے ملک کے مسلمان حکمرانوں سے متعلق کیا۔ کتبے میں مسلمان حکمرانوں کو شا کا راجا کہا گیا ہے اور ان کے عہد حکومت کا تذکرہ شہاب الدین محمد غوری (ف ۱۲۰۶ء) سے ابتدا کرکے قطب الدین ایبک (ف ۱۲۱۰ء) شمس الدین ایلتتمش (ف ۱۲۳۵ء) اور رضیہ بیگم (ف ۱۲۴۰ء) کے عہد سلطنت کو شامل کرتے ہوئے وقت کے حکمران غیاث الدین بلبن پر ختم کیا ہے۔ بلبن برسر حکومت آنے سے پہلے اپنے پیشرو سلطان ناصرالدین محمود (ف ۱۲۶۵ء) کا وزیر تھا۔ اس لیے دونوں کے عہد سلطنت کی بہت تعریف کی ہے۔ بلبن کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس بادشاہ کی شاندار اور قابل تعریف حکومت میں تمام ملک مطمئن اور قانع ہے؛ بنگال کے شہر گوڑ سے افغانستان کے شہر غزنہ تک

Marfat.com

اور دکن میں دراوڑ علاقہ اور رامیشور تک ہر جگہ ملک اس قدر منور ہورہا ہے، جیسے درختوں کی خوبصورتی سے موسم بہار میں زمین مزین ہوجاتی ہے؛ اور اس بادشاہ کی خدمت میں جو متعدد راجے آتے ہیں، ان کے مکٹوں سے گرے ہوئے جواہرات کی چمک دمک سے سارا ملک جگمگا رہا ہے؛ اس کی فوجیں بحر تا بر گنگا کے دہانے سے سندھ کے دہانے تک تمام ملک پر حاوی ہیں۔ ان کی بدولت ہر شخص امن و سلامتی سے دن بسر کررہا ہے۔ جب سے اس سلطان ذیشان نے دنیا کا بوجھ اپنے کندھوں پر لیا ہے، دنیا کو سہارا دینے والے شیش ناگ دھرتی کے بوجھ سے سبکدوش ہوبیٹھے ہیں، اور وشنو بھگوان جہان کی نگہبانی سے بے فکر ہوکر اطمینان سے دودھ کے سمندر پر محوِ استراحت ہیں۔ اس سلطان کے عہد معدلت میں جو سینکڑوں عالیشان شہروں کا والی ہے، دلی کا دلفریب شہر خوشحال اور فارغ البال ہے۔ یہ شہر دھرتی ماتا کی طرح بیشار جواہرات کا خزانہ ہے۔ سورگ دھام عیش و مسرت کا ٹھکانا ہے۔ پاتال کی مانند شہزور دیوتاؤں کا مسکن اور مایا کی طرح دلکش اور دلفریب ہے۔(۵)

سلطان جلال الدین خلجی (ف ۱۲۹۶ء) دلی کے تخت پر بیٹھنے سے پہلے کیتھل کا اقطاع دار (حاکم) تھا۔ ایک ہندو منڈاہر نے اس پر اس زمانے میں قاتلانہ حملہ کرنے کی کوشش کی جس میں اس نے بڑی بہادری دکھائی۔ جلال الدین خلجی اس کی بہادری سے بہت متاثر ہوا اور اسے معاف کردیا۔ بعد کو جب وہ تخت پر بیٹھا تو اس نے اس منڈاہر کو دربار میں طلب کیا اور اس کی بہادری کی بنا پر اسے خلعت اور گھوڑے دے کر نوازا اور دربار کے حاضرین کو مخاطب کرکے کہا کہ میں نے بڑی بڑی لڑائیاں لڑی ہیں اور خوب شمشیر زنی کی ہے، لیکن اس منڈاہر کا سا کوئی بہادر نہیں دیکھا۔ ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ سلطان جلال الدین خلجی نے اس کا ایک لاکھ جیتل وظیفہ مقرر کیا اور اسے کوئی عہدہ بھی عطا کیا۔(۶)

سلطان علاء الدین خلجی (ف ۱۳۱۶ء) کے دربار میں موسیقی کے بڑے بڑے ماہرین جمع تھے۔ جنوبی ہند سے بہت سے ہندو ماہرین موسیقی آتے اور اس کے اور اس کے امرا کی زرپاشی سے سیراب ہوتے۔ ان ہی میں نائک گوپال بھی تھا۔ اس کے دو ہزار شاگرد تھے، جو اس کے سنگھاسن کو اپنے کاندھوں پر اٹھایا کرتے تھے اور کبھی اسے زمین پر پاؤں نہیں رکھنے دیتے تھے۔ سلطان علاء الدین کے دربار میں امیر خسرو (ف ۱۳۲۴ء) بھی تھے جنہیں موسیقی میں بھی مہارت حاصل تھی۔ گوپال سلطان کے دربار میں اپنا فن دکھاتا، تو امیر خسرو تخت کی آڑ میں چھپ کر سنا کرتے تھے۔ گوپال جب کوئی راگ شروع کرتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ اس راگ میں اس کا کوئی مدمقابل نہیں۔ امیر خسرو نے گوپال کے طرز کو اچھی طرح سمجھ لیا تو دربار میں

Marfat.com

آ کر ایرانی راگ ''قول'' کو اپنے جنوبی ہند کے حریف کے طرز میں ایسا گایا کہ گوپال سن کر مبہوت ہوگیا اور یہ کہہ کر امیر خسرو کی برتری تسلیم کرلی کہ میں جانتا ہوں کہ یہ چوری ہے، لیکن یہ چوری اس طرح کی گئی ہے کہ میرا بھی اس پر اختیار نہیں۔(۷)

امیر خسرو سلاطین کے دربار سے وابستہ رہنے کے باوجود حضرت خواجہ نظام الدین اولیا (ف ۱۳۲۴ء) سے والہانہ لگاؤ رکھتے تھے۔ انہیں اپنا روحانی مرشد بنا لیا تھا اور ان کی خدمت میں رہنے کو سعادتِ عظمیٰ سمجھتے تھے۔ کبھی خلوت میں ان کے ادنیٰ خادم بن کر رہتے، کبھی جلوت میں خوش الحان قوال بن کر اپنی غزلیں سناتے۔ ایک روز شیخ نظام الدین اولیا اپنی خانقاہ سے امیر خسرو کے ساتھ نکلے، جمنا کے کنارے ہندو مرد عورت غسل کر رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر حضرت خواجہ نظام الدین نے فرمایا:

ہر قوم راست راہے، دینے و قبلہ گاہے

اس وقت شیخ نظام الدین اولیاء کے سر پر جو ٹوپی تھی، وہ ذرا ٹیڑھی رکھی ہوئی تھی، مذکورہ بالا مصرع سن کر امیر نے فوراً کہا:

من قبلہ راست کردم برطرف کجکلا ہے (۸)

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا (ف ۱۳۲۴ء) کے ایک بھانجے مولانا تقی الدین نوح تھے۔ حضرت خواجہ ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کا عین شباب میں انتقال ہوگیا۔ قدرتاً حضرت خواجہ کو اس سے بڑا صدمہ پہنچا۔ چھ مہینے تک ان پر حالتِ سکوت طاری رہی؛ اس سے امیر خسرو بھی مغموم تھے، اور برابر اس فکر میں رہتے کہ کس طرح مرشد کا غم غلط ہو۔ اتنے میں بسنت کا میلہ آیا۔ حسب دستور دلّی کے ہندو کالکاجی کے مندر پر سرسوں کے پھول چڑھا رہے تھے اور مست ہو کر ترانے الاپ رہے تھے۔ امیر خسرو بھی اس منظر کو دیکھ کر بیخود ہوگئے۔ اسی حالت میں فارسی اور ہندی کے چند شعر موزوں کیے۔ سرسوں کے پھول توڑے اور پگڑی کو کج کرکے مستانہ شان میں جھومتے جھامتے اشعار پڑھتے، حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، جو اس وقت اپنے بھانجے کے مزار پر تھے۔ انہوں نے امیر خسرو کی مستانہ ادا دیکھ کر اور ان کے اشعار سن کر تبسم فرمایا۔ گویا امیر خسرو کا مقصود حاصل ہوگیا۔ اس روز سے جب بھی دلّی کے ہندو کالکاجی کے مندر پر جاتے ہیں تو سرسوں کے پھول ہاتھ میں لیے قوالوں سے اشعار پڑھواتے ہوئے مولانا تقی الدین کے مزار پر بھی جاتے ہیں اور پھر وہاں سے حضرت خواجہ کے مزار پر آتے ہیں۔ ان اشعار میں سے ایک شعر یہ ہے:

اشک ریز آمدست ابر بہار ساقیا! گل بریز بادہ بیار

Marfat.com

قوال ہندی کی ٹھمریوں کو پڑھ پڑھ کر اسی شعر کو بار بار دہراتے ہیں، ہندی کا ایک مصرع یہ ہے:

عرب یار توری بسنت منائی

یہ پڑھا جاتا تو بڑا اثر پیدا ہوتا۔ رفتہ رفتہ دلی کی درگاہوں میں پندرہ دن بسنت کا میلہ رہنے لگا۔ پھر دوسری جگہوں میں بھی مسلمان بسنت منانے لگے۔

بسنت کے موقع پر امیر خسرو کا ایک گیت ان کی طرف سے منسوب ہے:

حضرت کھاجہ سنگ کھیلے دھمال
بائیس کھاجہ مل بن بن آیوتا میں
حضرت رسول صاحب جمال
حضرت کھاجہ سنگ کھیلے دھمال
عرب یار تیرو بسنت منائیو
سدا رکھیے لال گلال
حضرت کھاجہ سنگ کھیلے دھمال

امیر خسرو کی روایت ہے کہ ایک مسلمان حج کو جارہا تھا کہ اسے راستے میں ایک برہمن ملا جو سومناتھ مندر کی زیارت کو جارہا تھا۔ یہ برہمن اپنے عقیدے کی شدت میں زمین کو لیٹ کر ناپتا جاتا۔ جس سے اس کا سینہ راستہ کے پتھر اینٹ سے چھلنی ہوگیا تھا۔ حاجی نے برہمن سے پوچھا: ''دوست، تم کہاں جار ہے ہو؟'' برہمن نے کہا: ''میں تو کئی سال سے اسی طرح سفر کررہا ہوں'' حاجی نے کہا: خدا نے تم کو دو پاؤں دیے ہیں، تو چلنے کے بجائے اپنے سینے کے بل کیوں رینگ رہے ہو؟'' برہمن نے جواب دیا کہ جب سے میں نے اپنی جان مورتی کے حوالے کردی ہے میں اسی طرح سینہ کے بل رینگ رہا ہوں، یہ لکھ کر امیر خسرو کہتے ہیں کہ ہندو بت پرستوں پر طنز کیا جاتا ہے لیکن ان کے عقیدے میں جو اخلاص ہے اس سے سبق لیا جاسکتا ہے۔(۹)

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے ایک چہیتے خلیفہ امیر حسن سجزی (ف۱۳۳۵ء) بھی تھے۔ وہ ان کے ملفوظات لکھا کرتے تھے جو **فوائد الفواد** کے نام سے اب تک مشہور اور مقبول ہے۔ وہ بھی امیر خسرو کی طرح شاہی دربار سے وابستہ رہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھے شاہی دربار سے کچھ دنوں تک تنخواہ نہ ملی، جس سے میں پریشان تھا۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کو میری پریشانی کا حال معلوم ہوا، تو انہوں نے مجھے یہ حکایت سنائی کہ کسی شہر میں

Marfat.com

ایک برہمن رہتا تھا اس کے پاس بڑی دولت تھی؛ لیکن اس شہر کے حاکم نے اس پر جرمانہ کرکے اس کا سارا مال و اسباب ضبط کرلیا؛ اور اسے تباہ و برباد کردیا۔ وہ برہمن بہت ہی مفلس اور بدحال ہوگیا۔ ایک روز وہ کہیں جارہا تھا کہ اس کا دوست راستے میں ملا۔ اس نے برہمن سے پوچھا: " تمہارا کیا حال ہے؟" برہمن نے جواب دیا: "اچھا ہے اور خوش ہوں۔" دوست نے کہا کہ دھن دولت تو ساری تم سے لے لی گئی، اب تم خوش کیسے رہ سکتے ہو؟ برہمن نے جواب دیا " میرا جنیو تو میرے پاس ہے۔" (زنار من بامن است)۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا نے یہ حکایت سنا کر امیر حسن سجزی سے پوچھا "تم نے سنا؟" امیر حسن نے جواب دیا کہ جی ہاں! اس حکایت سے مجھے بڑی باطنی تسکین اور تسلی ہوئی۔(۱۰)

ابن بطوطہ (ف ۱۳۷۸ء) نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ ایک ہندو امیر نے سلطان محمد تغلق (ف ۱۳۵۱ء) پر دعویٰ کیا کہ سلطان نے اس کے بھائی کو بے وجہ مار ڈالا ہے۔ قاضی نے سلطان کو عدالت میں طلب کیا۔ سلطان کسی ہتھیار کے بغیر قاضی کی عدالت میں حاضر ہوا اور وہاں جاکر سلام اور تعظیم کی۔ سلطان نے قاضی کو پہلے سے کہلا بھیجا تھا کہ جب وہ عدالت میں آئے تو اس کی تعظیم نہ کی جائے۔ وہ قاضی کے سامنے ملزم کی حیثیت سے کھڑا ہوا، تو قاضی نے حکم دیا کہ سلطان مدعی کو راضی کرے، ورنہ قصاص کا حکم ہوگا۔ غرض سلطان نے مدعی کو راضی کیا، تو اس کی گلوخاصی ہوئی۔(۱۱)

سلطان سکندر لودھی (ف ۱۵۱۷ء) تخت پر بیٹھنے سے پہلے کرکشیتر کے علاقے کا حاکم تھا۔ کرکشیتر میں ایک کنڈ تھا جہاں ہندو آکر اشنان کیا کرتے تھے اور یہ اشنان ایک مذہبی میلہ بن گیا تھا۔ سکندر لودھی نے اس میلے کو روک دینے کی کوشش کی۔ اس کے لیے اس نے علماء سے ایک محضر طلب کیا، جس میں ملک العلما میاں عبداللہ جودھنی بھی شریک ہوئے۔ تمام علما نے ان کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ ان ہی کی رائے حرف آخر ہے۔ اس پر سکندر لودھی، مولانا عبداللہ کی طرف مخاطب ہوا۔ تو انہوں نے پوچھا: کرکشیتر کیا چیز ہے؟ جواب ملا کہ ایک حوض ہے جہاں ہندو ہر شہر سے آکر غسل کرتے ہیں۔ مولانا نے پوچھا کب سے یہ رسم جاری ہے؟ جواب ملا، قدیم رسم ہے۔ مولانا عبداللہ نے فتویٰ دیا کہ جس طرح قدیم بتخانے کا تباہ کرنا جائز نہیں، اسی طرح قدیم رسم کو مٹانا بھی جائز نہیں۔ یہ فتویٰ سکندر لودھی کے منشا کے خلاف تھا۔ اس نے خیال کیا کہ مولانا اس کے حکم کی خلاف ورزی کی خاطر ایسا فتویٰ دے رہے ہیں۔ اس لیے خنجر پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا کہ یہ طرفداری کا فتویٰ ہے، میں پہلے تجھ کو ماروں گا پھر کرکشیتر کو تباہ کروں گا۔ مولانا نے بڑی دلیری سے جواب دیا، اللہ تعالیٰ کے حکم

Marfat.com

کے بغیر کوئی نہیں مرتا، میں اپنی موت کے لیے تیار ہوں۔ ہرچہ بادا باد۔ آپ نے مجھ سے دریافت کیا، میں نے شرعی مسئلہ بیان کردیا۔ اگر آپ کو شریعت کی پروا نہیں ہے، تو پھر پوچھنے کی حاجت ہی کیا تھی۔ یہ سن کر سکندر کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا۔ جب مجلس برخاست ہوگئی، تو سکندر نے مولانا سے کہا" میاں عبداللہ! آپ گاہے بگاہے مجھ سے ملاقات کرتے رہیں۔"(۱۲)

شیخ العالم حضرت احمد عبدالحق رودولوی (ف ۱۴۳۳ء) چشتیہ صابریہ سلسلے کے مشہور بزرگ ہوئے ہیں۔ رودولی ضلع بارہ بنکی میں ان کی خانقاہ اب تک موجود ہے، اور ان کے عرس کے موقع پر ہندو مسلمان بکثرت جمع ہوتے ہیں۔ رودولی میں مستقل قیام اختیار کرنے سے پہلے انہوں نے مختلف مقامات میں جا کر بزرگان دین سے فیوض و برکات حاصل کیے۔ ایک بار وہ پنڈوہ (ضلع مالدہ) گئے، جہاں ایک کوتوال کے گھر میں قیام کیا، جس کی ماں ان کی بڑی معتقد ہوگئی تھی۔ ان کے ساتھ ایک دیوانہ بھی رہتا تھا۔ ایک روز شہر کا حاکم بھیس بدل کر شہر میں نکلا۔ ایک جگہ قلندروں کی ایک جماعت اتری ہوئی تھی۔ حاکم ان کے پاس گیا۔ قلندروں نے کھانا پکایا تھا، کھاتے وقت حاکم سے بولے:" دور ہو، تو ہمارے کھانے میں نظر لگا رہا ہے" حاکم فقیروں اور غریبوں کی طرح شکستہ حالی اور غربت کا اظہار کرتا رہا، کہ میں غریب ہوں، تمہارا کیا بگاڑتا ہوں، تم اپنا کھاؤ، مگر ان لوگوں نے ایک نہ سنی اور جب تک حاکم کو ہٹا نہ لیا، اس وقت تک خاموش نہ ہوئے۔ حاکم یہاں سے جوگیوں کی فرودگاہ کی طرف چلا۔ اتفاق سے ان لوگوں کے کھانے کا وقت بھی یہی تھا۔ یہ لوگ کھانا لائے؛ اسے آپس میں تقسیم کیا اور ایک حصہ حاکم کا بھی لگا کر اس کو دیا۔ حاکم نے کہا میں ایک بیگانہ آدمی ہوں، میرے لیے برابر کا حصہ کیوں لگاتے ہو۔ جوگی بولے، بابا ہمارا طریقہ یہی ہے؛ اگر کتا بھی موجود ہو، تو اسے بھی برابر کا حصہ دیں گے۔ تم تو آدمی ہو تمہیں کیسے نہ دیں! اس کے بعد حاکم لوٹ آیا۔ صبح کو فرمان جاری کیا کہ جوگی تو شہر میں رہیں، لیکن کوئی قلندر اور درویش شہر میں نہ رہنے پائے۔ سرکاری خدام قلندروں کو پکڑ پکڑ کر کشتی کے ذریعے پار اتارنے لگے۔ شہر میں ہنگامہ برپا ہوگیا کہ حاکم قلندروں اور درویشوں کو شہر بدر کررہا ہے۔ حضرت شیخ العالم احمد عبدالحق رودولوی نے سنا، تو اپنے ہمراہی دیوانہ سے کہا، چلو ہم بھی بادشاہ کی ڈیوڑھی پر چلیں! دیکھیں وہ قلندروں اور درویشوں کو کیوں شہر بدر کررہا ہے۔ کوتوال اور اس کی ماں نے بہت روکا کہ مخدوم آپ نہ جایئے، درویش ڈھونڈ ڈھونڈ کر پکڑے اور نکالے جارہے ہیں، لیکن آپ نہیں مانے اور دیوانہ کو ساتھ لے کر چل دیے، اور جا کر حاکم کی ڈیوڑھی پر خاک ڈال کر بیٹھ گئے۔ بہت دیر تک انتظار کرتے رہے، لیکن کسی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ تم کون ہو، اور کس

Marfat.com

لیے آئے ہو۔ بالآخر شیخ العالم احمد عبدالحق نے فرمایا: دیوانہ تیرا حاکم درویشوں کو نہیں بلکہ بیجبروں کو شہر بدر کرا رہا ہے، یہ کہہ کر اپنی قیامگاہ کو لوٹ آئے۔ (۱۳)

بہمنی سلطنت کا بانی علاء الدین حسن گانگو بہمنی (ف ۱۳۵۷ء) ہوا ہے۔ اس کی ابتدائی زندگی بہت ہی غربت اور عسرت میں گذری۔ وہ دلی میں غیاث الدین تغلق کے بیٹے شہزادہ محمد تغلق کے ایک منجم گنگو برہمن کا ملازم تھا۔ وہ اپنی تنگدستی سے پریشان رہتا تھا۔ ایک دن اس نے آقا سے اپنی غربت کا ذکر کیا، تو گنگو نے ہمدردی میں نواح دلی میں اسے بنجر زمین کا ایک ٹکڑا دے دیا؛ ایک جوڑی بیل اور دو مزدوروں کا بھی سامان کر دیا، تاکہ وہ اس کھیتی باڑی سے اپنا پیٹ پال سکے۔ ایک دن اس کے مزدور ہل چلا رہے تھے کہ زمین کے اندر سے ایک برتن نکلا، جس میں سلطان علاء الدین خلجی کے عہد کے سونے کے سکے اور اشرفیاں بھری تھیں۔ حسن کی ایمانداری نے یہ گوارا نہ کیا کہ آقا کی دی ہوئی زمین کے مال میں خیانت کرے۔ اس نے یہ ساری دولت جاکر گنگو برہمن کے سامنے رکھ دی۔ گنگو نے حسن کی ایمانداری کا ذکر شہزادہ محمد تغلق سے کیا۔ وہ بہت متعجب ہوا اور اپنے باپ سلطان غیاث الدین تغلق کو خبر دی۔ سلطان غیاث الدین تغلق نے حسن کو اپنے حضور میں طلب کیا اور شاہی نوازشوں سے سرفراز کر کے اپنے امیروں کے زمرے میں شامل کر لیا۔ (۱۴)

ایک دن گنگو نے حسن سے کہا کہ مجھے تمہارے زائچے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم بڑے اقبالمند ہوگے، اور خدا کی مدد اور مہربانی سے کسی بلند رتبے پر پہنچ جاؤ گے۔ اس بات کا عہد کرو کہ اگر خدا تم کو کسی بلند مرتبے پر پہنچائے، تو میرا نام بھی اپنے نام کا جزو بنانا تاکہ تمہارے اقبال کی بدولت میں بھی دنیا میں زندہ رہوں۔ دوسرے یہ کہ اپنے خزانے میں میرے اور میری اولاد کے سوا کسی اور کو نہ رکھنا۔ حسن نے اپنے محسن کی باتیں منظور کر لیں اور کوئی بڑا عہدہ پانے سے پہلے ہی اپنے نام کے ساتھ گنگو لکھنے لگا۔ وہ دکن میں بہمنی سلطنت قائم کرنے کے بعد بڑا کامیاب حکمران اور فاتح ثابت ہوا۔ ایک مرتبہ کسی نے اس سے پوچھا کہ آپ نے اتنی بڑی سلطنت کیسے حاصل کر لی اور تھوڑی مدت میں اپنی حکومت کو اتنی وسعت کیسے دی اور دوسرے حکمرانوں اور رعایا کو اپنا فرمانبردار اور مطیع کیسے بنا لیا؟ اس نے جواب دیا کہ پہلے تو میں نے مروت کو اپنا اصول بنایا اور خواص و عوام سے ہمیشہ مروت سے پیش آیا۔ دوسرے یہ کہ کبھی بخل سے کام نہیں لیا، سخاوت میں دوست اور دشمن کی تفریق نہیں کی۔ ہر ایک کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا۔ ان ہی باتوں کی وجہ سے سب میرے مخلص ہمدرد اور مطیع بنتے گئے۔ (۱۵)

کبیر داس (ف ۱۵۱۸ء) اپنی ابتدائی زندگی میں ایک روز گنگا کے کنارے کچھ

Marfat.com

برہمنوں کے ساتھ تھے۔ برہمن کہنے لگے کہ گنگا کے پانی سے تمام گناہ ڈھل جاتے ہیں۔ وہ یہ تعریف کررہے تھے کہ ایک برہمن نے پینے کو پانی مانگا۔ کبیر داس اٹھے اور اپنے لکڑی کے پیالے میں پانی بھر کر اسے دیا۔ اس نے ان کے ہاتھ کا پانی پینے سے انکار کردیا کیونکہ وہ مسلمان جولاہے تھے؛ اور برہمن ان کے ہاتھ کا چھوا کھاتے پیتے نہیں ہیں۔ برہمن کے انکار پر کبیر داس نے کہا کہ ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ گنگا کا پانی بدن اور روح کی گناہ کی تمام آلائشوں کو دھو کر زائل کردیتا ہے۔ اگر یہ پانی میرے لکڑی کے پیالے کو بھی پاک نہیں کرسکتا تو یہ اس تعریف کا مستحق کیونکر ہوسکتا ہے۔(۱۶)

ایک اور موقع کا ذکر ہے کہ کبیر داس کی لڑکی کمالی ایک دن کنوئیں پر پانی بھر رہی تھی۔ ایک پیاسے برہمن نے اس سے پانی مانگا۔ پانی پینے کے بعد جب اس برہمن کو معلوم ہوا کہ کمالی جولاہے کی لڑکی ہے تو وہ بہت خفا ہوا اور کہنے لگا کہ تو نے مجھے بے دھرم کردیا ہے۔ دونوں کبیر داس کے پاس آئے، انہوں نے برہمن سے کہا سینکڑوں لاشیں پانی میں سڑا کرتی ہیں۔ کروڑوں آدمی زمین میں دفن ہیں۔ اسی کی مٹی سے وہ برتن بنائے جاتے ہیں، جن میں تم پانی پیتے اور کھانا کھاتے ہو۔ کھانا کھاتے وقت کپڑے ضرور اتار ڈالتے ہو، لیکن دھوتی باندھے رہتے ہو، جو جولاہے کی بنی ہوئی ہوتی ہے۔ مکھیاں غلیظ اور مردار پر بیٹھتی ہیں۔ کیا تم ان کو روک سکتے ہو؟(۱۷)

ایک بار کبیر داس کے یہاں کچھ درویش آئے۔ کبیرداس نے بڑی تعظیم و تکریم کے ساتھ انہیں اپنے یہاں مہمان رکھا لیکن ان کی خاطر تواضع کے لیے گھر میں کچھ نہیں تھا اور دوڑدھوپ کرنے کے بعد بھی کہیں سے کچھ نہ ملا۔ آخر بیوی سے کہا کہ تم ہی کسی سے کچھ قرض لے آؤ کہ ان درویشوں کی خاطر کی جائے۔ بیوی نے کہا گھر کی گلی کے پاس ایک بنیا رہتا ہے؛ وہ مجھ پر بُری نظر ڈالا کرتا ہے۔ اگر اس فاجر سے کوئی چیز مانگوں، تو شاید دے دے۔ کبیر داس نے کہا اس کے پاس جلدی چلی جاؤ جو کچھ کہے قبول کرلو، اور ان درویشوں کے لیے کچھ لے آؤ۔ بیوی نے بنیے سے جا کر ادھار چیزیں مانگیں، تو اس نے کہا کہ اگر تم رات میرے گھر آنے کا وعدہ کرو، تو جو چیز مانگو، دے دوں گا۔ بیوی نے قسم کھا کر اس کی بات مان لی۔ بنیے نے چاول اور گھی دے دیا۔ اس طرح کبیر داس نے مہمانوں کو کھانا کھلا کر انہیں آرام پہنچایا۔ جب درویش کھانا کھا چکے تو بہت سخت بارش ہونے لگی۔ کبیر داس کی بیوی نے بنیے سے جو وعدہ کیا تھا وہ میاں کو یاد دلایا۔ دونوں وعدہ خلافی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ادھر راستے میں پانی کی وجہ سے کیچڑ بہت ہوگئی تھی۔ اس لیے بیوی کے لیے راستہ طے کرنا آسان

Marfat.com

نہیں رہا تھا۔ کبیر داس نے بیوی کو کاندھے پر اٹھایا اور اس بنیے کے گھر پہنچا دیا اور خود ایک گوشے میں چھپ گئے۔ بنیے نے کبیرداس کی بیوی کو دیکھا تو تعجب کیا کہ اس کے پاؤں کیچڑ سے لت پت نہیں۔ اس نے پوچھا کہ تم کس طرح آئیں، کہ پاؤں میں کیچڑ نہیں ہے۔ بیوی نے حقیقت بتائی تو یہ سن کر بنیے نے ایک چیخ ماری اور بیہوش ہوگیا۔ جب ہوش میں آیا تو کبیرداس کے پاس آکر ان کے پاؤں میں گر پڑا اور اپنی دوکان لٹا کر بیراگی بن گیا۔(۱۸)

شیرشاہ (ف ۱۵۴۵ء) نے اپنی حکومت کے زمانے میں شاہراہ پر ہر ایک کوس پر ایک سرائے بنوائی تھی۔ سرائے میں ایک مسجد، ایک کنواں اور ایک گھر ہوتا، جس کی دیکھ بھال ایک شقدار کرتا۔ سرائے کے ایک دروازے پر پانی سے بھرے ہوئے مٹکے کے علاوہ پکا ہوا کھانا مسلمانوں کے لیے موجود رہتا، دوسرے پر غلہ اور پانی کے مٹکے ہندوؤں کے لیے ہوتے۔ سرائے کے لیے بھٹیارے مقرر تھے۔ مسافروں سے کھانے پینے کی کوئی قیمت یا خدمت نہیں لی جاتی تھی۔ شیرشاہ کی نظر میں ہندو مسلمان دونوں برابر کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس نے ان میں کبھی کوئی تفریق نہیں کی۔ ایک مرتبہ وہ کشتی پر سوار آگرے سے کالنجر جارہا تھا۔ راستے میں کالپی سے جو گذرے، تو یہاں موضع ہمیر پور کا ایک برہمن دریا میں نہا رہا تھا۔ ملاح کشتی کو تیزی سے آگے بڑھا رہے تھے۔ شیر شاہ نے انہیں اس جگہ کشتی روکنے کو کہا۔ جہاں برہمن نہا رہا تھا؛ اور اس سے اس علاقے کے جاگیردار کی امارت و عدالت کے رنگ ڈھنگ کے بارے میں پوچھا۔ برہمن کو معلوم نہ تھا کہ وہ بادشاہ سے باتیں کررہا ہے۔ اس لیے اس پرگنہ سے متعلق جو باتیں تھیں، انہیں سچ سچ مختصر طریقے پر گوش گذار کرکے اپنے گھر کی راہ لی۔ وہ جا چکا تو شیرشاہ نے اپنے مقربوں سے کہا کہ برہمن کو اس وقت تو معلوم نہ ہوسکا کہ وہ بادشاہ وقت سے ہمکلام ہورہا ہے، لیکن ظن غالب ہے کہ اسے بعد کو یہ بات معلوم ہوجائے گی اس وقت اسے افسوس ہوگا کہ اس کی ہمکلامی سے دوسروں کے مقابلہ میں اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ اس پر شیر شاہ نے برہمن کو واپس بلایا، اور جس گاؤں میں وہ رہتا تھا وہ اسے انعام میں بخش دیا، نیز پانچ سو روپے نقد کا عطیہ دے کر اسے رخصت کیا۔(۱۹)

شیرشاہ عدل و انصاف میں بھی کسی طرح کا کوئی امتیاز اور تفریق نہیں کرتا تھا۔ ایک روز اس کا اپنا لڑکا شہزادہ عادل خان ہاتھی پر سوار آگرے کی ایک گلی سے گذر رہا تھا کہ اس کی نظر ایک بنیے کی بیوی پر پڑی جو اپنے مکان کے صحن میں نہا رہی تھی۔ مکان کی دیوار نیچی تھی۔ شہزادے نے ہاتھی پر سے اس عورت پر پان کا بیڑا پھینکا۔ عورت حیادار تھی۔ فرط ندامت میں اس نے خودکشی کرلینے کا ارادہ ظاہر کیا لیکن اس کے شوہر نے اسے خودکشی سے باز رکھا،

Marfat.com

اور خود وہی پان کا بیڑہ لے کر شیر شاہ کے پاس پہنچا۔ فریاد کی۔ شیر شاہ کو اپنے بیٹے کی حرکت پر سخت غصہ آیا۔ اس نے حکم دیا کہ فریادی کو ہاتھی پر سوار کرکے عادل خان کے مکان کے پاس پہنچایا جائے اور شہزادہ کی بیوی مکان کے اندر کھڑی ہو اور فریادی بھی پان کا بیڑہ ہاتھی پر سے اس کی بیوی پر پھینکتا ہوا آگے بڑھے۔ یہ حکم سن کر درباری امرا نے شہزادے کی حمایت کرنا چاہی، لیکن شیر شاہ نے کہا کہ میری عدالت میں میری محبوب ترین اولاد اور رعایا دونوں برابر ہیں۔ فریادی اس فیصلے سے متاثر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ میرا انصاف ہوگیا۔ شہزادے نے میرا قصور کیا ہے۔ مجھے قصور معاف کرنے کا بھی حق ہے، اس لیے میں نے شہزادے کو معاف کیا۔ یہ سن کر شیر شاہ کا جلال کم ہوا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ عدل ہر دین میں بہتر ہے عدل کے برابر کوئی طاعت اور عبادت نہیں۔ اگر بادشاہ کے عدل کا سایہ لوگوں کے سر پر سے اٹھ جائے، تو آبادی کا شیرازہ بکھر جائے۔(۲۰)

ہمایوں (ف ۱۵۵۶ء) شیر شاہ سے شکست کھا کر ایران پہنچا، تو وہ شاہ طہماسپ کا مہمان ہوا۔ ایک دن دونوں شکار کو گئے۔ کسی مقام پر تھک کر دونوں اتر پڑے۔ شاہ طہماسپ کے شاہی فراش نے ایک غالیچہ ڈال دیا۔ طہماسپ اس پر بیٹھا تو ہمایوں کے لیے بیٹھنے کی کافی جگہ نہ رہی۔ اس لیے جب وہ اس پر بیٹھا تو اس کے ایک زانو کے نیچے فرش نہ تھا۔ شاہی فراش طہماسپ کے حکم سے دوسرا غالیچہ بچھانا چاہتا تھا کہ ہمایوں کے ایک جان نثار ہمراہی نے فوراً ہی اپنے ترکش کا کارچوبی غلاف چھری سے کاٹا، اور اپنے آقا کے نیچے بچھا دیا۔ شاہ طہماسپ کو یہ ہوا خواہی بہت پسند آئی اور ہمایوں سے کہا برادر! جب آپ کے ساتھ ایسے جان نثار اور نمک حلال تھے، تو پھر آپ کا تخت و تاج آپ کے ہاتھ سے کیسے نکل گیا؟ ہمایوں نے جواب دیا کہ میرے بھائیوں کی عداوت نے سارا کام خراب کیا۔ نمکخوار ملازم ایک آقا کے بیٹے سمجھ کر کبھی ادھر ہوجاتے تھے کبھی ادھر۔ طہماسپ نے پوچھا ملک کے لوگوں نے رفاقت نہیں کی؟ ہمایوں نے کہا کہ کل رعایا غیر مذہب کے لوگ ہیں۔ ان سے رفاقت ممکن نہ ہوسکی۔ طہماسپ نے کہا کہ ہندوستان میں دو فرقے کے لوگ بہت ہیں، ایک افغان، دوسرے راجپوت، خدا کی مدد سے آپ ہندوستان کو فتح کریں، تو افغانوں کو تو تجارت میں لگا دیں اور راجپوتوں کو دلاسا اور محبت کے ساتھ شریک حال کریں۔(۲۱) ہمایوں کو تو راجپوتوں سے میل جول بڑھانے کا موقع نہیں ملا، لیکن اکبر نے اس پر عمل کرکے غیر معمولی تدبر اور ہوشمندی کا ثبوت دیا۔

اکبر (ف ۱۶۰۵ء) نے اپنی بادشاہت کے زمانے میں راجپوتوں کے دلوں کو تسخیر

Marfat.com

کرنے کے لیے تمام ممکن ذرائع اختیار کیے۔ ان سے شادی بیاہ کرکے رشتے بھی قائم کیے۔ اس نے خود امبر کے کچھواہہ خاندان کے راجہ بہارا مل کی لڑکی اور راجہ بھگوان داس کی بہن سے شادی کی۔ اسی کے بطن سے شہزادہ سلیم پیدا ہوا، جو آگے چل کر نورالدین جہانگیر کے لقب سے اس کا جانشین ہوا۔ اکبر نے شہزادہ سلیم کی شادی راجہ بھگوانداس کی بیٹی مان بائی سے کی۔ راجہ بھگوانداس جب اپنی بیٹی کو رخصت کرنے لگا، تو اس نے اکبر سے کہا:

مہاری رے بیٹی، تمہارے محلوں کی چیری ہم باندگلام رے

لیکن اکبر نے فوراً جواب دیا:

تمہاری بیٹی، مہارے محلوں کی رانی، تم صاحب سردار رے (۲۲)

مولانا شبلی نے اس شادی کی تقریب کو منظوم کیا ہے، جس کے آخری تین شعر ہیں:

دلہن کے گھر سے منزلگاہ تک اس شان سے لائے　　کہ کوسوں تک زمیں پر فرش دیبائے مشجّر تھا
دلہن کی پالکی خود اپنے کندھوں پر جو لائے تھے　　وہ شاہنشاہِ اکبر اور جہانگیر ابن اکبر تھا
یہی ہیں وہ شمیم انگیزیاں عطر محبت کی　　کہ جن سے بوستان ہند برسوں تک معطر تھا

راجہ بھگوانداس ترقی کرکے اکبر کا پنج ہزاری، پنج ہزار منصب دار بن گیا تھا۔ وہ آخر وقت تک اکبر کے دامِ اخلاص و محبت کا اسیر رہا۔ وہ اکبر کے ساتھ میواڑ کے رانا پرتاب کے خلاف بھی برسرپیکار رہا۔ بڑی بڑی مہموں میں وہ اکبر کی معیت میں ضرور رہتا۔ ۹۷۹ھ/ ۱۵۷۱ء میں اکبر گجرات کی مہم پر گیا، تو وہ اور اس کا بیٹا مان سنگھ بھی شاہی جلو میں تھے۔ لڑائی کے موقع پر اکبر اپنے خاص گھوڑے "نور بیضا" پر سوار ہوکر میدان جنگ جانے لگا، تو گھوڑا یکایک بیٹھ گیا۔ سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے کہ شگون اچھا نہیں ہوا! لیکن راجہ بھگوان داس نے فراست سے کام لیا اور آگے بڑھ کر اکبر سے مخاطب ہوکر کہا: "فتح مبارک ہو۔" اکبر نے جواب دیا "ایسا ہی ہو۔ لیکن تم کیسے سمجھے؟ راجہ نے جواب دیا کہ ہمارے شاستر میں لکھا ہے، کہ جب فوج مقابلہ کو تیار ہو اور سیناپتی کا گھوڑا سواری کے وقت بیٹھ جائے تو فتح اسی کی ہوگی۔ یہ سن کر تمام لشکریوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ جب جنگ شروع ہوئی تو اکبر راجہ بھگوان داس کے ساتھ ایک ٹیلے پر کھڑا جنگ کا معائنہ کررہا تھا۔ اس نے راجہ سے مخاطب ہوکر کہا۔ ہراول پر دباؤ زیادہ ہے، طور بے طور ہوا چاہتا ہے، اپنی فوج تھوڑی اور غنیم کا ہجوم زیادہ ہے۔ چلو ہم تم مل کر جا پڑیں۔ یہ کہہ کر دونوں نے باگیں اٹھا دیں اور ان کا یہ بروقت دھاوا کامیاب رہا۔

اسی جنگ میں اکبر ایک جگہ کھڑا تیر چلا رہا تھا۔ راجہ بھگوان داس اور مان سنگھ اس

Marfat.com

کے قریب تھے۔ یکا یک دشمن کے تین لشکری آگے بڑھے۔ ایک راجہ بھگوانداس کی طرف لپکا، دو اکبر پر حملہ آور ہوئے۔ راجہ بھگوان داس نے اپنے دشمن کو مار بھگایا۔ مان سنگھ اکبر کی مدد کے لیے لپکا ہی چاہتا تھا کہ اکبر نے اسے للکار کر کہا کہ اپنی جگہ سے آگے نہ بڑھے اور اپنا گھوڑا اڑا کر دونوں دشمنوں کو نرغے میں لینا چاہا۔ راجہ بھگوان داس نے چلا کر مان سنگھ سے کہا، کھڑے کیا دیکھ رہے ہو، آگے بڑھو، مان سنگھ نے کہا مہابلی خفا ہوتے ہیں۔ راجہ بھگوان داس نے جھلا کر کہا۔ یہ وقت خفگی دیکھنے کا نہیں ہے۔ اس اثنا میں اکبر نے دونوں دشمنوں کو مار بھگایا۔(۲۳)

اسی لڑائی میں ایک موقع پر اکبر فوج کی صفیں درست کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ راجہ بہارامل کا بھتیجا راجہ جے مل کچھواہہ ایک وزنی بکتر پہنے ہوئے ہے۔ اکبر نے اس کا وہ بکتر اتروا لیا اور اپنی خاصے کی زرہ اسے پہنا دی۔ راجہ جے مل اس خصوصی رعایت سے بہت خوش ہوا۔ تھوڑی دیر بعد اکبر نے جودھ پور کے راجہ مالدیو کے پوتے راجہ کرن کو دیکھا کہ اس کے پاس نہ زرہ ہے نہ بکتر، اس نے راجہ جے مل کا بکتر اس کو پہنا دیا۔ راجہ جے مل کا باپ روپ سنگھ بھی لڑائی میں شریک تھا۔ اس کو یہ ناگوار گزرا، کیونکہ راجہ کرن کے خاندان سے اس کی پشتینی عداوت چلی آرہی تھی۔ اس نے اکبر کو کہلا بھیجا کہ وہ بکتر میرے بزرگوں کی یادگار ہے اور بڑا مبارک ہے اس لیے یہ مجھے واپس کر دیا جائے۔ اکبر معاملہ کی تہہ کو پہنچ گیا۔ روپ سنگھ کو کہلا بھیجا کہ میری خاصے کی زرہ اور بھی مبارک ہے لیکن راجہ روپ سنگھ کا غصہ فرو نہ ہوا۔ اس نے اشتعال میں اسلحۂ جنگ اتار کر پھینک دیے اور کہا کہ میں میدان جنگ میں یونہی جاؤں گا۔ اکبر کو معلوم ہوا تو اس نے بھی یہ کہہ کر زرہ اتارنے کا ارادہ کر لیا کہ جب میرے لشکری برہنہ ہو کر لڑیں گے تو میں کیونکر زرہ بکتر میں چھپ کر میدان جنگ میں جا سکتا ہوں۔ راجہ بھگوان داس کو اس کی خبر ملی، تو فوراً گھوڑا بڑھا کر جے مل اور روپ سنگھ کے پاس پہنچا۔ دونوں کو سمجھا بجھا کر اور ہتھیار لگوا کر اکبر کے پاس لایا اور معاملہ رفع دفع کرنے کے لیے عرض کیا کہ روپ سنگھ نے آج بھنگ زیادہ پی تھی، اسی کی ترنگ میں تھا۔(۲۴)

راجہ مان سنگھ سے بھی اکبر کو بہت محبت رہی۔ اس کو غایت محبت میں راجہ مرزا کہا کرتا تھا۔ راجہ مان سنگھ بھی اکبر کا عاشق تھا۔ وہ میدان جنگ میں اکبر کے گھوڑے کی باگ سے باگ ملائے رکھتا۔ اکبر کی خاطر وہ رانا پرتاپ کے خلاف بڑی بہادری سے لڑا، جس کے بعد مُلا عبدالقادر کو بھی یہ کہنا پڑا۔ کہ ملا شیری کے اس مصرع کی تصدیق ہوگئی:

کہ ہندوے می زند شمشیر اسلام

Marfat.com

راجہ مان سنگھ اکبر کی محبت میں سرفروشی اور جانبازی کا جوہر ضرور دکھلاتا رہا لیکن مذہب کے معاملے میں اس نے اکبر کے سامنے جھکنا پسند نہیں کیا۔ ایک سال محرم کے مہینے میں عاشورہ کی رات تھی، اکبر اپنے خلوتخانہ میں عبدالرحیم خانخانان اور راجہ مان سنگھ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس زمانے میں وہ دین الٰہی کا علمبردار بن چکا تھا۔ مان سنگھ نے اس مذہب کو قبول کرنا پسند نہیں کیا تھا۔ اس رات تنہائی میں موقع پاکر اکبر نے راجہ مان سنگھ کو دین الٰہی کی ترغیب دلائی۔ وہ اخلاص و وفا کا پیکر بہت ہی بے تکلفانہ بول اٹھا کہ اگر اس مریدی سے مراد جان نثاری ہے، تو میں تو ہر موقع پر اپنی جان ہتھیلی پر لیے حاضر رہا ہوں، امتحان لینے کی ضرورت نہیں۔اس کے علاوہ اور منشا ہے تو اس کا تعلق مذہب سے ہے۔ میں ہندو ہوں، اگر آپ کہیں تو مسلمان ہوجاؤں، ان دونوں راستوں کے علاوہ کسی اور راستے پر چلنا نہیں جانتا ہوں۔ یہ سن کر اکبر خاموش ہوگیا۔(۲۵)

راجہ مان سنگھ کا معمول تھا کہ جب وہ کسی فوجی مہم کا سردار بن کر جاتا تو اپنے مسلمان لشکریوں کے لیے لشکر میں غسل کرنے کے لیے حمام اور نماز باجماعت ادا کرنے کے لیے کپڑے گھیر کر مسجد کا پورا انتظام کرتا؛ ایک وقت کا کھانا بھی انہیں اپنی طرف سے کھلاتا۔ ایک بار وہ دکن کی مہم پر گیا، تو پندرہ پنج ہزاری اور سترہ سو دوسرے منصب دار اس کے ساتھ تھے، انھی میں خان جہاں لودھی، خانخانان عبدالرحیم خان اور امیرالامرا شریف خان بھی تھے۔ یہ لشکر بالا گھاٹ میں مقیم تھا کہ سخت قحط پڑ گیا۔ راستے کی خرابی کے باعث کہیں سے رسد نہ پہنچ سکی۔ فوجی سرداروں کی سمجھ میں اس قحط کو دور کرنے کی کوئی تدبیر نہ آئی۔ ایک روز راجہ مان سنگھ نے ان سے کہا کہ اگر میں مسلمان ہوتا تو ایک وقت کا کھانا آپ لوگوں کے ساتھ کھایا کرتا، لیکن اب جب کہ ڈاڑھی سفید ہوگئی اپنی وضعداری ترک کرتے نہیں بنتی۔ البتہ ایک پان ہے۔ آپ لوگوں کے پیش کروں تو آپ لوگ قبول کریں گے؟ خانجہان لودھی کے ساتھ اور منصب دار بھی بولے کہ ہم ضرور قبول کریں گے۔ اس کے بعد راجہ مان سنگھ نے اسی رات ہر پنج ہزاری کو ایک سو روپے کی تھیلی پیش کی۔ اسی حساب سے یک صدی تک کے منصبداروں کو بھی تھیلیاں بھیجیں اور ہر تھیلی پر سب کے نام علیحدہ علیحدہ لکھ دیے۔ یہ سلسلہ تین چار مہینے تک بلا ناغہ قائم رہا۔ جب لشکر میں غلہ پہنچا تو راجہ مان سنگھ کے حکم سے اس کے وطن ہی کے نرخ سے فروخت ہونے لگا۔(۲۶)

راجہ بیربل بھی اکبر کو بہت محبوب تھا۔ دونوں کے لطیفے زبان زد خاص و عام ہیں۔ دونوں ایک جان و قالب تھے۔اسی لیے اکبر نے فتح پور سیکری میں اس کا مکان اپنے محل کی

Marfat.com

بغل ہی میں تعمیر کروایا جس کی باریک بیلیں اور نقش و نگار آج بھی سیاحوں کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ اکبر کو بیربل کی ہندی شاعری بھی بہت پسند تھی۔ اسی لیے اسے کب رائے کا خطاب دیا۔ پھر منصب دو ہزاری بھی عطا کیا۔ انہیں خوبیوں کے باعث راجہ صاحب السیف والقلم کے خطاب سے یاد کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اکبر اسے حرم سرا کے اندر بھی بلالیا کرتا تھا۔ ۱۵۸۴ء میں راجہ یوسف زئی کے خلاف ایک مہم میں بھیجا گیا، جہاں ہلاک ہوا اس کی لاش کا پتہ نہ چلا۔ اکبر کو اس کی خبر ملی، تو دو رات دن تک کھانا نہ کھایا اور اپنے غمناک جذبات کا اظہار اس شعر میں کیا:

دین دیکھی سب دین ایک نہ دینو دوسہ دکھ
سو ہم کہوں ادب دیں کچھو نہیں راکھیو بیربل (۲۷)

اکبر نے راجپوتوں کے لیے فراخ حوصلگی اور رواداری کی جو روایت قائم کی اسے اس کے ساتھی، جانشینوں نے بھی برابر قائم رکھنے کی کوشش کی۔ جہانگیر (ف ۱۶۲۷ء) کی رگوں میں تو راجپوتی خون ہی آچکا تھا اس لیے وہ راجپوتوں کی خاطر داری میں اکبر سے بھی کچھ بڑھا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ وہ شکار کھیل رہا تھا۔ ایک شیر اس کے سامنے آگیا۔ راجہ انوپ سنگھ بڑگوجر نے اسے بچانے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی کہ وہ شیر سے دست بدست گتھ گیا لیکن شیر غالب آیا اور اس نے اسے زمین پر دے مارا۔ اب شیر اوپر تھا اور انوپ رائے نیچے۔ انوپ رائے اپنے دونوں ہاتھوں کو شیر کی گردن اور پیٹھ میں حمائل کیے ہوئے تھا۔ پھر وہ یکایک کروٹ لے کر اور زانو پر زور دے کر کھڑا ہوگیا۔ گو اس کا سینہ زخمی ہوگیا تھا لیکن اس نے شیر کے سر اور چہرے پر کاری زخم لگائے، جس سے شیر کی دونوں آنکھیں کٹ گئیں اور اس کے بھوؤں کی کھال آنکھوں پر لٹکنے لگی۔ انوپ رائے اور شیر کی اس کشتی میں شہزادہ خرم نے بھی اپنی تلوار کے جوہر دکھلائے۔ اس نے شیر پر ایسی ضرب لگائی کہ شیر زخمی ہوکر زمین پر گر پڑا۔ جس کے بعد وہ ہلاک کردیا گیا۔ جہانگیر نے خوش ہوکر انوپ رائے کو انی سنگھ کا خطاب دیا، انی کے معنی ہیں شیر کا مارنے والا۔ (۲۸)

اس کے بعد انوپ رائے بڑا مقرب بارگاہ ہوگیا۔ ایک موقع پر جہانگیر نے اپنے دربار میں اس کی کسی بات پر اعتراض کیا۔ جس کے بعد اس کو خیال ہوا کہ شاید بادشاہ اس کی وفاداری پر شک کرتا ہے۔ اس نے فوراً جمدھر کمر سے کھول کر اپنے پیٹ پر دے مارا۔ اس دن سے جہانگیر کے دل میں اس کا اعتبار اور بڑھ گیا۔ بڑی ذمہ داری کی خدمتیں اسی کے سپرد کرتا، یہاں تک کہ شہزادہ خسرو قید کے زمانے میں اس کی نگرانی میں رہا۔ (۲۹)

Marfat.com

جہانگیر کو اپنے راجپوت سرداروں پر اتنا اعتماد تھا کہ اسے یقین تھا کہ وہ اس کی خاطر سے کبھی میدان جنگ سے منہ نہیں موڑ سکتے۔ راجہ رام داس کچھواہہ کو جہانگیر نے راجہ کرن کا خطاب دیا تھا۔ وہ ملک عنبر کے خلاف دکن بھیجا گیا، تو اس کو شکست ہوئی اور اس نے میدان جنگ چھوڑ دیا۔ جہانگیر کو شکست سے بھی زیادہ اس بات کا دکھ تھا کہ ایک راجپوت سردار نے میدان جنگ چھوڑ دیا۔ جب وہ جہانگیر کے حضور میں آیا، تو جہانگیر نے اس سے کہا کہ لڑائی سے بھاگنا راجپوتوں میں سخت عیب ہے افسوس ہے کہ تجھے راجہ کرن کے خطاب کی بھی شرم نہ آئی۔ (۴۰)

جہانگیر کے لشکر میں بھی اکبر کی فوج کی طرح مسلمان اور راجپوت لشکری ملے جلے رہتے۔ سارے لشکریوں میں راجپوتوں کی دوستی اور یگانگت کا جذبہ پیدا ہوگیا تھا اور جب کبھی ان کی دل شکنی ہوتی تو تمام ارباب حل و عقد ان کی تالیفِ قلوب میں پوری ہوشمندی اور دوراندیشی سے کام لیتے۔ جہانگیر کے ۱۸ ویں سال جلوس میں شاہی فوج مہابت خان کی کمان میں دکن میں مقیم تھی۔ اس میں سادات بارہہ کے بھی لشکری تھے جو فوج کی ریڑھ کی ہڈی سمجھے جاتے تھے۔ ان ہی میں سے سید کبیر کے ایک بھائی نے اپنی تلوار ایک صیقل گر کو صیقل کرنے کو دی۔ صیقل گر کی دکان لشکر کے ایک دوسرے فوجی سردار راجہ گردھر کچھواہہ کی قیامگاہ کے پاس تھی۔ صیقل کی اجرت پر صیقل گر اور سید کبیر کے بھائی میں کچھ جھگڑا ہوگیا اور سید کے ملازموں نے غصے میں اسے دو تین ڈنڈے مار دیے۔ اس پر راجہ گردھر کے راجپوت سپاہیوں نے صیقل گر کی حمایت کی اور سید کے نوکروں کو زدوکوب کیا۔ بات یہاں تک بڑھ گئی کہ فریقین میں تلواریں چلنے لگیں۔ سید کبیر کو معلوم ہوا تو کچھ سواروں کو لے کر پہنچ گیا اور راجہ گردھر کی قیامگاہ کو گھیر لیا اور غصہ میں اندر گھس کر تلوار چلانے لگا۔ راجہ گردھر نے بھی تلوار سونت لی، لیکن کچھ اور راجپوتوں کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا۔ سید کبیر کی طرف سے بھی کچھ آدمی مارے گئے۔ واقعے کی خبر پھیلی تو لشکر کے تمام راجپوت ایک طرف جمع ہوگئے، دوسری طرف سادات بارہہ اکٹھا تھے۔ قریب تھا کہ دونوں فریقوں میں بڑے پیمانے پر کشت و خون شروع ہوجائے کہ مہابت خان کو اطلاع ہوئی وہ فوراً موقع واردات پر پہنچ گیا اور اپنی حکمتِ عملی سے دونوں کے اشتعال کو فرد کیا۔ پھر اس نے راجہ گردھر کے قیامگاہ پر جاکر اس کے لڑکوں سے تعزیت کی۔ سید کبیر گرفتار ہوئے اور محض راجہ گردھر کے لڑکوں اور راجپوتوں کی تسلی کی خاطر قصاص میں قتل کردیے گئے۔ سادات بارہہ کے بہادرانہ کارناموں سے مغلوں کی تاریخ معمور ہے لیکن راجپوتوں کی خاطر سادات بارہہ کی خفگی کا مطلق خیال نہیں کیا گیا، اور ان کے اہم اور بہادر

Marfat.com

فرد کو راجپوتوں کی دلجوئی کے لیے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔(۳۱)

جہانگیر کی مدح میں اس زمانے کے مشہور سنسکرت شاعر جگناتھ پنڈت راج نے کہا ہے:(۳۲)

آپ کا مقدس دھاگا سیاہ کیوں ہوگیا؟ یہ سیاہ سوت سے مل گیا۔ کہاں ملا؟ نربدا کے پانی میں۔ پانی میں کاجل کیسے ملا؟ جو لوگ غصے سے بھرے ہوئے بادشاہ نورالدین (جہانگیر) کے دشمن ہیں۔ ان کی لڑکیوں کی خوبصورت آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہا تھا؛ وہی پانی میں مل گیا۔

شاہجہان نے اپنی شہزادگی کے دور میں جب جہانگیر کے خلاف بغاوت کی، تو اس کا حلیف راجہ گوپال داس گوڑ تھا۔ جہانگیر کی فوج نے شہزادے کا تعاقب کیا تو راجہ گوپال داس اور اس کا بیٹا بلرام شہزادے کے ساتھ سائے کی طرح رہے۔ راجہ گوپال داس آگے چل کر شاہجہانی عہد میں ٹھٹھہ کے محاصرہ میں اپنی بہادری اور شجاعت کا جوہر دکھا کر اپنے بیٹے بلرام کے ساتھ حق نمک ادا کرتے ہوئے فدا ہوگیا۔(۳۳)

شاہجہان کو ان راجپوت سرداروں پر اتنا بھروسہ تھا کہ اس کی جان کے محافظ دستہ کا سردار راجہ مہیش داس راٹھور رہا، جو اس کے تخت کے پیچھے برابر کھڑا رہتا؛ سفر میں بھی برابر اس کے ساتھ ہوتا۔(۳۴)

اس زمانے کا ایک سنسکرت شاعر جگناتھ پنڈت راج شاہجہان کی شان میں کہتا ہے:

اے بادشاہ، شہاب الدین (شاہجہان) یہ حقیقت ہے کہ کوئی شخص دنیا میں موجودہ زمانے میں، نہ گزشتہ میں آپ کی لیاقت کے برابر ہوا۔ اس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ اگر خالق دنیا پھر سے نئی چیزوں کو پیدا کرے تو بھی کوئی کسی لحاظ سے آپ کی برابری نہیں کر سکے گا۔

شاہجہان کا ایک درباری شاعر ہری نرائن مصرا اس کی مدح میں کہتا ہے:

ایک بڑے اور بھاری بادل نے ایک بلند پہاڑ کی اونچی چوٹی پر برسنا شروع کیا، تو اے بادشاہ! سرسوتی کا دریا تحمند، پرشور اور پاک و صاف ہوگیا۔ اے شاہجہان! میں آپ سے کہتا ہوں کہ اس دریا کی پاکی کی وجہ سے اس میں جو شخص نہاتا ہے، اس کا سر کنول کی طرح چمکیلا اور روشن ہوجاتا ہے؛ اس کے بال شہد کی مکھی کی طرح ہوجاتے ہیں۔

بادل سے مراد شاعر ہے اور بلند پہاڑ کی اونچی چوٹی خود بادشاہ کی ذات ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو کوئی بادشاہ کی تعریف میں شاعر کی شاعری سنتا ہے، اس کا چہرہ کنول کی طرح شگفتہ ہوجاتا ہے۔(۳۵)

تخت و تاج کے لیے شاہجہان کے بیٹوں میں جنگ شروع ہوئی تو تمام اہم اور ممتاز

Marfat.com

راجپوت فوجی سردار داراشکوہ کی حمایت میں امنڈ پڑے۔ پہلے تو وہ راجہ جسونت سنگھ کی رہنمائی میں اورنگ زیب اور مراد کے خلاف دھرمادت میں لڑے، پھر داراشکوہ کی قیادت میں سموگڈھ میں صف آرا ہوئے۔ اس لڑائی میں راجپوتوں نے اورنگ زیب کو ہلاک کرنے میں جس طیش و تہور، غیظ و غضب کا اظہار کیا، اس سے داراشکوہ کی حمایت میں ان کے جذبۂ سرفروشی و جانبازی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس موقع پر راجہ روپ سنگھ تو جوش غضب میں گھوڑے کی پیٹھ پر سے اتر پڑا، اور صفوں کو چیرتا ہوا اورنگ زیب کے ہاتھی کے پاس جا پہنچا۔ اس نے ہودج کی ڈوری کاٹ کر اورنگ زیب کو زمین پر گرانا چاہا۔ جوہر شناس اورنگ زیب اس کی اس جرأت اور جلادت سے بہت متاثر ہوا اور چلایا کہ یہ بہادر ہلاک نہ ہونے پائے، بلکہ زندہ گرفتار کرلیا جائے لیکن اس کی قضا آچکی تھی۔ اس لیے اورنگزیب کے ایک ہمرکاب نے اس کو لقمۂ اجل بنادیا۔ اورنگ زیب کو ایسے پرجوش اور جری راجپوت سردار کے مارے جانے پر افسوس ہوا۔ جنگ کے بعد اس کا لڑکا راجہ مان سنگھ اورنگ زیب کے دربار میں حاضر ہوا تو اسے بیشمار شاہی عنایتوں سے نوازا اور ہزار و پانصدی وہفت صد سوار کا منصب عطا کیا۔(۳۶) عالمگیر کے چوتھے سال جلوس راجہ روپ سنگھ کی ایک لڑکی عالمگیر کے بیٹے شہزادہ محمد معظم سے بیاہی گئی اور یہ شادی نہایت تزک و احتشام سے انجام پائی۔(۳۷)

اورنگزیب کے ایک منصب دار امین خان نے یہ عرضی دی کہ دو پارسی ملازموں کو جو تنخواہ تقسیم کرنے پر مقرر تھے، اس علت میں برخاست کردیا جائے کہ وہ آتش پرست ہیں اور ان کی جگہ کوئی تجربہ کار مسلمان مقرر کیا جائے، کیونکہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست مت جانو۔ اورنگزیب نے اس کے جواب میں لکھا کہ مذہب کو دنیا کے کاروبار میں دخل نہیں ہے، نہ ان معاملات میں تعصب کو جگہ مل سکتی ہے؛ اور اس قول کی تائید میں ایک آیت نقل کی جس کے یہ معنی ہیں کہ تمہیں تمہارا دین اور ہمیں ہمارا دین منظور ہے۔ اورنگ زیب نے یہ بھی لکھا کہ جو آیت عرضی نویس نے نقل کی ہے، اگر یہی سلطنت کا دستور العمل ہوتا تو ہمیں چاہیے تھا کہ اس ملک کے سب راجاؤں اور ان کی رعیت کو غارت کردیتے، مگر یہ کس طرح ہوسکتا تھا؟ شاہی نوکریاں لوگوں کو ان کی لیاقت اور قابلیت کے موافق ملیں گی اور کسی لحاظ سے نہیں مل سکتی ہیں۔(۳۸)

کوئی منصب دار یا عہدیدار اپنی لیاقت اور قابلیت کا ثبوت دیتا تو اورنگ زیب اس کی حوصلہ افزائی کرتا اور اسے شاہی نوازشوں سے فیضیاب کرنے میں تامل نہ کرتا۔ چنانچہ اپنے ایک خط میں شہزادہ بیدار بخت کو لکھتا ہے:

Marfat.com

مجھے خوشی ہے کہ باغی پہاڑ سنگھ کو ملوک چند نے زیر کیا۔ تم تعریف کے مستحق ہو کہ تمہارے عہدیدار بادشاہ وقت کی خدمت بجا لانے میں مستعد رہتے ہیں... ملوک چند نے اپنی بہادری اور فوجی قابلیت کا ثبوت دیا ہے، اس لیے میں نے اس کو خلعت منصب اور راے رایان کا خطاب عطا کیا۔ مناسب ہے کہ تم بھی اس کے منصب میں اضافہ کرو، خلعت دو اور مالوہ کی نظامت میں اس کو مستقل کر دو، تاکہ اس کا حق نظرانداز نہ ہونے پائے اور شاہی ملازمت والوں کی ہمت افزائی ہو۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد سابق صدر جمہوریہ اپنی کتاب انڈیا ڈیوائڈڈ میں رقم طراز ہیں کہ عالمگیر کے عہد کا مورخ منشی سجان راے بھنڈاری خلاصۃ التواریخ میں لکھتا ہے کہ دیپالی وال میں جو کلانور کے پاس واقع ہے، شاہ شمس الدین دریائی کا مزار ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ ایک ہندو کی عقیدت اتنی زیادہ تھی، کہ ان کی وفات کے بعد اسی ہندو کو مسلمانوں اور ہندوؤں نے مل کر ان کے مزار کا متولی بنایا۔ چند سال کے بعد کچھ مسلمانوں نے شورش کر کے مذہبی بہانے سے ہندو کو تولیت سے محروم کر دینا چاہا، لیکن عالمگیری حکومت نے اس شورش کو کامیاب نہیں ہونے دیا، اور جب کہ یہ کتاب (یعنی خلاصۃ التواریخ) لکھی جا رہی ہے، عالمگیر کی حکومت کا تیسرا سال ہے، لیکن اس مزار کی تولیت بدستور ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔(۴۰)

ڈاکٹر راجندر پرشاد نے یہ بھی لکھا ہے کہ بودھ گیا کے مہنت کی زمینداری کی آمدنی لاکھوں روپے ہے۔ یہ زمینداری دلی کے مغل بادشاہ محمد شاہ (ف ۱۷۴۸ء) کا عطیہ ہے۔ اس نے ایک شاہی فرمان کے ذریعے سے مہنت لال گیر کو مستی پور تاراڈیہہ کا پورا علاقہ عطا کیا۔(۴۱)

مغل بادشاہوں کے دست راست بن کر راجپوتوں نے جس طرح ان کا ساتھ دیا ہے وہ جذباتی ہم آہنگی کا بڑا اہم باب ہے۔ جدوناتھ سرکار نے لکھا ہے کہ مغلوں کے زمانے میں راجپوتوں کی سپہ گری کے جوہر خوب نمایاں ہوئے۔ انبر کا کچھواہہ راجپوت خاندان مغلوں کی بدولت بام عروج پر پہنچ گیا۔(۴۲)

امرناتھ ودیا النکا نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ راجستھان کے مشہور جیمس ٹاڈ کو ہلکر دربار کے ریذیڈنٹ نے اس امر کی ہدایت کی تھی کہ وہ مسلم حکمرانوں کے خلاف لڑائیوں میں راجپوت جیالوں کی مدح میں اپنی مشہور کتاب لکھے۔ یہ ہدایت ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد راجپوتوں کو مسلمانوں سے دور کرنے کی غرض سے جاری کی گئی تھی۔

لیکن ٹاڈ نے جس طرح باہمی نفرت پھیلانے کے لیے کتاب لکھی اسی انداز میں باہمی یگانگت

Marfat.com

اور موانست پیدا کرنے کے لیے مغلوں کے عہد میں راجپوتوں نے جو کارنامے انجام دیے، ان کی تاریخ اگر سلیقے سے مرتب کی جائے، تو ہندوستان کی تاریخ میں جذباتی ہم آہنگی کا ایک روشن باب کھل جائے۔

عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ اورنگزیب کی حکومت کے بعد راجپوت شاہی تخت و تاج سے آزردہ خاطر اور بیگانہ ہوگئے تھے۔ لیکن عالمگیر کے بعد جو جنگ جانشینی ہوئی، تو جاجو کی جنگ میں شہزادہ اعظم شاہ کی طرف سے راؤدلپت راؤبندیلہ، رام سنگھ ہاڈا اور چھتر سال پسر رتن راٹھور اور شاہ عالم یعنی بہادر شاہ اول کی طرف سے راجہ رام سنگھ کے پوتے راجا جے سنگھ، راجہ انوپ سنگھ اور دوسرے جلادت پیشہ راجپوت سردار جنگ میں شریک تھے اور جان کی بازی لگا کر لڑے۔ (۴۳)

فرخ سیر (ف ۱۷۱۹ء) کے عہد میں جے پور کے راجہ اجیت سنگھ راٹھور کے خلاف فوج بھیجی گئی تو شاہی فوج کے ساتھ راجہ اودیت سنگھ بندیلہ، راجہ گوپال سنگھ بھدرویہ اور روپ نگر کے راجہ راج بہادر وغیرہ بھی تھے۔ (۴۴)

محمد شاہ (ف ۱۷۴۸ء) کے عہد میں ۱۷۱۹ء میں جو فوجی مہم بوندی کے راجہ بودھ سنگھ ہاڈا کے خلاف بھیجی گئی تھی، اس کی قیادت راجہ کے ایک رشتہ دار راؤ بھیم سنگھ نے کی۔ مسلمان فوجی سرداروں میں سید دلاور خان بخشی اور دوست محمد خان افغان اس کی ماتحتی میں رکھے گئے۔ نروالی کے راجہ گنج سنگھ بھی ساتھ گئے۔ بوندی کے راجہ کو شکست ہوئی تو بھیم سنگھ کو اس کی خدمات کے صلہ میں مہاراجہ کا خطاب اور ہزاری منصب عطا کیا گیا۔ (۴۵)

محمد شاہ نے حسن پور میں اپنے وزیر سید عبداللہ سے جنگ کی تو اس کے لشکر کے ساتھ راجہ ادھیراج جے سنگھ، راجہ گوپال سنگھ بھدرویہ، کشن گڑھ کے راجہ بہادر راٹھور بھی تھے۔ (۴۶)

محمد شاہ کے مزاج میں جے سنگھ سوائی اور اودھ کے ناظم راجہ گردھر بہادر کو بڑا درخور تھا۔ انہوں نے محمد شاہ سے کہہ کر ہندوؤں پر سے بہت سے ٹیکس معاف کرائے۔ (۴۶) محمد شاہ ہی کے عہد میں راجہ جے سنگھ سوائی جاٹوں کو کچلنے کے لیے ۱۷۲۲ء میں تھان بھیجے گئے تو ان کے ماتحت مسلمان منصب داروں کے علاوہ اور دوسرے راجپوت سرداروں کے ساتھ راجا گردھر بہادر ناگرا اور اورچھا کے مہاراؤ ارجن سنگھ تھے۔ اس مہم میں راجہ جے سنگھ سوائی نے جو خدمات سرانجام دیں اس کے صلہ میں ان کو راجہ راجیشور، شری راجہ ادھیراج مہاراجہ کا خطاب ملا۔ (۴۷)

جے پور کے راجہ اجیت سنگھ راٹھور کے لڑکے ابھے سنگھ کو ۱۷۲۴ء میں محمد شاہ نے

Marfat.com

راجہ راجیشور کا خطاب اور ہفت ہزاری ذات اور ہفت ہزار سوار کا منصب دیا۔(۴۸)

محمد شاہ کے جانشین احمد شاہ (معزول ۱۷۵۴ء) سے اور اس کے وزیر اور بخشی سے اختلاف ہوا، تو احمد شاہ کی حمایت میں جے پور کا راجہ مادھو سنگھ ایک بڑی فوج لے کر دلی آیا اور اس نے اپنی وساطت سے اس باہمی اختلاف کو کچھ دنوں کے لیے دور کر دیا۔(۴۹)

جدوناتھ سرکار لکھتے ہیں کہ دلی کی شاہی حکومت نے ہندوستان کے جاگیر دارانہ نظام کی ریاستوں کو آپس میں ملا کر انہیں محفوظ رکھا تھا، لیکن جب شہنشاہ ایک بے جان سایہ بن کر حرم میں رہنے لگا، اس کے وزرا عیش و عشرت میں پڑ گئے، اور دربار کے حریفوں کے مقابلے میں مشغول رہنے لگے، تو متحد کرنے والی کڑی اور قابو میں رکھنے والی ایک مشترکہ طاقت جاتی رہی۔ راجپوتوں کے لیے خواہ وہ معزز افراد ہوں یا امرا میں سے ہوں، جنگ ایک خاص پیشہ تھا، جو ان کے مزاج روایت اور تربیت کے مطابق تھا اور جاگیر ہی پر قبضے کے تخیل سے انہیں عزت اور راحت حاصل ہوتی تھی۔ مغلوں کی حکومت کے حدود جب انتہا کو پہنچ گئے تو بعد کے مغل حکمران بھی جنگ کرنے میں بزدلی محسوس کرتے، اور پھر وہ کچھ ایسے عیش پسند ہوگئے کہ زیادہ فوج رکھنے سے بے فکر ہوگئے، جس کے بعد راجپوتوں کی سپہگری بھی زوال پر آگئی۔ ان میں بے روزگاری بڑھی، تو کاہلی اور دوسری برائیاں بھی در آئیں۔ ان کے لیے کوئی باعزت اور منفعت بخش پیشہ نہیں رہ گیا، تو وہ اپنے علاقوں میں محدود رہنے لگے اور ان کی تلواریں آپس ہی میں چلنے لگیں۔ ہر خاندان میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔(۵۰)

راجپوتوں کو مغل بادشاہوں سے جو قلبی لگاؤ رہا، اس کا اندازہ اس روایت سے بھی ہوگا کہ جب دلی کے قلعۂ معلیٰ پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا اور کچھ زمانے کے بعد جے پور کے مہاراجہ دلی آئے، تو قلعۂ معلیٰ بھی دیکھنے گئے۔ جب وہ اس جگہ پہنچے جہاں تخت رکھا جاتا تھا تو تخت کے سامنے کھڑے ہوکر چلا اٹھے: "مہابلی! پھر کروٹ لے" مہابلی اکبر کا خطاب تھا۔ مہاراجہ نے دولت مغلیہ کی گود میں پرورش پائی تھی۔ اس لیے عالم بیخودی میں اکبر کو پکار اٹھے۔(۵۱)

شاہ عالم کے باپ عالمگیر ثانی (ف ۱۷۵۹ء) کا قتل بہت دردناک طریقے سے ہوا تھا۔ قتل کے اسباب لکھنے کی یہاں ضرورت نہیں۔ اس کی لاش جمنا میں ڈال دی گئی۔ بہتے بہتے وہ رات کو ایک کنارے جا لگی۔ اتفاقاً ادھر سے ایک عورت رام کور نامی گذری۔ لاش کو دیکھ کر جھجکی۔ پھر پہچان کر صبح تک اس کے پاس بیٹھی رہی۔ صبح ہوئی تو وہ لاش اور عورت قلعہ میں لائی گئی۔ شاہ عالم جب اپنے باپ عالمگیر ثانی کے بعد تخت پر بیٹھا، تو اس نے اس عورت کو

Marfat.com

انعام و اکرام دیا اور اپنی بہن بنایا۔ رام کور کا یہ معمول ہوگیا کہ وہ قلعہ میں اپنا حق جتا کر آتی اور رہتی تھی۔ اسی کی خاطر سے سلونو کی سالانہ رسم شاہی محل میں منائی جاتی اور اس میں کل ہندوانی ریت رسم ادا کی جاتی، اس سلسلہ میں سید نصیر حسین خان خیال لکھتے ہیں کہ شاہی محل میں تہوار برسات ہوتا، جھولے پڑتے، پینگ بڑھتے، چولھے سلگتے، کڑھائیاں چڑھتیں، اور عورتیں پکوان پکاتیں، اتنے میں بہن جی (رام کور) آتیں اور سونے کی قطبی میں کچھ ساتھ لاتیں۔ حضور بادشاہ تک پہنچتیں، اور اپنی قطبی سے سچے موتیوں کا سمرن نکالتیں، اس میں سونے کی گھنڈیاں ہوتیں۔ جھک کر ایک ادا کے ساتھ شاہ عالم کی کلائی میں اسے باندھتیں۔ بادشاہ مسکراتے اور بہن کی پیٹھ پر ہاتھ دھرتے، ان کی اور اس کی راکھی بندی کی سلامتی کی دعا کرتے۔ پھر ان کے ہاتھ میں خود بدولت زمرد کی چوڑیاں پہناتے اور بھائی ہونے کا حق ادا کرتے۔ پھر شال دو شالے بٹتے، برہمن پڑھ کر اسیس (دعا) دیتے۔ مہابلی بادشاہ سلامت کی دھوم مچتی۔ باجے بجتے، ناچ رنگ ہوتے، ساز چھڑتے اور گلے پڑتے۔ محفل اٹھتی تو شاہ بھائی کے گھر سے رام کور بہن ایک شان سے رخصت ہوتیں۔ شہزادیوں کی جھرمت میں در دولت تک آتیں اور پھر سواری میں گھر جاتیں۔ یہ رسم شاہ عالم کے بعد بھی قائم رہی۔ اکبر ثانی کے وقت میں ان رام کور کی بیٹی راکھی باندھنے اور اپنا نیگ لینے آتیں۔ بہادر شاہ نے بھی اس سلونو کو باقی رکھا اور اس سے ہندو مسلم رشتے کو قائم رکھا۔ (۵۲)

ماخذ

۱۔ جوامع الحکایات و لوامع الروایات، اردو ترجمہ اختر شیرانی، جلد دوم باب ششم حکایت نمبر ۱، ص ۸۔۶

۲۔ ایضاً، حکایت نمبر ۱۹، ص ۳۸۔۳۶

۳۔ ایضاً، باب ششم، جلد اول، نمبر ۶

۴۔ ایضاً، جلد اول، باب ششم، نمبر ۲۲

۵۔ تفصیل کے لیے دیکھیے، ہندوستان کے معاشرتی حالات ازمنۂ وسطیٰ میں، از عبداللہ یوسف علی، ص ۱۰۰۔۹۸

۶۔ تاریخ فیروز شاہی، از ضیاء الدین برنی، ص ۱۹۵

۷۔ مراۃ الخیال، ص ۴۳۔۲۴۲؛ نیز راگ درپن (قلمی نسخہ دارالمصنفین)

۸۔ تزک جہانگیری، ص ۸۲

۹۔ گلمپسز آف مڈیول انڈین کلچر، از ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ص ۱۲۴

۱۰۔ فوائد الفواد، ص ۵۶۔۵۵

Marfat.com

١١۔سفرنامہ ابن بطوطہ (اردو ترجمہ) ص ١٣٨۔١٣٧

١٢۔واقعات مشتاقی، ص ١٦؛ تاریخ فرشتہ، جلد اول، ص ١٨٧

١٣۔انوار العیون (ملفوظات شیخ العالم شاہ احمد عبدالحق)، ص ٢٥۔٢٣

١٤۔تاریخ فرشتہ، جلد اول، ص ٢٧۴

١٥۔ایضاً، ص ٢٨١

١٦۔دبستان مذاہب (بمبئی ایڈیشن)، ص ١٥٩

١٧۔کبیر صاحب از پنڈت منوہر لال زتسی، ص ٦١

١٨۔دبستان مذاہب، ص ١٦

١٩۔تاریخ داؤدی، ص ١٣٨۔١٣٩

٢٠۔تاریخ فیروز شاہی، اردو ترجمہ عباس خاں شیروانی، ص ١٣٣۔١٣٢؛ تاریخ ہندوستان، از ذکاء اللہ، جلد سوم، ص ٣۴١

٢١۔مآثر الامرا بحوالہ دربار اکبری از محمد حسین آزاد، ص ٦٩۔٦٨

٢٢۔مغل اور اردو، از نصیر حسین خیال، ص ١۴

٢٣۔تاریخ فرشتہ، ج اول، ص ٢٥٩؛ منتخب التواریخ، جلد سوم، ص ١۴٣؛ دربار اکبری، از محمد حسین آزاد، لکھنو ایڈیشن، ص ٣٢

٢۴۔اکبرنامہ، جلد سوم، ص ٥٠۔٣٩؛ مآثر الامرا، حصہ دوم، ص ١١١

٢٥۔منتخب التواریخ، جلد دوم، ص ٣٦۴

٢٦۔مآثر الامرا، جلد دوم، ص ١٦٩۔١٦٨

٢٧۔مڈیول انڈیا کوارٹرلی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، جولائی۔ اکتوبر ١٩٥٧ء

٢٨۔تزک جہانگیری، ص ٩٠

٢٩۔مآثر الامرا، جلد دوم، ص ٢٢٣۔٢٢٢

٣٠۔ایضاً، ص ١٥٦

٣١۔آئین اکبری (انگریزی ترجمہ) جلد اول، ص ١٧٦

٣٢۔مضمون ''سنسکرت مسلمانوں کی سرپرستی میں'' از گنڈے راؤ ہرکارے، ''اسلامک کلچر، حیدرآباد دکن، اکتوبر ١٩٥٢ء

٣٣۔مآثر الامرا، جلد دوم، ص ٢٥

٣۴۔ایضاً، ص ۴۴٦

٣٥۔مضمون ''سنسکرت مسلمانوں کی سرپرستی میں'' از گنڈے راؤ ہرکارے، ''اسلامک کلچر، حیدرآباد دکن، اکتوبر ١٩٥٢ء

٣٦۔مآثر عالمگیری، ص ٢١٠

٣٧۔عالمگیر نامہ، ص ٦۴۴۔٦٣٩

٣٨۔دعوت اسلام (از ٹی۔ ڈبلو۔ آرنلڈ مترجم عنایت اللہ دہلوی) ص ٢٨٠؛ انک ڈوٹس آف اورنگ زیب،

Marfat.com

از جدوناتھ سرکار، ص ۹۱-۹۰
۳۹۔رقعات اورنگ زیب نمبر۲۸۴ (انڈیا آفس لائبریری) بحوالہ اورنگ زیب اینڈ ہز ٹائمز از ظہیر الدین فاروقی، ص۲۸۳
۴۰۔انڈیا ڈی وائڈد، ص ۳۶
۴۱۔ایضاً، ص ۳۵
۴۲۔فال آف دی مغل امپائر، جلد اول، ص ۱۳۰
۴۳۔منتخب اللباب از خافی خان، جلد دوم، ص ۵۸۸
۴۴۔لیٹر مغلز، از ولیم ارون، ص ۲۸۶
۴۵۔منتخب اللباب از خافی خان، جلد سوم، ص ۸۵۱
۴۶۔ایضاً، ص ۹۲۱-۹۲۰
۴۶۔لیٹر مغلز، از ولیم ارون، جلد دوم، ص ۱۰۳
۴۷۔منتخب اللباب از خافی خان، جلد سوم، ۹۴۵ ا لیٹر مغلز، از ولیم ارون، جلد دوم، ص ۱۲۴
۴۸۔ایضاً، ص ۱۱۵
۴۹۔فال آف دی مغل امپائر از جدوناتھ سرکار، جلد اول، ص ۲۸۲
۵۰۔ایضاً، جلد اول، ص ۱۳۱
۵۱۔یاد ایام از عبدالرزاق کانپوری، ص ۲۳۱-۲۳۰
۵۲۔مغل اور اردو، ص ۱۰۶-۱۰۴

☆☆☆

Marfat.com

تہذیبوں کے مابین مکالمہ

کیا، کیوں اور کس طرح؟

محسن اراکی ☆

''تہذیبوں کے مابین مکالمہ'' فارسی عبارت ''گفت وگوی تمدن ھا'' کا مترادف ہے۔ ''مکالمہ'' اردو میں انگریزی لفظ ''Dialogue'' کا ترجمہ ہے۔ مکالمہ اور Dialogue دونوں میں کہنے اور سننے کا مفہوم پایا جاتا ہے لیکن زیر نظر مقالے کے مصنف جناب محسن اراکی کے نزدیک ''گفت وگو'' میں یہ جامع مفہوم نہیں پایا جاتا۔ اس مقالے کا مطالعہ یہ امر ذہن میں رکھتے ہوئے کیا جانا چاہیے۔ علاوہ ازیں قارئین کے علم میں ہوگا کہ اسلامی جمہوریہ ایران کے موجودہ صدر جناب ڈاکٹر سید محمد خاتمی نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ایک اجلاس میں اپنے خطاب کے دوران سرزمین مغرب میں پیش کیے جانے والے تہذیبوں کے ٹکراؤ کے نظریے کے مقابلے میں تہذیبوں کے مابین مکالمے کا نظریہ پیش کیا تھا۔ ڈاکٹر خاتمی ہی کی تجویز پر اقوام متحدہ نے پھر موجودہ عیسوی صدی کے پہلے سال کو تہذیبوں کے مابین مکالمے کا سال قرار دیا تھا۔ زیر نظر مقالہ اسی موضوع کے حوالے سے لندن میں منعقدہ ایک کانفرنس میں پیش کیا گیا۔ (مترجم)

اصل موضوع پر بات کرنے سے پہلے اس نکتے کی طرف اشارہ بجا ہے کہ اہل فکر کے مابین مکالمے کا نظریہ پیش کرنے والا دراصل اور تہذیبوں کے مابین مکالمے کے فکر کا سرچشمہ قرآن کریم ہے۔

سورۂ آل عمران کی آیت ۶۴ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمة سواء بیننا و بینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضا ارباباً من دون اللہ ترجمہ: کہہ دیں اے اہل کتاب! آؤ ہم اور آپ ایک مشترک عقیدے پر اکٹھے ہوجائیں کہ اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں اور کسی کو اللہ کا شریک نہ مانیں اور اللہ کے بجائے ایک دوسرے کو خدا نہ بنالیں۔

تہذیبوں کے مابین ''گفت وگو'' کے حوالے سے اہم ترین موضوعات میں سے خود

☆ استاد حوزہ علمیہ، یونیورسٹی بشکریہ مجلہ اندیشۂ تقریب

Marfat.com

"تہذیبوں کے مابین گفت و گو" کے الفاظ، ان کے مفہوم کی وضاحت اور ممکنہ حد تک اس موضوع کے بارے میں ان بنیادی سوالات کے جواب میں اتفاق آرا یا آرا کے مابین قربت پیدا کرنا ہے کہ تہذیبوں کے مابین مکالمہ کیا ہے، کیوں کیا جائے اور کس طرح سے کیا جائے۔

میں اس مختصر مقالے میں کوشش کروں گا کہ تہذیبوں کے مابین مکالمے کا مفہوم بیان کروں، نیز اس کے حوالے سے بعض بنیادی سوالات کے مختصر جواب بھی دوں۔ امید ہے یہ مقالہ اہل نظر اور بالخصوص تہذیبوں کے مابین مکالمے کے موضوع پر لندن میں منعقد ہونے والی عظیم کانفرنس کے شرکا کے افکار و خیالات کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور ان کی جانب سے ایک واضح ردعمل کے حصول میں موثر ثابت ہوگا۔

☆ تہذیبوں کے مابین مکالمہ سے کیا مراد ہے؟

☆ گفت و گو (اور مکالمہ) سے کیا مراد ہے؟

☆ تہذیبیں کون کونسی ہیں؟

"گفتگو" جیسا کہ اس لفظ سے ظاہر ہے،" دو یا اس سے زیادہ باتوں سے وجود میں آتی ہے البتہ گفتگو کے مختلف پہلوؤں کی مناسبت سے۔ یہ باتیں گفتگو کرنے والے افراد کے لیے قابل قبول افکار اور مقاصد کی وضاحت کے لیے ہوتی ہیں اور اس گفتگو میں افکار و آرا کا منطقی اور مفید تبادلہ ہوتا ہے۔ مختصر ترین الفاظ میں "گفت و گو" کا لفظ اپنی تمام تر خوبصورتی کے باوجود افکار کے منطقی اور مفید تبادلے کے تمام ارکان کی وضاحت میں نارسا ہے کیونکہ افکار کا منطقی اور مفید تبادلہ صرف "گفتن" (یعنی کہنے) سے نہیں ہوتا بلکہ اس میں گفتن (یعنی کہنے) کے ساتھ ساتھ شنیدن (یعنی سننا) بھی ہے کہ جو افکار و آرا کے منطقی اور مفید تبادلے کی بنیاد ہے۔

سننے کی اہمیت آراء کے منطقی و مفید تبادلے کی صورت پذیری میں کہنے سے کم تر نہیں ہے۔ دراصل سنے بغیر کہنے کی کوئی منطقی بنیاد نہ ہوگی اور یوں آرا و افکار کا منطقی تبادلہ ممکن نہ ہوگا۔ اسی وجہ سے میں تجویز کرتا ہوں کہ "تہذیبوں کے مابین گفت و گو" کے بجائے "تہذیبوں کے مابین گفت و شنید" کے الفاظ سے استفادہ کیا جائے اور اس عظیم تحریک میں شریک افراد عملی میدان میں بھی سنجیدگی سے کوشش کریں کہ اپنے افکار کو رسا طور پر پیش کریں اور دوسروں کے افکار کو بھی سنجیدگی سے سنیں۔ کہنا اور سنجیدگی سے سننا دونوں "افکار کے منطقی و مفید تبادلے" کی حقیقی بنیادیں ہیں۔

عام طور پر جب کوئی شخص زیادہ طاقت اور وسائل رکھتا ہو اور تعارض و رقابت کے میدان میں اپنے تئیں فاتح سمجھتا ہو تو وہ دوسرے کے افکار سننے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

Marfat.com

ایسے مقام پر وہ صرف کہنے پر اکتفا کرتا ہے اور سننے کی ذمہ داری مدمقابل پر ڈال دیتا ہے۔

قرآن کریم میں جس طرح اچھے انداز سے بات کرنے پر زور دیا گیا ہے، اسی طرح توجہ سے سننے پر بھی تاکید کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **فبشر عباد الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ** پس میرے ان بندوں کو خوشخبری دے جو بات سنتے ہیں اور پھر اس میں سے بہترین کو چن لیتے ہیں اور اس کی پیروی کرتے ہیں۔

جو کچھ ہم نے گفت و گو (یعنی مکالمے) کے مفہوم کے بارے میں کہا ہے اس سے یہ نتائج برآمد ہوتے ہیں:

۱۔ مکالمے کا مفہوم افکار و آرا کا منطقی و مفید تبادلہ ہے۔

۲۔ افکار کے منطقی تبادلے کی حقیقی بنیاد دو عناصر ہیں، کہنا اور سننا، اور اسی بنیاد پر ''گفت و گو'' کے بجائے ''گفت و شنید'' کے الفاظ اختیار کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔

۳۔ تہذیب اور تمدن بہتر زندگی گذارنے کے فن کا دوسرا نام ہے۔ بہتر زندگی گذارنے کا فن دو اصلی بنیادوں پر استوار ہے۔ الف: مفہوم زندگی؛ ب: وہ اقدار و مقاصد کہ جو بہتر زندگی کی پہچان کا معیار ہیں۔ ہر مقام پر اور ہر دور میں زندگی کیسے گذاری جانے کے بارے میں تمام تر اختلافات کے باوجود انسانوں کے مابین مفہوم زندگی اور اس کے مطلوبہ اقدار و مقاصد کے بارے میں بہت سے مشترک الفاظ اور تصورات موجود ہیں۔ یہ مشترک نقاط تہذیبوں کے مابین گفت و شنید کے لیے بہترین بنیاد ہیں۔ کوئی گفت و شنید مشترک نقاط اور متفق علیہ پہلوؤں کے تعین کے بغیر قابل اطمینان نتیجے تک نہیں پہنچ سکتی۔ مفہوم زندگی کی وضاحت اور حقیقی مقاصد و اقدار کی تشریح کے لیے تہذیبوں کے مشترک نقاط کی وضاحت اس طرح کی کانفرنسوں کا ایک اہم ترین حاصل ہو سکتی ہے۔ مفہوم زندگی اور بہتر زندگی کے معیارات کا تعلق تصور کائنات سے ہے۔ تصور کائنات کے بارے میں مشترک قواعد و اصول کے تعین ہی سے مفہوم زندگی اور بہتر زندگی کے معیارات کی مشترک حدود کا تعین ممکن ہوگا۔

تہذیب کے مفہوم میں مفہوم زندگی اور بہتر زندگی کے معیارات کے علاوہ بہتر زندگی کے حصول کا طریقہ بھی شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے تہذیب کا معنی بہتر جینے کا فن لیا ہے۔ عام طور پر استفادے کے طریقوں کے بارے میں ان کے عملی ہونے اور تجریدی نہ ہونے کی وجہ سے اختلاف نظر کم ہوتا ہے اور متفقہ طریقوں کا حصول آسان تر ہوتا ہے۔

جو کچھ ہم نے کہا ہے ان سے ہمیں تہذیبوں کے مابین مکالمے کا نسبتاً واضح مفہوم

Marfat.com

میسر آتا ہے کہ جس کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کیا جاسکتا ہے: تہذیبوں کے مابین مکالمہ یعنی افکار و آرا کی وضاحت اور منطقی و مفید تبادلہ، مفہوم زندگی اور بہتر زندگی کے معیارات نیز ان کے حصول کے طریقوں کے بارے میں توضیح۔

تہذیبوں کے مابین مکالمہ، کیوں؟

کیا تہذیبوں کے مابین مکالمہ کا مقصد صرف بہتر زندگی گذارنے اور اس کی افادیت کے طریقوں کے حوالے سے مختلف نمونے پیش کرنا اور ان کی وضاحت کرنا ہے یا اس سے بھی بالاتر کوئی مقصد پیش نظر ہے؟ "تہذیبوں کے مابین مکالمے سے کیا مراد ہے؟" کے بارے میں بات کرتے ہوئے یہ امر واضح ہو چکا ہے کہ اس کا مقصد ایک دوسرے کے افکار و آرا کو پیش کرنے اور ان کی وضاحت سے بڑھ کر ہے۔

"افکار کی منطقی اور مفید وضاحت" کے جملے میں جو تہذیبوں کے مابین مکالمے کی روح کو بیان کرتا ہے منطقی وضاحت کے ساتھ ساتھ اس کے مفید ہونے کا بھی ذکر ہے۔ "مفید ہونا" "تہذیبوں کے مابین مکالمہ، کیوں" کا مختصر جواب ہے اور یہ امر افکار کی صرف وضاحت سے بڑھ کر ہے۔ افکار کی وضاحت درحقیقت ان مقاصد کے حصول کے لیے ایک مقدمہ بن سکتی ہے جن کا خلاصہ ذیل میں آرہا ہے:

ا۔ بہتر زندگی گذارنے کے مفہوم اور اس کی افادیت کے حوالے سے مشترک نقطۂ ہائے نظر کا حصول

۲۔ موجودہ تہذیبوں کی قوت و ضعف کے پہلوؤں کی دریافت اور شناخت، مفہوم کے حوالے سے بھی اور افادیت کے لحاظ سے بھی۔

۳۔ اقوام کے مابین قوت کے پہلوؤں کے رشد و نمو اور ضعف کے پہلوؤں کی اصلاح کے لیے باہمی تعاون اور اس سلسلے میں ایک دوسرے کے تجربات اور وسائل سے استفادہ۔ پھر ان مقاصد کے حصول کے لیے دو مزید کوششوں کی ضرورت ہے: ایک تو قوت ضعف کے معیارات، کامیابیوں اور ناکامیوں کی وضاحت دوسرے اقوام کے باہمی تعاون کے ایسے طریقوں کا تعین جن سے قوت کے پہلوؤں اور مثبت جہات کو تقویت دی جاسکے اور ضعف کے پہلوؤں اور منفی جہات میں کمی لائی جاسکے۔

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس میں مختلف حوالوں سے تہذیبوں کے قوت و ضعف کے پہلو شامل ہیں، مثلاً اجتماعی وحدت کا پیدا کرنا، انسانی صلاحیتوں کو ابھارنا، اخلاق اور بلند مرتبہ اقدار کی توسیع، مختلف علمی و عملی پیش رفت وغیرہ اور جس مفہوم میں کہا گیا ہے اس میں تہذیبوں کے مابین

Marfat.com

مکالمہ یعنی بہتر زندگی گذارنے کے فن کے حوالے سے افکار کی منطقی و مفید وضاحت ہی ایک تہذیب کے عالمی ہونے (گلوبل) کو معقول و منطقی صورت دے سکتی ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ تہذیب کا عالمی ہونا تبھی منطقی، معقول اور قابل قبول ہے کہ یہ واحد تہذیب بہتر زندگی گذارنے کے لیے صحیح تر فکر اور بہتر روش کی حامل ہو۔ بہتر زندگی کے لیے صحیح تر فکر اور بہتر روش ایک ایسا مقصد نہیں کہ جو تہذیبوں کے مابین مکالمے کے بغیر حاصل ہو سکتا ہو۔ تہذیبوں کے مابین مکالمے یا دوسرے لفظوں میں منطقی و مفید افکار کے تبادلے کے نتیجے ہی میں تہذیبوں کے قوت و ضعف کے پہلو دریافت ہوسکتے ہیں اور ان کی شناخت ہوسکتی ہے اور بہتر زندگی کے لیے صحیح تر فکر اور بہتر راستہ ہموار ہوسکتا ہے۔ ایسی حالت میں جب معیشت، ٹیکنالوجی اور فوجی طاقت کی بہتری کے بل بوتے پر غالب تہذیب دیگر تہذیبوں پر حملہ آور ہونا چاہے اور اپنے آپ کو مختلف افکار کے حامل معاشروں اور مختلف تہذیبوں پر گلوبلائزیشن کے نام پر ٹھونسنا چاہے تو اُن نظریات و افکار کی تنقید و تحقیق کی فضا انتہائی تنگ و تاریک ہوجائے گی جو غالب تہذیب کی تشکیل کرتے ہیں اور جذباتی وابستگی سے ہٹ کر بہتر راہ و روش کا منطقی انتخاب بہت مشکل اور ناقابلِ حصول ہوجائے گا۔

تہذیبوں کے مابین مکالمے کے حوالے سے ایک حقیقت یہ بھی پوری طرح توجہ کے لائق ہے کہ مغربی تہذیب نے اگرچہ افادیت اور خصوصاً ٹیکنالوجی کے حوالے سے انسانیت کو ایک پیش رفت سے ہمکنار کیا ہے تاہم اس کے بارے میں کبھی بھی سنجیدگی سے تنقید و تحقیق نہیں کی گئی۔ گذشتہ صدی میں مغربی تہذیب ایک غالب تہذیب کی حیثیت سے کم و بیش پوری دنیائے بشریت پر سایہ فگن ہوگئی اور اقتصادی فوجی اور ٹیکنالوجی کے لحاظ سے اپنی مدمقابل تہذیبوں سے اس کا فاصلہ بہت زیادہ ہوگیا۔ لہٰذا اس تہذیب کے بارے میں مناسب اور غیر جانبدارانہ تحقیق کی فضا کبھی بھی فراہم نہ ہوسکی۔

ایسے علمی اجتماعات مغربی تہذیب پر تنقید و تحقیق کے لیے مناسب فضا فراہم کرنے کے لیے بہت مفید ہیں۔ امید ہے کہ اس کانفرنس میں شریک اہل فکر اور انسانی معاشرے کے دیگر مفکرین اور مصلحین مغربی تہذیب کے بارے میں تحقیق و تنقید کے موضوع پر سنجیدگی سے سوچیں گے اور اس سلسلے میں مناسب کوششیں کریں گے۔

تہذیبوں کے مابین مکالمہ، کس طرح سے؟

۱۔ تہذیبوں کے مابین مکالمے کا اہم ترین نتیجہ فکر و ثقافت کی منتقلی ہے اور درحقیقت مکالمے کا اصلی مقصد برتر افکار کی دیگر معاشروں اور قوموں کی طرف منتقلی یا برتر افکار و مقاصد کی حامل اقوام کے مابین وضاحت اور ان کا تبادلہ ہے۔ فکر و ثقافت کی منتقلی گاہے

Marfat.com

منطقی وضاحت کی صورت میں ہوتی ہے جو طبعی طور پر بہت مفید اور ضروری ہے اور گا ہے ٹھونسنے کی صورت میں کہ جو فوجی یا اقتصادی قوت کے زور پر کی جاتی ہے۔ تیسری صورت دھوکے اور فریب سے فکر و ثقافت کی منتقلی ہے۔ ہمارے زمانے کے ذرائع ابلاغ کے پراپیگنڈا کے بہت سے طریقے اسی نوع کے ہیں۔

۲۔مندرجہ بالا طریقوں میں سے سب سے زیادہ خطرناک دھوکے اور فریب کا طریقہ ہے۔ فریب اور دھوکے سے باطل اور بدی کو جھوٹے قالب میں حقیقت اور نیکی بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اس طرح سے نیکی اور حقیقت کے لیے تشنہ انسان اسے حاصل کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں اس نکتے پر تاکید کی گئی ہے کہا ائمہ ظلم انسانی معاشرے میں ہمیشہ دھوکے اور فریب سے کام لے کر اپنے آپ کو حقوقِ انسانی کا مدافع اور معاشرے کے مصلحین کے طور پر پیش کرتے ہیں حالانکہ وہ خود ہی انسانی معاشرے میں جرم و فساد کے سرغنے ہوتے ہیں: و اذ قیل لھم لا تفسدوا فی الارض قالوا انما نحن مصلحون جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد اور خرابی پیدا نہ کرو تو جواباً وہ کہتے ہیں کہ ہم تو مصلحین ہیں۔

دھوکے اور فریب کے ذریعے فکر و ثقافت کی منتقلی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے بروئے کار لانے والا منطق کے ذریعے اپنی بات پہنچانے میں نارسا اور عاجز ہے؛ نیز اس طریقے سے حقیقت بھی دوسروں تک نہیں پہنچتی۔ اس سے مختلف قوموں، ثقافتوں اور تہذیبوں کے مابین تقابل و تفاہم کے عمل میں بھی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔

''ثقافتی یلغار'' کی اصطلاح ثقافت کی منتقلی کے ایسے ہی طریقے پر دلالت کرتی ہے۔

۳۔''ثقافتی یلغار'' ثقافتوں اور تہذیبوں کے مابین مکالمے کے برعکس ہے۔

ثقافتی یلغار میں مقصد حقیقت کا حصول، یا حقیقت کی ترویج و اشاعت نہیں ہوتا بلکہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے مدمقابل کا گھیراؤ کرلیا جائے اور ثقافتی وسائل کے ذریعے اس پر غلبہ پالیا جائے جبکہ تہذیبوں کے مابین مکالمے کا مقصد حقیقت اور نیکی کی وضاحت اور توسیع ہے۔

ثقافتی یلغار میں مخاطب عام لوگ ہوتے ہیں جبکہ تہذیبوں کے مابین مکالمے کے مخاطب تعلیم یافتہ افراد اور اہل فکر ہوتے ہیں۔ثقافتی یلغار میں حملہ آور اپنے سامنے والوں کو اپنی پیداوار کے صارفین کا بازار سمجھتا ہے اور انہیں صارف کی حیثیت سے دیکھتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ انہیں محض پیروکار اور اندھا مقلد بنالے جبکہ تہذیبوں کے مابین مکالمہ میں دونوں اطراف کا رابطہ برابر اور ہمسر افراد کے طور پر ہوتا ہے جن میں سے ہر کوئی کوشش کرتا ہے کہ

Marfat.com

رسا بات کرے اور سنجیدگی و شائستگی سے دوسرے کی بات کو سنے۔

ثقافتی یلغار میں منطق و دلیل کے ہتھیار کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی اور اس میں زیادہ تر ترغیب و تاثیر کے ہتھیاروں سے استفادہ کیا جاتا ہے جبکہ تہذیبوں کے مابین مکالمے میں افکار کی منتقلی کے لیے اصلی بلکہ حقیقی ہتھیار دلیل ہوتا ہے۔

ثقافتی یلغار میں پراپیگنڈا اور نفسیاتی اثرات مرتب کرنے کے وسائل ثقافت کی منتقلی کے بنیادی ہتھیار ہوتے ہیں جبکہ تہذیبوں کے مابین مکالمے کے بہترین ہتھیار منطق اور برہان ہوتے ہیں۔ ثقافتی یلغار میں اس سے سروکار نہیں ہوتا کہ فکر صحیح یا غلط، اور مفید ہے یا غیر مفید۔ ثقافتی یلغار کرنے والے کا اہم مقصد اپنے مخاطب کو حملہ آور ثقافت اور فکر سے ہم آہنگ کرنا ہوتا ہے جبکہ تہذیبوں کے مابین مکالمے کا حقیقی محور نظریات و افکار کی درستی و نادرستی یا روش و وسیلہ کا مفید و غیر مفید ہونا ہے۔

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے ''تہذیبوں کے مابین مکالمے'' کی کیفیت ''ثقافتی یلغار'' کے مقابلے میں کسی حد تک واضح ہوجاتی ہے؛ نیز اس سے تہذیبوں کے مابین مکالمے کی خصوصیات کے حوالے سے مندرجہ ذیل چند پہلو بھی سامنے آجاتے ہیں۔

۱۔ تہذیبوں کے مابین مکالمے کے مخاطب قوموں کے تعلیم یافتہ اور تخلیقی فکر کے حامل افراد ہیں جبکہ ثقافتی یلغار کے مخاطب عام لوگ ہیں۔

۲۔ تہذیبوں کے مابین مکالمے کے دونوں اطراف برابر کے مدمقابل ہوتے ہیں جبکہ ثقافتی یلغار کرنے والا اپنے مدمقابل کو اپنا مقلد اور تابع بنانے کے درپے ہوتا ہے۔

۳۔ تہذیبوں کے مابین گفتگو میں فکر و ثقافت کی منتقلی کا ذریعہ منطق و دلیل ہے اور ثقافتی یلغار میں نفسیاتی ترغیب و تاثیر اور جذباتی ہتھیاروں سے کام لیا جاتا ہے۔

۴۔ تہذیبوں کے مابین مکالمے میں مقصد صحیح فکر، بہتر ہدف اور برتر طریقے کا حصول ہے، جبکہ ثقافتی یلغار میں مقصد مخاطب کو رام کرنا ہے۔

امید ہے کہ تہذیبوں کے درمیان مکالمے اور ثقافتی یلغار کی اس حدبندی سے تمام دردمند اور خیرخواہ اہل فکر کے تعاون سے افکار کے تبادلۂ خیال کی راہ جلد از جلد زیادہ ہموار ہوجائے گی اور ثقافتی یلغار کی جڑیں خشک ہوجائیں گی۔

(ترجمہ: ثاقب اکبر)

☆☆☆

Marfat.com

عمر خیام کی تجلیل کی مناسبت سے

آقای محمود محمدی عراقی کا پیغام

آنانکہ محیط فضل و آداب شدند   در جمع کمال شمع اصحاب شدند
رہ زین شب تاریک نبردند برون   گفتند فسانہ و در خواب شدند

دانشوران، محققین، اساتید اور ممتاز اہل علم و ادبی شخصیات پر بے شمار درود اور احترام و توقیر کے ساتھ حقا یہ شہادت دی جاسکتی ہے کہ ایران کی سرزمین عظیم علمی، ادبی اور بے نظیر و بے مثال عالمی خزینوں کی وارث ہے اور اس نے ہمیشہ ہی انسانیت کو عظیم موجدوں، مبتکروں اور خلاق شخصیات کا تحفہ دیا ہے۔

ابوالفتح عمر بن ابراہیم نیشاپوری پانچویں صدی ہجری کے ایران کی ان تابندہ و درخشندہ شخصیات سے ہیں جنھوں نے سائنس، ریاضی، نجوم اور حکمت کے شعبوں میں عالمی شہرت حاصل کی۔ ان کی تھوڑی سی تعداد میں دلپذیر اور پرحکمت رباعیاں ایسی ہیں جو ان کے لیے بے مثال عالمی شہرت کا باعث بنیں خصوصاً یہ شہرت توانا انگریز شاعر ایڈورڈ جیرالد فٹز، جس نے حافظ، سعدی، عطار اور جامی جیسے شہرہ آفاق ایرانی شعرا سے درس لیا تھا، کی طرف سے ان رباعیوں کے ترجمے کے بعد اوج تک پہنچی۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ فٹز جیرالڈ نے خیام کی رباعیات کے اپنے بے مثال ترجمے کی آغوش میں پرورش کی جس سے رباعی نگار کے طور پر خیام کی شہرت پہلے سے کہیں زیادہ عالمی سطح پر پھیلی۔ آج رباعیات خیام کا دنیا کی اکثر اہم زبانوں میں بعض صورتوں میں دسیوں بار ترجمہ ہوچکا ہے اور دنیا کے بہت سے ممالک کے لوگ ان سے آشنا ہیں۔ یہاں تک کہ بعض ممالک میں تو ہر شہر اور گاؤں میں ایسے افراد موجود ہیں جو ان کے اشعار سے آشنا ہیں اور دنیا کی مختلف زندہ زبانوں میں اس حکیم اور اس کی رباعیات پر سینکڑوں مقالے چھپ چکے ہیں۔

Marfat.com

ظریف اور لطیف فارسی زبان نے عظیم اسلامی معارف سے الہام لیتے ہوئے دنیا کو شعر و ادب کے خزانے تحفے میں پیش کیے اور ایران کا شمار فن شعر گوئی کے غنی ترین مراکز میں ہوتا ہے۔ رودکی، فردوسی، ناصر خسرو، سنائی، عطار، نظامی گنجوی، مولانا روم، سعدی اور حافظ کی طرح کے شعرا کے خالص اور خیال انگیز اشعار آج بھی اپنی تمام تر قدامت کے باوجود صنعتی مادیت کی بے رحم موجوں کے تھپیڑے کھاتے ہوئے انسان کے لیے ایک پناہ گاہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہر چند کہ رباعیات عمر خیام نیشاپوری اپنے حسن وزیبائی اور معنویت اور اختصار کے اعتبار سے بے مثل و بے نظیر ہیں پھر بھی شاید شاعر نہ کہا جاسکے کیونکہ خیام کے دوسرے علمی پہلو اس سے کہیں زیادہ قابل توجہ ہیں۔

رباعیات خیام دینی آزاد اندیشی ہے کیونکہ خیام نے فرصت کو غنیمت جانتے ہوئے فکر میں ایسی شادمانی اور دل ربائی کی دعوت دی ہے جس کا رشتہ عمل میں روشن خیالی سے ہے اور کسی طور بھی ان کا مقصد تن آسانی اور مے گساری نہیں۔ انسان کی ہدایت، انجام اور آغاز کار انجام سے متعلق اس کے استفسارات، حکمت اور خوبصورت شاعرانہ ادبی تنقید پر مبنی، نہ کہ کفر اور الحاد پر!

خیام کو اس کے فلسفیانہ افکار اور ریاضیات جیومیٹری اور نجوم کے شعبوں میں تلاش کیا جانا چاہیے۔ اس کے علمی پہلوؤں نے ہمارے ماضی کی تاریخ کو بے مثال افتخارات کا ذخیرہ فراہم کیا ہے مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان مذکورہ علوم میں اس کے انکشافات پر کم ہی توجہ دی گئی ہے۔ اس بنا پر ہمارے ملک کی ممتاز اور برجستہ شخصیات کو نجوم، ریاضی اور جیومیٹری اور دوسرے علمی شعبوں میں خیام کے نبوغ اور کمالات کو مدنظر رکھنا چاہیے ۔ وہ اگر ایک طرف خواجہ نصیر الدین طوسی، پاسکل اور سر نیوٹن کا ہم پلہ ہے تو جیومیٹری میں اسے ہیلبرٹ اور ڈکارٹ کا ہم ردیف سمجھنا چاہیے۔ تقویم جلالی جو دنیا کی دقیق ترین تقویم شمار کی جاتی ہے کے سلسلے میں بھی میں اس کا کردار ابو حاتم مظفر اسفزاری ابوالعباس فضل بن محمد لوکری مروزی میمون بن نجیب واسطی اور ابن کوشک معموری بیہقی کی صف میں نظر آتا ہے اور اس کی کتاب **شرح ما اشکل من مصادرات الاقلیدسی** کا نئے سرے سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

میں ملک کے اندر یونیورسٹیوں کی ممتاز علمی شخصیات اور اساتذہ کے ساتھ ساتھ اسلامی جمہوریہ ایران کے بیرون ملک سفارتی اداروں سے بھی اس برجستہ ایرانی دانشور کے علمی زاویوں کی دوسرے ممالک میں شناخت کرانے میں سعی بلیغ کرنے کی درخواست کرتا ہوں۔

محمود محمدی عراقی

رئیس سازمان فرہنگ و ارتباطات اسلامی، ایران

Marfat.com

تجلیل عطار نیشاپوری کے سلسلے میں

آقای محمود محمدی عراقی کا پیغام

تاریخ، ثقافت اور ادبیات ایران کا عروج بعض ایسی گرانقدر اور معزز شخصیات کی مرہون منت ہیں جو زمان و مکان کے تنگنا سے باہر نکل کر اور زمانہ ہائے مستقبل کی بلندیوں پر گامزن ہوکر خود اپنی ثقافت اور اس سے نکلے ہوئے تمدن کو تمام اقوام اور ثقافتوں کے لیے لائق تعظیم بنالیتے ہیں۔

شیخ فریدالدین محمد عطار نیشاپوری چھٹی صدی ہجری کے ایک ایسے ہی توانا عارف و شاعر اور ایسی ہی معجز نما اور اسرار خلقت کی نقاب کشا شخصیت تھی جو اپنی مثنویوں میں حکمت و عرفان، ذوق و فن اور گہرے دینی فلسفے کے گران بہا خزانوں کے ذریعے عالم لاہوت سے عالم آب و گل کے لیے جدید و تازہ کلام اور پیغام کا تحفہ لائے اور جنھوں نے اپنے پر جستجو عرفان کے ذریعے مسافران راہ حقیقت کے لیے روحانی سیر و سلوک کی مستی و سودا پیدا کیا۔

عطار ایک ایسا دل جلا آزادمنش اور دردمند شاعر تھا جس کے دل میں عشق اور دین کا درد موجود تھا۔ وہ ایسا مومن اور بااعتقاد انسان تھا جو ہر قسم کی تنگ نظری اور تعصب سے دور تھا، نیز وہ ایک ایسا واصلِ حق عارف تھا جو ہر قسم کی افراط و تفریط سے مبّرا تھا۔ وہ ہرگز مداح اور قصیدہ گو شاعر نہ تھا اور اپنی ممدوح شخصیات اور حکام کے لیے شعرگوئی نہ کرتا تھا بلکہ ایسے اخلاص سے شعر کہتا گویا اپنے افکار کے جواہر پارے خداوند تعالی کے حضور میں پیش کررہا ہو۔

شیخ عطار کے متعلق ایک قابل ذکر نکتہ یہ بھی ہے کہ بعض معاصر شعرا کے ساتھ نام و تخلص اور اشعار کے اشتراک کے باعث ماضی میں اس کی اقبال مندی کا ستارہ اس کے شایان شان نہ چمکا اور اس کے کلام کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ نہ ہوسکا، بہرحال دور جدید میں ایران اور دنیا کے محققین کی طرف سے اس کے کلام اور آثار پر روز افزوں توجہ کے باعث اس کی روح کی بلندی و عظمت کا ایک گوشہ بے نقاب ہوگیا ہے جو پیاسی انسانیت کی روح کے تزکیے اور اس کی اخلاقی منازل کی ترقی و ترفیع میں موثر واقع ہوا ہے۔ اس کے آثار ظاہری حسن و زیبائی سے

Marfat.com

بلند و برتر اور بے مثال و لایزال جمال الٰہی کی حمد و ثنا، اس سے ملحق ہوجانے اور اس کے ماسوا ہر شے سے الگ ہوجانے کی عملی راہوں پر توجہ مبذول کیے ہوئے ہیں۔

امریکی شاعر ایمرسن نے ۱۴۶ سال پہلے سے پیشینگوئی کی تھی کہ جلد ہی عطار اور عمر خیام مغرب کی سرزمین میں نہایت قدر و قیمت اور بے انتہا اعتبار حاصل کرلیں گے۔ مغرب کے مفکرین کی ان چند سالوں میں عطار کے آثار سے نہایت انس و محبت اور ان کے ترجمے اور ان پر تحقیق کے سلسلے میں بیش بہا محنتوں اور زحمتوں نے ہمیں مغرب کے اس روحانیت پرست شاعر ایمرسن کے دعوے کی سچائی کا قائل کرلیا ہے۔

نکلسن، ھلمٹ ریٹر، مارگریٹ اسمتھ، لوئی ماسینیون، پاوہ دو کورٹہ، فرانتز تشنر اور بیسیوں دیگر ادبا اور محققین نے (جو دنیا کے دور دراز علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں) انسانیت کو عطار سے روشناس کرانے میں اپنی عمریں صرف کردیں کیونکہ انہوں نے عطار سے آشنائی کے دوران یہ حقیقت پالی تھی کہ "ان کے کلام سے مانوس ہونا انسان کے باطن میں کسی چیز کو منقلب اور متغیر اور اسے بہت ساری آلائشوں اور کثافتوں سے پاک کرکے عشق کی بلند و پرشکوہ عظمتوں سے ہم کنار کردیتا ہے۔ یہ ایسا عشق ہے جس سے برتر عشق سے آج تک انسان کو پالا نہیں پڑا۔

میں ایرانی اور عالمی دانشوروں اور محققین کو ایران کے ادب و عرفان کے ان خزانوں سے بہرہ برداری کرنے اور اہل دنیا کو ان سے روشناس کرانے کی دعوت دیتے ہوئے ملک سے باہر اسلامی جمہوریہ ایران کے ثقافتی اداروں کو بھی دعوت دیتا ہوں کہ وہ اس الٰہی حکیم و فلسفی کے آثار کے تعارف کے سلسلے میں ان کا دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کرائیں۔

آپ سب پر اور اسلام اور ایران کے عرفان کے جملہ عاشقوں پر درود و سلام۔

محمود محمدی عراقی

رئیس سازمان و فرہنگ و ارتباطات اسلامی، ایران

☆☆☆

Marfat.com

سعدی، تفکر اور ثقافت کے نقطۂ نظر سے

ڈاکٹر مہناز جعفریہ☆

سعدی شیرازی سرزمین مشرق کے آسمان ادب فارسی کا دائمی درخشندہ ستارہ اور حکمت و معرفت کا باقی رہنے والا سرچشمہ ہے جس نے اپنی مہارت نفسیات انسانی اور شرح صدر کے ذریعے صاحبان فکر و اندیشہ کے اذہان میں راہ پائی اور اپنی گفتگو اور کلام کو دلوں کی دنیا میں کچھ اس طرح سے جاگزیں کر دیا کہ اس کی شہرت اور آوازہ نہ صرف اس کی زندگی ہی میں بلکہ بعد از مرگ بھی ایران کی سرحدوں سے نکل کر چہار دانگ عالم میں پھیلتا رہا۔ انیسویں صدی کا معروف امریکی اہل قلم اور مفکر ایمرسن کہتا ہے کہ "سعدیؒ دنیا کی تمام اقوام وملل کی زبان میں گفتگو کرتا ہے اور ہومر، شیکسپیئر، سروانٹ اور مونیٹی کی طرح اس کا کلام سدا بہار ہے۔"

ایمرسن گلستان سعدی کو انجیلوں میں سے ایک اور دنیا بھر کی مقدس مبنی بر دیانت کتاب سمجھتا ہے اور وہ معتقد ہے کہ اس میں پیش کردہ اخلاقی قواعد عمومی اور بین الاقوامی قوانین کا درجہ رکھتے ہیں۔"(۱)

اس میں شک نہیں کہ سعدی کی ایسی تجلیل و عظمت اس کے وسعت فکر اور خاص قسم کی عالم شناسی کی بدولت ہے یعنی وہ چیز جو سعدی کے زمانے کے حکمرانوں کی سختگیریوں بھرے حبس و اختناق اور ریاکار زہاد کے دور میں کبریت احمر اور کیمیا کی طرح نایاب تھی۔ ہم یہاں اس کے اخلاقی و معاشرتی اعتقادات و ایقانات کی بہتر تفہیم کے لیے اس کی زندگی کے اجمالی مطالعے کے بعد اس کے انداز جہاں بینی سے بعض خصوصیات خاص طور پر اس کے تخلوق خدا کی یکجہتی اور مختلف مذاہب و مکاتب کے درمیان دشمنی و عناد سے اجتناب سے متعلق خیالات پر اظہار رائے کریں گے۔

سعدی کی زندگی کو، اس کے اپنے اور دوسروں کے اقوال کے مطابق بیس سے تیس سال کے تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: ایک دور اس کے بچپن، نوجوانی اور تحصیل علم کا تھا، دوسرا اس کی سیاحتوں اور اسفار کا اور تیسرا اس کی اپنی جائے پیدائش یعنی شیراز کو واپسی اور

☆دانشگاہ آزاد اسلامی کے شورائے علمی کی رکن، بشکریہ مجلہ ادبیات جہان اسلام

Marfat.com

گلستان اور بوستان جیسے گرانقدر آثار کی تخلیق کا۔

سعدی کی زندگی کا پہلا دور شیراز اور بغداد میں گزرا۔ شیراز میں ابتدائی تحصیلات کے بعد وہ مدرسہ نظامیہ میں حصول علم کے لیے بغداد چلے گئے۔

مرا　در　نظامیه　ادرار　بود

شب　و　روز　تلقین　و　تکرار　بود

بغداد کا مدرسہ نظامیہ اور اسلامی مملکت میں چند دیگر مقامات میں دیگر نظامیے اس زمانے کے بہترین اور تمام سہولتوں سے آراستہ ترین مدرسوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان مدارس کی بنیاد الپ ارسلان کے مقتدر ایرانی وزیر نظام الملک نے رکھی تھی اور یہ مدرسے جو زیادہ تر مساجد اور دینی مراکز سے وابستہ تھے ان میں مجموعی طور پر الٰہیات کے مضامین پڑھائے جاتے اور از روئے حقیقت ان مدرسوں کے قیام کا مقصد دینی اور حکومتی اداروں کے لیے ممتاز برجستہ اور لائق افراد کی تربیت کرنا تھا۔

پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کے مدرسوں میں جن علوم کی تدریس ہوتی تھی ان میں فقہ، اصول فقہ، حدیث، علم کلام، تفسیر اور عربی ادبیات شامل تھے، جبکہ فلسفے کی تعلیم پر پابندی عاید تھی، یہاں تک کہ بعض فقہا ان علوم کے سیکھنے کو حرام سمجھتے تھے اور فلسفیوں کی تکفیر کرتے تھے۔ چنانچہ اس دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ عین القضاۃ ہمدانی اور شیخ شہاب الدین سہروردی جیسے بزرگ علما بے دینی اور آزادی فکر کے جرم میں ۵۲۶ھ اور ۵۷۸ھ میں قتل کر دیے گئے۔

صرف فزیکل سائنسز اور فلسفہ ہی اس دور میں زوال پذیر نہیں ہوئے بلکہ مجموعی طور پر روحانی زندگی، یہاں تک کہ معاشرے کی مادی ترقی بھی رک گئی کیونکہ نظریاتی تحجر اور جمود ہر قسم کی فکری اور تلاش و جستجو کا راستہ مسدود کر دیتا ہے۔(۲) چنانچہ سعدی ۶۲۳ھ میں بغداد آکر درس نظامیہ میں حجت الاسلام محمد غزالی جسے وہ ''امام مرشد'' کے عنوان سے یاد کرتا ہے کی تربیت کے زیر اثر قرار پا جاتا ہے۔ غزالی نہ صرف شافعی فقہ اور اشعری علم کلام کو جدید اور محکم بنیادوں پر استوار کرتے ہیں بلکہ ان کا شمار سلجوقیوں کی حکومت کے ستونوں میں ہوتا ہے اور وہ خواجہ نظام الملک کی وزارت کے لیے استحکام بخش ثابت ہوتے ہیں اور سعدی کے اس دور کے حکام سے قریبی روابط اور محتاط نشست و برخاست کو بھی شاید کسی حد تک اس کے اسی دور تربیت اور غزالی کی تعلیمات کا نتیجہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اگرچہ سعدی کے آثار میں غزالی کے فکر کے واضح نشانات ابھی تک ٹھیک طور سے شناخت نہیں کیے جاسکے ہیں لیکن گلستان کی بعض حکایات میں تعصب پر مبنی بعض احکام کو ایک حد تک غزالی کی تعلیمات ہی کا شاخسانہ قرار

Marfat.com

دیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر **گلستان** کی اس حکایت میں کہ: ''معتبر علمائے دین میں سے ایک کا ملحدین میں سے کسی ایک سے مناظرہ ہوگیا۔ وہ عالم اس پر حجت تمام نہ کرسکا۔ لہذا اس نے ہتھیار ڈال دیے اور واپس لوٹ گیا۔ کسی نے اس سے کہا کہ آپ اس قدر علم و فضل کے ہوتے ہوئے ایک بے دین سے مناظرے میں حجت تمام نہ کرسکے۔ اس نے کہا ''میرا علم قرآن اور حدیث اور مشایخ کے فرمودات ہیں اور وہ ان سب پر اعتقاد نہیں رکھتا اور نہیں سنتا اور مجھے اس کے کفر کے سننے کی ضرورت نہیں ہے۔''

آن کسی کہ بہ قرآن و خبر زو نرہی
آن است جوابش کہ جوابش ندہی

اس کلام کا ضعف کی حد تک کمزور لہجہ اس شدید لہجے کی یاد دلاتا ہے جسے غزالی نے اسماعلیہ فرقے والوں کے رد میں استعمال کیا ہے۔

سعدی کی زندگی کا دوسرا نکتہ جس نے تعلیم و درس نظامیہ ہی کی طرح اس کے رویوں کو شدید طور پر متاثر کیا وہ معروف عارف اور صاحب **عوارف المعارف**، شیخ شہاب الدین ابوحفص سہروردی سے اس کی آشنائی ہے۔

اس نے اپنے عرفان کے ذریعے غزالی کے تعصبات اور سخت گیریوں کو توازن بخشا اور شاید یہ کہنا بے جا نہ ہو کہ سعدی کے عرفانی عقاید کی جڑوں کو سہروردی اور اس کی تحریروں میں ڈھونڈنا چاہیے کیونکہ سعدی نے اپنے آثار میں اسے ''مرشد'' کے نام سے یاد کیا ہے:

مقالات مردان بہ مردی شنو نہ از سعدی از سهروردی شنو
مرا شیخ دانای مرشد شهاب دو اندرز فرمود بر روی آب
یکی آن کہ در نفس، خود بین مباش دگر آن کہ بر غیر، بدبین مباش(۳)

سعدی کی زندگی کا دوسرا مرحلہ اس کے طویل سفر اور سیاحتوں پر مشتمل ہے۔ **گلستان** میں اس کی عراق، حجاز، شام ماوراء النہر اور ہندوستان میں سیاحت کے سلسلے میں بہت سے اشارے موجود ہیں۔ اگرچہ شبلی نعمانی نے سعدی کے سفر ہندوستان کے سلسلے میں اس کے ''قطعہ سومنات'' پر شک کا اظہار کیا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ سعدی نے اس داستان سے ایک اخلاقی نتیجہ اخذ کیا۔ سعدی ایک جہاندیدہ شخص تھا اور دنیا کو بخوبی پہچانتا تھا اور بہت سارے طبقات سے اس کی مراودت اور معاشرت تھی اور اس نے اس سفر سے بے شمار روحانی تجربے اور کہی گئی باتیں اور مشاہدات کو ذخیرہ کرلیا جو اس کے آثار میں بخوبی نمایاں ہیں۔ وہ سیر و سفر کے بارے میں کہتا ہے:

Marfat.com

به هیچ یار مده خاطر و به هیچ دیار
که بر و بحر فراخ است و آدمی بسیار

سعدی سیر و سیاحت کے دوران بے شمار مشکلات اور خطرات سے دوچار ہوا۔ صلیبی جنگوں میں وہ قیدی بنا یا طرابلس کے خندق میں اسے مٹی ڈھونڈنے پر لگادیا گیا، لیکن باوجود ان سب مشکلات و حوادث کے وہ سیروسیاحت کی ضرورت کے بارے میں بہت سے اشارے دیتا ہے اور آدمی کی پختگی کے متعلق ایک شرط یہ سمجھتا ہے کہ سفر میں وہ اس خامی سے نکل آتا ہے:

تا به دکان و خانه در گروی　　هرگز ای خام آدمی نشوی
برو اندر جهان تفرج کنان　　پیش از آن روز کز جهان بروی

اسی جہان دیدہ ہونے کی بدولت سعدی اپنے عقاید اور گفتار میں عظیم عالم شناسی کی راہ پالیتا ہے:

به جهان خرم از آنم که جهان از اوست　　عاشقم بر همه عالم که همه عالم از اوست

سیروسلوک کے مقام پر اس نے کہا ہے کہ عالم و عابد وصوفی سب راستے کے بچے یا طفلان مکتب ہیں۔ طولانی عمر، سیر و سیاحت اور ممتاز طبقہ کے افراد کے ساتھ معاشرت نے سعدی کے افکار وگفتار اور اس کی نکتہ سنجی میں ایک خاص وسعت پیدا کی۔(۴)

سعدی کی زندگی میں تیسرا دور اس کی شیراز کو واپسی ہے۔ اس مرحلے میں اس کی زندگی کی سختیاں، تلخیاں اور مصائب ثمر بخش ثابت ہوئے اور گلستان وبوستان جیسے عالمگیر آثار ظہور میں آئے۔ ان دو گرانقدر کتابوں سے سعدی کے فکر ونظر کی گہرائیوں کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کی تحریروں سے جو نتیجہ اخذ ہوتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ وعظ، علم دین اور فقہی مسائل کے بیان کی طرف اس کا رجحان تھا۔ مثال کے طور پر ''جامع مسجد بعلبک میں ایک مردہ و افسردہ دل گروہ سے وعظ کی صورت میں گفتگو کررہا تھا۔''(۵)

۲۔ نظامیہ دروس اور بچپن کے اثرات سے حاصلہ مسئلہ جبر یا قضا و قدر؛ اگرچہ یہ مسئلہ سعدی کے بہت سارے نظریات میں اس کے دوسرے اسباق، عرفان وتصوف اور ادیان وعلوم و وسیع معارف، جو اس نے طویل سفروں کے دوران حاصل کیے، میں گھر کر ماند پڑ گیا لیکن پھر بھی سعدی کے فکر کے اصلی محور کو مسئلہ جبر ہی تشکیل دیتا ہے۔

نمونے کے طور پر ملاحظہ ہو:

یکی از بخت کامران بینی　　دیگری را دل از مجاهده پست

Marfat.com

این در این چاه خویشتن نفتاد و آن بر آن تخت خویشتن ننشست

اس مسئلے کو گلستان میں ایک اور جگہ بھی ہم دیکھتے ہیں جہاں چوروں کے گروہ میں سے ایک نوجوان کو وزیر کی سفارش سے بادشاہ بخش دیتا ہے لیکن سعدی کے بقول کم ذات ہونے کی بنا پر تربیت کا اس پر کوئی اثر نہیں مرتب ہوتا اور آخرکار وہ اپنی فطرت بد کی وجہ سے بدمعاش کا ساتھی بن کر اپنے باپ کی جگہ لے لیتا ہے جس سے سعدی یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے:

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود
گرچہ با آدمی بزرگ شود

یا:

شمشیر نیک از آهن بد چون کند کسی ناکس بہ تربیت نشود ای حکیم کسی
باران کہ در لطافت طبعش خلاف نیست در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس(۶)

۳۔وہ حقیقت بینی اور شرح صدر جو عرفانی تربیت اور صوفیانہ تعلیم کی وجہ سے سعدی کے وجدان میں پیدا ہوئے، درحقیقت وہ اس کی ذات کے اندر پہلے سے بھی موجود تھے تاہم جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے یہ حقیقی معنوں میں اس کے ذہن میں عرفان کی ترقی اور نفوذ کے مرہون منت تھے۔ عرفان و تصوف ہی وہ عناصر ہیں جن کے سبب سے سعدی کا فکر اشاعرہ کی تلقینات و عقاید کے جمود سے خارج ہوا۔

سعدی علم دین کے حصول کے ساتھ ساتھ دین کے باطن یعنی عرفان کو اپنے وجود کے اندر پرورش دیتا رہا۔ وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے نام اور صفات اور ان میں سے ہر ایک کے مرموز و رمزی بیان کے ذریعے بندگان خدا میں ان اوصاف کا اتباع پیدا کرنا چاہتا ہے، وہ اوصاف جو ایک مکتب اور مشرب سے کہیں زیادہ وسعتوں کے ساتھ مخلوق کو گھیرے ہوئے ہیں اور ہر نظریہ اور فکر کا حامل انسان انہیں قبول کرسکتا ہے۔ وہ ایسے خدا کی پرستش اور اس کی تبلیغ کرتا ہے جو نہ صرف یہ کہ سخت گیر نہیں بلکہ گناہوں کے عذر قبول کر لینے والی ہستی ہے:

خداوند بخشندہ دستگیر کریم خطا بخش پوزش پذیر
فرو ماندگان را بہ رحمت قریب تضرع کنان را بہ دعوت مجیب(۷)

وہ تمام مخلوقات کا روزی رسان ہے اور ستمگروں کو بخش دیتا ہے۔ اس کی رحمت کا دروازہ سدا توبہ کرنے والوں کے لیے کھلا رہتا ہے۔ مہربان، عفو و درگذر کرنے والا، اور روز جزا یعنی قیامت کے دن کا حاکم ہے۔ ان تمام مسائل میں اس نے متعصبین کے برعکس خدا کی سخت گیریاں دکھانے کے بجائے خداوند کریم کا رؤف و رحیم ہونا دکھایا ہے:

Marfat.com

مهیا کن روزي مار و مور　　اگر چند بي دست و پایند و زور
پس پرده بیند عمل هاي بد　　همو پرده پوشد به آلای خود
ادیم زمین سفرهٔ عام اوست　　برین خوان یغما چه دشمن، چه دوست
نه گردن کشان را بگیرد به فور　　نه عذر آوران را براند به جور
به قدرت نگهدار بالا و شیب　　خداوند دیوان روز حسیب

تصوف کی تعلیم میں سعدی زیادہ تر باطن کی صفائی اور جذبات و احساسات کے استعال اور ایثارِ نفس کو مدّنظر رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ انسانی طبیعت میں سے بغض، حسد، کینہ، حرص غضب اور خودپسندی ختم ہوجائے۔ وہ اخلاقی نقطۂ نظر سے منفی مقابلے کو پسند کرتا ہے اور دین و دانش، کوشش و عمل اور جسمانی و روحانی ریاضت پر زور دیتا ہے۔عرفانی اشعار جو اس نے محبت و شوق اور عشق میں کہے ہیں وہ اس کی شاعری میں نبوغ و فطانت اور ذوق کی ان تجلیات کا جلوہ ہیں جو عرفان سے ہماآہنگ ہے۔ وہ تمام عالم انسانیت کو مخاطب کرتا ہے یعنی وہی بنی نوع انسان جو تمام الٰہی ادیان اور شریعتوں کا مخاطب رہی ہے:

ایها الناس جهان جای تن آسانی نیست　　مرد دانا به جهان داشتن ارزانی نیست
خفتگان را خبر از زمزمهٔ مرغ سحر　　حیوان را خبر از عالم انسانی نیست
حذر از پیروی نفس که در راه خدای　　مردم افکن تر از این غول بیابانی نیست
داروی تربیت از پیر طریقت بستان　　کآدمی را بتر از علت نادانی نیست
عالم و عابد و صوفی همه طفلان رهند　　مرد اگر هست به جز عارف ربانی نیست(۸)

سعدی کی نگاہ میں تصوف صراطِ مستقیم اور دیدارِ الٰہی کا وہ راستہ ہے جس کی وسعت تمام قلوب اور شریعتوں کے مطابق ہے، اور جس سے انسان کو اخلاقی بلندی ملتی ہے یعنی وہی اصول جو درویشی، رندی اور قلندری کے آئین میں بھی انسان کا مقصد اور ہدف ہوتے ہیں۔ چنانچہ شیخ خود ہی فرماتے ہیں کہ ظاہری حالت میں درویشوں کے تو لباس پیوند زدہ اور سرمنڈے ہوئے ہوتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ دل زندہ اور نفس مرچکے ہوتے ہیں۔

سعدی ایک اور مقام پر لکھتا ہے: رندوں کے ایک گروہ نے ایک درویش کی درویشی سے انکار کرتے ہوئے اسے بُرا بھلا کہنا شروع کیا۔ درویش نے جب یہ ماجرا اپنے پیر طریقت سے بیان کیا تو اس نے کہا کہ اے فرزند، درویش کا خرقہ درحقیقت رضا کا لباس ہوتا ہے جو کوئی اس لباس کو زیب تن کرکے ناکامی و نامرادی کو برداشت نہ کرسکے وہ محض ایک مدعی ہے اور اس کے لیے خرقہ پہننا حرام ہے۔

Marfat.com

دریای فراوان نشود تیره به سنگی		عارف که برنجد تنک آب است هنوز

یا

شنیدم که مردان راهِ خدای		دل دشمنان را نکردند تنگ
ترا کی میسر شود این مقام؟		که با دوستانت خلاف است و جنگ

۴۔ سعدی کی جہان بینی کا ایک اور اہم عنصر عفو و درگزر ہے حالانکہ یہ تعلیمات بہت سے مواقع پر اشاعرہ کے احکام اور اصولوں سے مختلف بلکہ متضاد نظر آتی ہیں۔ لیکن انہوں نے سعدی پر ایک خاص اثر ڈالا اور اس کے تعصب کو کم کر دیا۔

اس کے علاوہ سعدی کی خاندانی تربیت نے بھی، جو اپنے مذہبی رنگ کے علاوہ دانشمندی اور عدل پروری کے اصولوں پر مبنی تھی، اس میں تصوف کے اثرات کو تقویت بخشی۔ **گلستان** میں سعدی کے بچپن کی یہ داستان اس حقیقت کی غماز ہے: مجھے یاد ہے کہ بچپن میں عبادت گزاری، شب خیزی، پرہیزگاری اور زہد کے دلدادہ تھا۔ ایک رات اپنے والد مرحوم کی خدمت میں حاضر تھا اور تمام رات میں نے آنکھ تک نہ جھپکی اور قرآن کریم لیے بیٹھا رہا جبکہ لوگوں کی ایک جماعت ہمارے آس پاس سو رہی تھی۔ میں نے اپنے باپ سے کہا کہ ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو اٹھ کر دو رکعت نماز پڑھ لیتا۔ یہ تو ایسے خواب غفلت میں کھوئے ہوئے ہیں گویا سوئے نہیں بلکہ مرے ہوئے ہیں۔ والد نے کہا: "جان پدر، اگر تو بھی سو جاتا تو یہ اس سے بہتر ہوتا کہ لوگوں کی بدگوئی کرتا ہے۔"(۹)

نبیند مدعی جز خویشتن را		که دارد پردهٔ ی پندار در پیش(۱۰)
گرت چشم خدا بینی ببخشند		نبینی هیچ کس عاجز تر از خویش

اسی طرح **بوستان** میں حضرت ابراہیمؑ کی ایک حکایت بیان ہوئی ہے جس کے مطابق آپ نے ایک بوڑھے آتش پرست کو اللہ کی یاد سے غفلت پر تنبیہ کی اور اسے دھتکار دیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی فوراً آپ کو سرزنش کی کہ ٹھیک ہے وہ تیرے دین کا پیرو نہیں، لیکن ہمارا بندہ تو ہے!

شنیدم که یک هفته ابن السبیل		نیامد به مهمان سرای خلیل
ز فرخنده خویی نخوردی به گاه		مگر بینوایی درآید ز راه
برون رفت و هر جانبی بنگرید		بر اطراف وادی نگه کرد و دید
به تنها یکی در بیابان چو بید		سر و موش از برف پیری سپید
به دیدارش مرحبایی بگفت		به رسم کریمان صلایی بگفت

Marfat.com

که ای چشم هاى مرا مردمک — یکی مردمی کن و به نان و نمک
نَعَم گفت و برجست و برداشت گام — که دانست خلقش علیه السلام
رقیبان مهمانسرای خلیل — به عزت نشاندند پیر ذلیل
بفرمود و ترتیب کردند خوان — نشستند بر هر طرف همگنان
چو بسم الله آغاز کردند جمع — نیامد ز پیرش حدیثی به سمع
چنین گفت ای پیر دیرینه روز — چو پیران نمی بینمت صدق و سوز
نه شرط است وقتی که روزی خوری — که نام خداوند روزی بری؟
بگفتا نگیرم طریقی به دست — که نشنیدم از پیر آذر پرست
بدانست پیغمبر نیک فال — که گبرست پیر تبه بوده حال
به خواری براندش چو بیگانه دید — که منکر بود پیش پاکان پلید
سروش آمد از کردگار جلیل — به هیبت ملامت کنان کای خلیل
منش داده صد سال روزی و جان — تو را نفرت آمد از او یک زمان(۱۱)
گر او می برد پیش آتش سجود — تو با او پس چرا می بری دست جود

یا گلستان کی ایک اور حکایت جہاں ایک عابد کسی نشے میں مدہوش شخص کے پاس سے گذرتے ہوئے کراہت کا اظہار کرتا ہے تو وہ جوان قرآن کریم کی یہ آیت اسے سناتا ہے: اذا مروا باللغو مروا کراماً۔

یا گلستان کی ایک اور حکایت میں سعدی بیان کرتا ہے کہ ایک دفعہ سفر حجاز کے دوران اہل دل جوانوں کا ایک گروہ میرا ہمدم اور ہمقدم تھا۔ یہ لوگ کچھ گنگناتے رہتے اور کبھی کوئی دل کو لگنے والا شعر بھی پڑھ دیتے۔ انہی میں درویشوں کے حال کا منکر اور ان کے درد سے بے خبر ایک شخص بھی تھا۔ جب ہم خلیل بنی ہلال کے مقام پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ عرب قبائل سے متعلق ایک سیاہ فام بچہ کہیں سے برآمد ہوا اور اس نے ایک نغمے کا آغاز کیا جسے سنتے ہی فضا میں پرندے تک متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، یہانتک کہ میں نے عابد کے اونٹنی کو دیکھا کہ اس نے بھی جھومتے جھومتے سوار کو نیچے گرا دیا ہے اور آگے بڑھ گئی ہے۔ میں نے بے اختیار اس عابد سے کہا کہ اس نغمے نے ایک حیوان تک کو متاثر کردیا لیکن تجھ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا!!!

دانی چه گفت مرا آن بلبل سحری — تو خود چه آدمی کز عشق بی خبری؟

Marfat.com

اشتر بہ شعر عرب در حالتست و طرب　　　گر ذوق نیست ترا کژ طبع جانوری

***

بہ ذکرش ھرچہ بینی در خروش است　　　دلی داند در این معنی کہ گوش است (۱۲)
نہ بلبل بر گلش تسبیح خوانیست　　　کہ ھر خاری بہ تسبیحش زبانیست

یا اس حکایت کو دیکھیے جو زمانے کی عام روش کے برخلاف اخلاق کریمانہ اور وسیع القلبی کا درس دیتی ہے۔ ایک بزرگ نے ایک پارسا سے کہا کہ فلاں عابد کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ لوگ تو اس کی برائیاں کرتے ہیں۔ پارسا نے جواب دیا کہ میں اس کے ظاہر میں تو کوئی عیب نہیں دیکھتا، اور اس کے باطن کی بابت مجھے علم غیب حاصل نہیں:

ھر کہ را جامہ ای پارسا بینی　　　پارسا دان و نیک مرد انگار
ور ندانی کہ در نھانش چیست　　　محتسب را درون خانہ چہ کار

البتہ سعدی کے ان آزاد منشانہ افکار کے ساتھ ساتھ اس کی پیش کردہ ایسی حکایات سے بھی ہمارا سابقہ پڑتا ہے جہاں وہ بلا تردید ایک طرف تو لوگوں کے عمومی افکار کے زیر اثر اور دوسری طرف اپنی معاصر سخت گیرانہ سوچ کے زیر اثر نظر آتا ہے۔ موخرالذکر ایک ایسی چیز ہے جس میں گلستان و بوستان میں جگہ جگہ سعدی ظاہراً بچنے کی کوشش کرتا ہے لیکن پھر بھی ان کا ہلکا سا سایہ اس کی گفتگو میں کہیں نہ کہیں نظر آ ہی جاتا ہے۔ اس مقام پر بھی بے شک ہم سعدی کے قصد کے متعلق یہ حکم کرسکتے ہیں کہ اس کے ایسے بیانات کا مقصد فقط اپنی بات کی تشریح اور توضیح ہے نہ کہ کسی بھی مکتب فکر کے کسی موحد کی اہانت کرنا؛ اور بیشک وہ جانتا تھا کہ گبر کے معنی زردشت کے آئین کا پیروکار ہے جبکہ ترسا سے مراد مسیحی زاہد اور جہود سے مقصود موحد یہودی ہے نہ کہ خدا سے محارب اور مقابلہ کنندہ، لیکن اس کے باوجود معاشرے کی عادت کے مطابق وہ کبھی کبھار سہواً ان افراد کو ''کافر و بت پرست'' کے زمرے میں شمار کرتا ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل حکایت میں ـــــ کہتے ہیں ایک گداگر نے بہت سا مال و دولت جمع کررکھا تھا۔ ایک بادشاہ نے اس سے کہا کہ تمہارے پاس بے حد و حساب پیسہ ہے، اور ہمیں ایک مہم درپیش ہے اگر تو اس سے اس وقت ہماری مدد کردے تو کیا ہی اچھا ہو۔ (۱۳) محصول کے آتے ہی تمہارا قرض اتار دیا جائے گا اور ہم تیرا شکریہ بھی ادا کریں گے۔ اس فقیر نے جواب دیا ''اے روئے زمین کے بادشاہ، یہ بات تیری ملوکانہ شان کے مطابق نہیں کہ تو مجھ جیسے گدا کے مال پر دست درازی کرے جس نے دانہ دانہ کرکے یہ ثروت گدائی کے ذریعے حاصل کی ہے۔ بادشاہ نے کہا پروا نہیں، میں نے بھی یہ مال کسی کافر کو ہی دینا ہے۔

Marfat.com

"الخبیثات للخبیثین" (خبیث خبیثوں ہی کے لیے ہوتے ہیں)

گر آب چاہ نصرانی نہ پاک است　　جھود مردہ می شویی چہ باک است(۱۴)

اس حکایت میں عیسائی اور یہودی کا ذکر صرف من باب المثال آیا ہے اور اس زمانے کے لوگوں کی عادت و رسم کے مطابق جو دیگر ادیان کے پیروکاروں کو پلید اور نجس سمجھتے تھے اور سعدی نے بھی اسی فکر کی پیروی کرتے ہوئے سب کو ایک ہی زمرے میں شامل کرلیا ہے یا جیسے اس حکایت میں جہاں وہ کسی یہودی کی ہمسائیگی کو اپنے لیے باعث ننگ شمار کرتا ہے۔ ایک گھر کی خریداری کے سلسلے میں شش و پنج میں پڑا تھا۔ ایک یہودی نے کہا کہ آخر میں اس مقام کا مکھیا ہوں۔ اس مکان کے عیب و ہنر سے مجھ سے زیادہ کون واقف ہوگا۔ خرید لے، اس میں کوئی عیب نہیں۔ میں نے کہا ماسوائے اس کے کہ تو میرا ہمسایہ ہوگا۔

خانہ ای را کہ چون ھمسایہ است　　دہ درم سیم بر عیار ارزو(۱۵)
لکن امیدوار باید بود　　کہ پس از مرگ تو ھزار ارزد

سعدی گلستان کے دیباچے میں "گبر اور ترسا" کو سہواً اللہ کے دشمن کہہ کر مخاطب کرتا ہے:

ای کریمی کہ از خزانۂ غیب　　گبر و ترسا وظیفہ خور داری(۱۶)
دوستان را کجا کنی محروم　　تو کہ با دشمنان نظر داری

لیکن اس کے برعکس گلستان کے آٹھویں باب میں وہ آزاد منشانہ گفتگو اور مسلمان اور یہودی کی آپس میں مناقشے کے قضیے کو غیر جانبدارانہ طریقے سے دیکھتا ہے اور کسی کی بے جا حمایت نہیں کرتا۔ گویا سعدی یہاں مولانا روم کا یہ شعر گنگناتے نظر آتے ہیں:

چون کہ بی رنگی اسیر رنگ شد
موسیٰ ای با موسی ای در جنگ شد

☆☆☆

یکی یھود و مسلمان نزاع می کردند　　چنان کہ خندہ گرفت از حدیث ایشانم
بہ طیرہ گفت مسلمان گرین قبالۂ من　　درست نیست خدایا یھود میرانم
یھود گفت بہ تورات می خورم سوگند　　وگر خلاف کنم ھمچو تو مسلمانم(۱۷)
گر از بسیط زمین عقل منعدم گردد　　بہ خود گمان نبرد ھیچ کس کہ نادانم

قطع نظر ان چند مثالوں کے جس چیز نے سعدی کو بقا و دوام بخشا وہ نہ صرف یہ سخت گیری اور حبس و اختناق کے دور میں اس کی آزاد اندیشی تھی بلکہ یہ اس کا بلند فکر تھا جو

Marfat.com

ہمیشہ بغیر قید و شرط اور تعلقات کے بند اسارت سے آزاد انسان کو مخاطب قرار دیتا ہے۔

سعدی کی انسانیت سے مراد وہی روح لطیف ہے جس نے یوم الست میں خداوند تعالیٰ سے پیمان باندھا اور درگاہ ایزدی کا خاص اور مقرب بن گیا۔ وہ روح جو بدن کی زندان میں قید ہوگیا اور دنیا کے زرق و برق اور گلیمر میں اپنے صفا کو بھول گیا ہے اور اب آزاد اندیشی کے مقام پر سعدی کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اس غیبی لطیف روح کی اُسے یاد دلائے جس پر تمام آسمانی شریعتوں اور ادیان کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس موضوع کی تصدیق کے لیے نظامی عروضی کے چہار مقالے سے سند لاتے ہیں کیونکہ وہ بھی دین کی اصالت اور بنیاد کو شفقت اور انسانیت پر استوار سمجھتا ہے:

کہا جاتا ہے کہ سلطان یمین الدولہ محمود نے ایک دن ماوراء النہر میں ایلک خان کے لیے بذریعہ ایلچی ایک خط بھیجا جس میں لکھا ہوا تھا کہ خدا نے فرمایا ہے" ان اکرمکم عنداللہ اتقکم " پس ہم یہ چاہتے ہیں کہ ماوراء النہر میں حضرت خاقان کے ائمہ جماعات اور سرزمین مشرق کے علما اور فضلا ضروریات (دین) سے متعلق اتنی وضاحت فرمائیں کہ: نبوت کیا ہے؟ ولایت کیا ہے؟ دین کیا ہے؟ عدل کیا ہے؟ اسلام کیا ہے؟ منکر سے نہی کرنا کیا ہے؟ صراط کیا ہے؟ میزان کیا ہے؟ رحم کیا ہے؟ شفقت کیا ہے؟ عدل کیا ہے؟ فضل کیا ہے؟ جب خط ایلک خان کو پہنچا اور وہ اس کے مندرجات سے آگاہ ہوا تو اس نے ماوراء النہر کے ائمہ کو مختلف شہروں سے کہلا بھیجا اور ان سے اس سلسلے میں مشورہ کیا اور ائمہ میں سے بعض بزرگ اور عظیم شخصیات نے فیصلہ کیا کہ ان موضوعات میں سے ہر ایک پر ایک ایک باب لکھیں اور اسے کتابی شکل دے دیں اور کتاب کے متن میں ان سوالوں کے جوابات دیے جائیں اور اس کام کے لیے چار ماہ کی مہلت چاہی، یہاں تک کہ محمد بن عبدہ الکاتب، جو ایلک خان کا معتمد (سیکرٹری) تھا اور جسے علم میں عمیق دسترس اور فضل میں کمال اور شعر و ادب میں تبحر حاصل تھا، اس نے کہا میں ان سوالات کا دو کلموں میں جواب دیے دیتا ہوں جسے عالم اسلام کے فضلا اور مشرق کے فاضل تر افراد راضی اور پسند کریں گے۔ چنانچہ اس نے مسائل کے آخر میں فتویٰ کے مطابق لکھ دیا "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم التعظیم لامر اللہ و الشفقۃ علی خلق اللہ ۔" ائمہ ماوراء النہر انگشت بدندان رہ گئے اور محو حیرت ہو کر کہنے لگے یہ ہے(۱۸) مکمل جواب اور حیرت انگیز لفظ(۱۹) یعنی تمام سوالات کا انہی دو جملوں میں جواب دیا گیا ہے کہ اصول دین فرمان الٰہی کی تعظیم ہے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تعظیم و احترام احکام پر عمل سے ہوتا ہے اور ان کی حرمت اس وقت تک قائم رہتی ہے جب

Marfat.com

تک کہ ان کی مخالفت نہ کی جائے اور دوسری بات مخلوق خدا سے مہربانی کرنا ہے۔ اسی سبب سے سعدی بھی کہتا ہے:

طریقت بجز خدمت خلق نیست — بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست(۲۰)
کرا دانش و وجود و تقوی نبود — بہ صورت درش ہیچ معنی نبود(۲۱)
بہ طاعت بنہ چہرہ بر آستان — کہ این است سر جادہ می راستان(۲۲)

اس بنا پر تمام کی تمام گلستان و بوستان ایسی حکایات اور داستانوں سے پر ہے جن کا ہدف انسان کو اپنی گم کردہ انسانی راہ کی طرف راہنمائی کرنا ہے اور سعدی کی مخاطب انسان کی حقیقی اور اصلی انسانیت بھی ہے۔ ہر قسم کی فرقہ پرستی اور تفرقے سے علیحدگی اس کے نزدیک عمل کی حقیقی روح اور نیکی ہے جس کی حوصلہ افزائی اور تکریم کی جانی چاہیے چاہے اس پر کاربند حاتم طائی کی بیٹی کی طرح کا کوئی غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو:

شنیدم کہ طی(۲۳) در زمان رسول — نکردند منشور ایمان قبول
فرستاد لشکر بشیر نذیر — گرفتند از ایشان گروہی اسیر
بفرمود کشتن بہ شمشیر کین — کہ ناپاک بودند و ناپاک دین
زنی گفت من دختر حاتم — بخواہید از این نامور حاکم
کرم کن بجای من ای محترم — کہ مولای من بود اہل کرم
بہ فرمان پیغمبر نیک رای — گشادند زنجیرش از دست و پای
در آن قوم باقی نہادند تیغ — کہ رانند سیلاب خون بی دریغ
بہ زاری بہ شمشیر زن گفت زن — مرا نیز با جملہ گردن بزن
مروت نبینم رہایی ز بند — بہ تنہا و یارانم اندر کمند
ہمی گفت و گریان بر اخوان طی — بہ سمع رسول آمد آواز وی(۲۴)
ببخشیدش آن قوم و دیگر عطا — کہ ہرگز نکرد اصل و گوہر خطا

اسی قسم کی دوسری تمام حکایات دی ہیں خاص طور پر بوستان میں باب "احسان" اور بوستان و گلستان کے دوسرے ابواب میں عام طور پر۔ اس کے علاوہ مثنویات مجالس اور مواعظ سعدی میں بھی ایسے مطالب ملتے ہیں جن کا مقصد اصل وجود انسانی کی بیداری ہے:

عدل و انصاف و راستی باید — ور خزینہ تہی بود شاید
فکند ہرگز اصل دانش و داد — دل مردم خراب و گنج آباد

Marfat.com

پادشاهی که یار درویش است　　پاسبان ممالک خویش است

یا

نخست اندیشه کن آنگاه گفتار　　که نا محکم بود بی اصل، دیوار

چو بد کردی مشو ایمن ز بدگوی　　که بد را کس نخواهد گفت نیکوی[۲۵]

اور آخر میں یہ بات پوری جرأت سے کہی جاسکتی ہے کہ سعدی کی عظیم روح اتنی وسیع اور عالم گیر ہے کہ سب حقیقی اور نامور عرفا کی طرح یہ دشمنی اور تفرقہ کو ایک طرف پھینک دیتی اور ساری کائنات جتنی وسعت اختیار کر لیتی ہے۔ جیسے کہ وہ خود کہتا ہے:

به جهاں خرم از آنم که جهان خرم از اوست　　عاشقم برهمه عالم که همه عالم از اوست

سعدی کسی خاص مکتب و آئین سے صرف نظر ساری کائنات سے عشق کرتا ہے چونکہ وہ ساری کائنات کو خداوند کریم کی ذات احدیت کا جلوہ اور اس کی تجلی سمجھتا ہے۔

ترجمہ: جاوید اقبال قزلباش

منابع

۱۔مقالاتی درباره ی زندگی و شعر سعدی، دکتر بدیع الله دبیری نژاد، ص ۱۷۸

۲۔حکمت سعدی، کیخسرو هخامنشی، ص ۲۹۔۲۶

۳۔سعدی، ضیاء موحد، ص، ۵۷۔۵۲

۴۔مقالاتی درباره ی زندگی و شعر سعدی، مجید یکتایی، ص ۲۰۳۔۲۰۲

۵۔محمد علی فروغی، کلیات سعدی،، ص ۷۷

۶۔ ایضاً، ص ۴۲

۷۔ایضاً، ص ۲۰۲۔۲۰۱

۸۔مقالاتی درباره ی زندگی و شعر سعدی، ص ۱۸۶۔۱۸۵

۹۔حکمت سعدی، ۵۸

۱۰۔کلیات سعدی، ص ۴۷

۱۱۔بوستان، تصحیح و توضیح غلام حسین یوسفی، ص ۸۱۔۸۰

۱۲۔کلیات سعدی، ص ۸۵

۱۳۔ایضاً، ص ۱۰۸

۱۴۔کلیات، ص ۱۲۴

Marfat.com

۱۵۔ایضاً، ص ۲۸

۱۶۔ایضاً، ص ۲۸

۱۷۔چهار مقاله، ص ۴۱۔۴۰

۱۸۔بوستان، بیت ۵۴۳

۱۹۔۔ایضاً، بیت ۱۱۲۴

۲۰۔ایضاً، بیت ۱۹۸

۲۱۔قبیلہ طی جس سے حاتم طائی جیسی ممتاز شخصیت منسوب تھی

۲۲۔بوستان، ابیات ۱۴۵۸۔۱۴۲۸

۲۳۔کلیات سعدی، ص ۸۴۷

☆☆☆

Marfat.com

جشن نوروز اور وصف بہار

فارسی شاعری کے آئینے میں

ڈاکٹر رشیدہ حسن☆

نوروز، زرتشتیوں کی اہم ترین تقریب اور ایرانیوں کا اہم ترین قومی تہوار ہے جو بہت قدیم زمانے سے اس سرزمین میں رائج ہے۔ اگرچہ زرتشتیوں کی مقدس کتاب ''اوستا'' میں نوروز کا ذکر نہیں کیا گیا، لیکن پہلوی زبان کی بعض مذہبی کتابوں میں نوروز اور قدیم ایرانی رسوم کا ذکر موجود ہے۔(۱) ''فرہنگ معین'' کے مطابق، ابتدائی عہد کے خلفا نوروز کو اہمیت نہیں دیتے تھے، لیکن بعد میں اموی خلفا نے اپنی معیشت کی پیشرفت اور اقتصادیات میں اضافے کے لیے نوروز کو نئے سرے سے رواج دیا۔ پہلا شخص جس نے نوروز میں تحائف کے لین دین کو رواج دیا، حجاج بن یوسف تھا۔ بعد میں مذکورہ خلفا نے اس رسم کو منسوخ قرار دیا کیونکہ عام لوگوں کے لیے یہ رسم کافی مہنگی تھی، لیکن اس تمام عرصے کے دوران ایرانی اس تہوار کو مناتے رہے۔ ابومسلم خراسانی کی تحریک خلفائے بنی عباس کے برسر اقتدار آنے کے بعد، مخصوصاً برمکی اور دوسرے ایرانی وزرا کے اقتدار کے وقت، طاہریوں اور صفاریوں کی حکومتوں کے دوران ایرانی رسوم اور تہواروں کو نئے سرے سے رونق ملی۔ آثار و قرائن سے پتا چلتا ہے کہ دین اسلام کی آمد کے بعد یہ جشن تواتر سے منایا جاتا رہا ہے البتہ عہد بہ عہد اس تہوار میں کچھ تبدیلیاں ضرور رونما ہوتی رہیں۔(۲)

عرب اور ایرانی مصنفین نے اس تہوار کے آغاز کو پیشدادی بادشاہ جمشید سے منسوب کیا ہے بلکہ بعض تو اس کے سوابق کو تخلیق کائنات کے زمانے تک لے گئے ہیں۔(۳) بعض مصنفین کا کہنا ہے کہ حضرت سلیمانؑ ہی کا فارسی نام جمشید تھا۔ اس لحاظ سے جشن نوروز کی قدامت حضرت سلیمانؑ کے عہد تک جا پہنچتی ہے اور عام لوگوں میں یہ جشن ''نوروز جمشیدی''

☆ شعبہ فارسی، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

Marfat.com

کے نام سے بھی معروف ہے۔ اس دن کو عید کے طور پر منانے کا سبب یہ تھا کہ اس دن جمشید بادشاہ کو دیووں پر غلبہ حاصل ہوا تھا۔ بعض روایات کے مطابق اس تہوار کا آغاز پانچ سو سال قبل مسیح میں ہوا۔ بہرحال یہ جشن چونکہ اب تک کسی نہ کسی شکل میں موسم بہار ہی میں منایا جاتا رہا ہے اس لیے اسے ''جشن بہاراں'' بھی کہتے ہیں۔

ایرانی کیلنڈر کے مطابق فروردین، اردیبہشت، اور خرداد (۲۱ مارچ سے ۲۰ جون تک) موسم بہار کے مہینے ہیں جو کہ افغانستان میں جاری سالنامے کے مطابق حمل، ثور اور جوزا کہلاتے ہیں۔ فروردین یا حمل کی پہلی تاریخ موسم بہار کا پہلا دن ہوتا ہے اور یہی نوروز ہے۔نوروز کو عید کائنات بھی کہا گیا ہے کیونکہ بعض عرفا کے بقول یہ دن انسانوں کے علاوہ حیوانات، نباتات اور جمادات کی بھی عید ہے۔(۴) اسی دن گویا زمین کروٹ بدلتی ہے اور سبزہ و نباتات نیند سے بیدار ہوتے ہیں، موسم معتدل اور روز و شب برابر ہوجاتے ہیں، درختوں میں کونپلیں پھوٹتی ہیں اور حیوانات میں بھی افزائش نسل کے یہی دن ہیں۔ کانوں میں معدنیات اور قیمتی پتھر اوج کمال کو پہنچتے ہیں اور آب نیساں کے قطرے، سمندروں کے ساحل پر منتظر سیپوں کے دامن کو سُچے موتیوں سے بھر دیتے ہیں۔

جب ایرانیوں اور ترکوں کو دین اسلام کی قبولیت کا شرف حاصل ہوا تو اس تہوار نے مذہبی رنگ اختیار کرلیا۔ اس روز کی مخصوص دعائیں اور اوراد دینی کتب میں رقم ہوئیں، مثلاً روز نوروز کو تحویل سال کے وقت یہ دعا پڑھی جاتی ہے:

یا مقلّب القلوب والابصار

یا مدبر اللیل و النہار

یا محوّل الحول والاحوال

حوّل حالنا الی احسن الحال

یعنی اے دلوں اور نگاہوں میں انقلاب لانے والے، اے گردش لیل و نہار کو جاری رکھنے والے، اے تحول سال اور تبدیلی حالات پر قادر ذات! ہمارے حالات کو بہترین حالات میں بدل دے۔

گویا ظہور اسلام کے بعد نہ صرف یہ کہ نوروز کے مراسم جاری رہے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ بہتر طریقے سے انجام پانے لگے۔ نماز، دعا اور تلاوت قرآن کو بھی اعمال نوروز میں نمایاں جگہ حاصل ہوگئی۔ کہتے ہیں امام ابوحنیفہ کے والد بزرگوار جو ایرانی الاصل تھے، نوروز کے دن حضرت علیؑ کے لیے مٹھائی لائے۔ آپؑ نے استفسار کیا ''یہ کیا ہے؟'' انہوں نے جواب

Marfat.com

دیا، ''یہ نوروز کی شیرینی ہے۔'' حضرت علیؑ نے از راہِ تفنن فرمایا ''ہر روز کو ہمارے لیے نوروز کرو'' اور وہ مٹھائی اپنے اصحابؓ میں تقسیم فرمائی۔

نوروز صرف ایران اور ایرانیوں تک محدود نہیں بلکہ پاکستان، افغانستان، ہندوستان، خلیج فارس اور خاص طور پر روسی تسلط سے نو آزاد شدہ ریاستیں اس دن کو بڑی شادمانی اور جوش خروش کے ساتھ مناتی ہیں۔ نوروز کی رسمیں تقریباً ہر جگہ (معمولی تبدیلی کے ساتھ) ایک سی ہیں۔ مثلاً ''گہنبار ششم'' سے کچھ دن پہلے جو کہ شمسی سال کے اختتام سے پانچ روز قبل واقع ہوتا ہے کچھ فصلوں کے تھوڑے سے دانے مثلاً گندم، جو، مسور، ماش وغیرہ کو کم گہرے برتن میں کاشت کرتے ہیں تا کہ عید کی رات گھر کو سبزے سے آراستہ کیا جاسکے۔ گہنبار ششم کے آغاز سے پہلے ہی گھر کی ہر چیز تبدیل کردی جاتی ہے۔ تمام گھر کو اندر باہر سے دھویا جاتا ہے۔ اس عمل کا مقصد آلودگی، گندگی، نجاست و نحوست سے تمام گھر کو پاک کرنا ہوتا ہے۔(۵)

عید کے دن تمام افراد خانوادہ بہترین نیا لباس پہنتے ہیں اور تحویل سال کے لمحے، سفرۂ نوروزی (سفرۂ ہفت سین) کے گرد جمع ہوجاتے ہیں اور عین تحویل سال کے وقت مذکورہ بالا دعا سے نئے شمسی سال کا استقبال کرتے ہیں۔ سفرۂ ہفت سین ان سات کھانے کی اشیا پر مشتمل ہوتا ہے جن کا نام 'س' سے شروع ہوتا ہے۔ مثلاً سماق، سیر (لہسن)، سکہ، سرکہ، سیب، سمنو (گیہوں کے خوشوں سے تیار کیا ہوا حلوہ) سنجد (تل) اور سپند (کالا دانہ جس سے جادو کے توڑ کے لیے دھونی دی جاتی ہے)۔ وہ سبزہ جو مختلف دانوں سے تیار کیا گیا تھا وہ بھی دسترخوان پر رکھ دیا جاتا ہے۔ دین مبین اسلام کے آنے کے بعد مصحف (قرآن) بھی سفرۂ نوروزی میں شامل ہوگیا جو کہ برکت اور تائید الٰہی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ جونہی تحویل سال کا عمل انجام پاتا ہے سب ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں اور ایرانی رسم کے مطابق ایک دوسرے کا منہ چومتے ہیں جسے ایرانی اصطلاح میں ''روبوسی'' کہا جاتا ہے۔ صوبہ خراسان میں خاص طور پر دیہات میں رواج ہے کہ تحول سال سے دو تین دن پہلے بہت سی روٹیاں پکاتے ہیں کیونکہ خراسانی معتقد ہیں کہ تحویل سال کے وقت ہر گھر کا نعمت خانہ روٹیوں سے معمور ہونا چاہیے۔(٦)

عید کے دوران ایک دوسرے سے میل ملاقات کے لیے جاتے ہیں۔ عید کے پہلے دن خاندان کا معمر ترین فرد گھر ہی پر ٹھہرتا ہے تاکہ سب اس سے ملنے کے لیے آئیں، اور اسے نوروز کی مبارک باد دیں۔ نوروز کے دنوں میں خاص مٹھائیوں اور غذاؤں سے مہمانوں کی خاطر تواضع کی جاتی ہے۔

دوسرے عوامی طبقات کی طرح اس خوشی کے موقع کی مناسبت سے شاعروں نے بھی

Marfat.com

اپنے اپنے انداز میں اپنے قلبی احساسات کو شعر کے قالب میں ڈھالا ہے۔ ان میں سے بعض کے رشحات قلم کا جو نوروز اور بہار کی توصیف میں قصیدہ سرا ہوئے ہیں ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔

ساسانی دور کا شاعر، رودکی جسے فارسی شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے، اور جو سخن پروری میں یگانۂ روزگار تھا، بہار خرم، کے عنوان سے آمد بہار پر یوں نغمہ سرا ہے:

آمد بہار خرم، با رنگ و بوی طیب
با صد ہزار نزہت و آرایش عجیب
شاید کہ مرد پیر بدینگہ جوان شود
گیتی بدیل یافت، شباب از پی شیب(۷)

اس قصیدہ میں جو اس کے دیوان کے ماتھے کا جھومر ہے رودکی کہتا ہے:

چرخ بزرگوار یکی لشکری بکرد
لشکرش ابر تیرہ و باد صبا نقیب
نفاط برق روشن و تندرش طبل زن
دیدم ہزار خیل و ندیدم چنین مہیب(۸)

ہوشنگ ابتہاج (سایہ)، منکسرالمزاج، متواضع اور دھیمے مزاج کے معاصر شاعر ہیں۔ وہ عام ڈگر سے ہٹ کر بڑے دل انگیز شعر کہتے ہیں۔ بہار کا ذکر کرتے ہوئے کچھ دکھی دکھائی دیتے ہیں:

بہار آمد گل و نسرین نیاورد نسیمی بوی فروردین نیاورد
پرستو آمد و از گل خبر نیست چرا گل با پرستو ہمسفر نیست
چرا می نالد ابر برق در چشم چہ می گوید؟ چنین زار از سر خشم
چرا خون می چکد از شاخۂ گل چہ پیش آمد، کجا شد بانگ بلبل(۹)

پرانے زمانے میں چونکہ بادشاہ کی تاجپوشی کی رسم نوروز ہی کے دن انجام پذیر ہوتی تھی۔ اس پرشکوہ اور مجلل رسم سے نوروز کی شان اور بھی دوبالا ہوجاتی تھی۔ بہت سے شاعروں نے وصف بہار اور مدح شاہ میں قصیدے کہے ہیں۔ شاہ عباس کبیر کے ہمعصر شاعر ابو طالب کلیم کاشانی جو بعد میں شاہجہان کے دربار میں ملک الشعرا کے مقام تک پہنچے، بہار کی تعریف میں کہتے ہیں:

دگر نوروز عالم را جوان کرد گلستان را بہ کام بلبلان کرد
فروتن گشت شاخ از بار، امّا بہ مردم باغبان را سرگران کرد

Marfat.com

شکوفہ پیر زاد از مادر شاخ　　عجب تر این کہ بستان را جوان کرد
بہشت بی عمل دریاب، کامروز　　چمن را ابر چون باغ جنان کرد(۱۰)

یہی شاعر ایک اور قصیدے میں بہار کی تعریف یوں کرتا ہے:

چمن تمام فرح شد ز انبساط بہار
چہ بادہ در سرو چہ گل بہ گوشۂ دستار
کشیدہ وسمہ بر ابروی موجہ سبزۂ تر
نہادہ پرتوِ گل ھا چو چشم عینک وار(۱۱)

ایک اور جگہ آمد نوروز پر وہ ان جذبات کا اظہار کرتا ہے:

چنان ز مقدم نوروز شد طراوت عام
کہ سبز گشت ہم از آب تیغ چوب نیام
اگر ز عالم بالا نوید رحمت نیست
بہ خاک این ہمہ باران چہ می برد پیغام
زمانہ از رقم سبزہ بر صحیفۂ خاک
سند نوشتہ کہ از ابر می ستاندوام
چمن زبیک نم باران رساند سبزہ بابر
بہ سرعتی کہ کسی پس دھد جواب سلام
ز رقص برق بود ابر، گرم ذر پاشی
نہ رقص او شود آخر، نہ این نثار تمام
ز حسن تربیت برشگال نیست عجیب
کہ خار پشت شود، ہچو گل حریر اندام

ایک اور مقام پر نوروز اور ماہ شوال کے یکساں وقوع پذیر ہونے پر، کلیم کاشانی اس مبارک ساعت کا یوں خیر مقدم کرتا ہے:

خجستہ مقدم نوروز و غرہ شوال　　فشاندہ اند چہ گل ہای عیش بر سر سال
بہ بزم عیش دو جام است در کف ساقی　　ضرورتست بلی، این دو عید را دو ھلال (۱۲)

ادیب الممالک فراہانی، جو بلاشبہ اور بغیر کسی استثنا کے شعر و شاعری میں اپنے تمام ہم عصر شعرا میں تقدم اور امتیاز کے حامل ہیں اور تجدید حیات ادبی کے دوران جس کا آغاز نشاط اصفہانی سے اور اختتام ادیب الملک پر ہوتا ہے، زمانۂ انقلاب مشروطیت کے شاعر ہیں،

Marfat.com

عیدالاضحیٰ، عید غدیر، نوروز اور جمعہ کے ایک ساتھ رونما ہونے پر یوں ہدیہ تہنیت پیش کرتے ہیں:

آمد نغز و هژیر و فرخ و فیروز   اضحیٰ و عید غدیر و جمعه و نوروز
گشته برابر، چهار عید مبارک   آمده از پی چهار طالع فیروز
چهار نوید امید و مژدهٔ شادی   چهار شب جانفزا و صبح دل افروز
بیشتر از پارشد، غنیمت امسال   خوبتر از دی رسید، نعمت امروز (۱۳)

مسعود سعد سلمان لاہوری اپنی حبسیہ شاعری کے باعث معروف ہیں، بہار کی توصیف میں کہتے ہیں:

به نوبهاران غوّاص گشت ابر هوا   که می بر آرد، ناسفته لؤلؤی لالا
به لؤلؤ ابر بیاراست روی صحرا را   مگر نشاط کند شهریار، زی صحرا
مگر که راغ سپهر است و نرگسان انجم   مگر که باغ بهشت است و گلبنان حورا
زمین به خوبی چون روی دلبر گلرخ   هوا به خوشی، چون طبع مردم دانا (۱۴)

اسی شاعر نے ایک اور قصیدے میں، جو کہ سلطان ابراہیم بن مسعود کی شان میں کہا، بہار کا یوں استقبال کیا ہے:

ز فردوس با زینت آمد بهاری   چو زیبا عروسی و تازه نگاری (۱۵)
بگسترده بر کوه و بردشت،فرشی   کش از سبزه پود است وز لاله تاری

پھر وہ عمید الملک ابوالقاسم کی مدح اور نوروز کے وصف میں یوں سخن سرا ہوتا ہے:

روز نوروز و ماه فروردین   آمدند ای عجب، ز خلد برین
تا جهانست گلبنانرا، آن   حله ها بافت باغها را این
باد فرخنده بر عمید اجل   خاصه پادشاه روی زمین (۱۶)

سعدی شیرازی ایران کا ہر دل عزیز شاعر اور عالمی شہرت کا حامل حکیم سخن، بادِ نوروزی کو دمِ عیسیٰ سے تشبیہ دیتا ہے:

بهار آمد که هر ساعت رود خاطر به بستانی   به غلغل در سماع آیند هر مرغی به دستانی
دمِ عیسی است پنداری نسیم باد نوروزی   که خاک مرده باز آید در او روحی و ریحانی

آپ ایک اور مقام پر وصف نوروز میں یوں لب کشا ہیں:

باد بهاری وزید از طرف مرغزار   باز به گردون رسید ناله هر مرغ زار
سرو شد افراخته، کار چمن ساخته   نعره زنان فاخته، بر سر بید و چنار

آپ اہل دانش وخرد کی نگاہ میں، سبز درختوں کے ہر پتے کو، خالق کائنات کی معرفت اور

Marfat.com

پہچان کی علامت قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

برگِ درختانِ سبز، در نظرِ ہوشیار　　ہر ورقی دفتریست، معرفتِ کردگار
وقت بہار است خیز، تا بہ تماشا رویم　　تکیہ بر ایام نیست، تا دگر آید بہار(۱۷)

سعدی نوروز کی تعریف میں مندرجہ ذیل اشعار کے پیرائے میں اپنی خوشی اور سرور کا یوں اظہار کرتے ہیں:

بر آمد باد صبح و بوی نوروز　　بہ کام دوستان ▪ بخت پیروز
مبارکبادت این سال و ہمہ سال　　ہمایون بادت این روز و ہمہ روز(۱۸)

سعدی بہار کی رات کو شب قدر اور صبح کو نوروز سے تعبیر کرتے ہیں:

مبارکتر شب و خرمترین روز　　بہ استقبالم آمد بخت پیروز
دُھل زن گو، دو نوبت زن بشارت　　کہ دوشم قدر بود، امروز پیروز(۱۹)

ناصر خسرو قبادیانی پانچویں صدی ہجری کے معروف شاعر، قدرت کی صناعی کی ستائش میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ وصف طبیعت میں ایک چیرہ دست اور ماہر سخن سرا ہیں۔ خیال کی باریکیاں، اور صورت بندیاں ناصر خسرو کی شاعری میں بے مثل ہیں۔ آپ شعر و ادب کی بہت سی جہتوں سے اپنے ماقبل شعرا پر فوقیت رکھتے ہیں۔ سال نو یعنی بہار کو یوں خوش آمدید کہتے ہیں:

جہان را دگرگونہ شد کار و بارش　　برو مہربان گشت، صورت نگارش
بہ دیبا بپوشید، نوروز رویش　　بہ لؤلؤ بشست ابر، گردِ عذارش
بہ نیسان ھمی قُرطہ سبز پوشید　　درختی کہ آبان برون کرد ازارش
گہی درّ بارد، گہی عذر خواھد　　ہمان ابر بدخوی، کافور بارش(۲۰)

آپ کہتے ہیں:

آمد بہار و نوبت سرما شد　　وین سالخوردہ گیتی، بُرنا شد
آب چو نیل برکہ اش میگون شد　　صحرای سیمگونش خضرا شد(۲۱)

پانچویں صدی ہجری کے ایک اور عظیم شاعر اور استاد سخن عنصری جو مزین قصاید اور لطیف غزلوں کے خالق ہیں فکر کی نزاکت، اور تازہ مضامین کو شعر میں یوں بیان کرتے ہیں کہ شعر عام قاری کی سوچ اور دسترس خیال سے ماورا قرار پاتا ہے۔ بہار اور نوروز کی ستائش میں آپ نے تشبیہات و استعارات کے استعمال میں جدت سے کام لیا ہے۔ کہتے ہیں:

باد نوروزی ھمی، در بوستان بتگر شود　　تا ز صُنعش ہر درختی لعبتی دیگر شود

Marfat.com

باغ ہمچون کلبہ بزاز پر دیبا شود　　باد ہمچون طبلۂ عطار، پر عنبر شود(۲۲)

خواجہ شمس الدین حافظ شیرازی کسی بھی دوسرے شاعر کی نسبت زندگی بسر کرنے کی حقیقی لذتوں کا ادراک رکھتے ہیں۔وہ بہت حساس ہیں اور زیست کے ذائقے سے بخوبی آشنا ہیں اور '' خوشتر زعیش وصحبت باغ و بہار'' سے بہتر کسی چیز کو نہیں گردانتے، آب زندگی، اور روضۂ ارم، کو'' طرف جویبار اور'' می خوشگوار'' میں تلاش کرتے ہیں۔ تمام تر درویش منشی اور فقر و بے نیازی کے باوجود، گل و نبیذ، سے دامن نہیں چھڑا سکتے۔ وہ حساس شاعر، جو زندگی کو سمجھتا ہے اور خوشی کے ہر لمحے کو جانچنے میں عجلت سے کام لیتا ہے، بہار کی آمد پر اس کے نازک دل میں کیا احساس ٹھاٹھیں مارتا ہے، ملاحظہ کیجیے:

ابر آذاری برآمد، باد نوروزی وزید　　وجہ می می خواہم و مطرب کہ می گوید رسید
شاهدان در جلوه و من شرمسار کیسہ ام　　بار عشق و مفلسی صعب است و می باید کشید(۲۳)

وہ کہتے ہیں:

خوش آمد گل و زان خوشتر نباشد　　کہ در دستت بجز ساغر نباشد
زمان خوشدلی دریاب، دریاب　　کہ دایم در صدف گوهر نباشد(۲۴)

وہ گل و نبید کو بہار کے ساتھ لازم و ملزوم گردانتے ہیں:

رسید مژدہ کہ آمد بہار و سبزہ دمید　　وظیفہ گر برسد، مصرفش گل است و نبید
صفیر مرغ برآمد، بط شراب کجاست　　فغان فتاد بہ بلبل، نقاب گل کہ درید(۲۵)

وہ خود جانتے ہیں کہ ایسے موسم میں کیا کام زیادہ ضروری ہے، کیا کرنا چاہیے؟ کہتے ہیں:

ساقیا، سایہ ابر است و بہار و لب جوی　　من نگویم کہ چہ کن، ار اهل دلی خود تو بگوی
پیشتر زان کہ شوی خاک در میکده ها　　یک دو روزی بسر اندر رہ میخانہ بپوی(۲۶)

ایک اور جگہ باد بہاری کے ساتھ یوں روبصحرا ہیں:

ھوس باد بهاری بہ سوی صحرا برد
باد بوی تو بیاورد و قرار از ما برد
هر کجا بود دلی چشم تو برد از راهش
نہ دل خستۂ بیمار مرا تنها برد

بہارِ توبہ شکن، کو اپنی قسم ٹوٹنے کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

بہ عزم توبہ سحر گفتم استخارہ کنم
بهار توبہ شکن می رسد، چہ چارہ کنم(۲۷)

Marfat.com

نظامی گنجوی بہار کے وصف میں فرماتے ہیں:

ساقی منشین فارغ، می دہ کہ بہار آمد
بخت از سر بی کاری ہم بر سر کار آمد
در باغ برومندی، یک دانہ وفا بکشتم
آن دانہ بشاخی شد، وان شاخ بہ بار آمد(۲۸)

خواتین شاعرات بھی وصف بہار میں مرد شاعروں سے کسی صورت پیچھے نہیں ہیں۔ قرۃ العین طاہرہ، فتح علی شاہ قاچار کے زمانے کے اہل فضل اور باذوق سخن سراؤں میں شمار ہوتی ہے۔ اس نے خوبصورت اشعار کہے ہیں اور طاہرہ تخلص کرتی تھی اس نے ادبی لحاظ سے نئے رنگ کی طرح ڈالی۔ وہ اپنی ایک مثنوی میں بہار کو یوں سراہتی ہے:

بیا ساقیا، شد جہان نو بہار　　زمین چون زمرد شدہ سبزہ زار
بہار است بشکفتہ شد گلستان　　بساطی بیفکن تو در بوستان(۲۹)

شمسی حایری، ایک اور خاتون شاعرہ، قصیدۂ بہاریہ میں یوں سخن سرا ہوتی ہے:

شد فصل بہار و شدہ خرم ہمہ آفاق　　گردیدہ بہ گل، بلبل دلخون شدہ الحاق
یارا، شدہ عشاق ہمہ طاقتشان طاق　　رفت از کف ما در رہ عشق تو دل و دین(۳۰)

ماہ منظر سواد کوہی کے اشعار ہفتہ نامہ **اطلاعات بانوان** میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ وہ بہار کا استقبال یوں کرتی ہیں:

بلبل نغمہ سرا باز بہ گلزار آمد　　بوسہ بر گل زد و مستانہ بدیدار آید
مژدہ عیش و طرب می دھدت مرغ چمن　　چون گل و سبزہ بروئید و پدیدار آمد
منظر از ھلھلہ و شادی و مرغان چمن　　نغمہ ای خوش بدل آورد و بگفتار آمد(۳۱)

ایک اور جدید شاعرہ مژگان کے شعر بھی **اطلاعات بانوان** (تہران) کی زینت بنتے رہے ہیں۔ اس کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

بہار آمد و تازہ گردید جان　　شدہ غرق گل و بار دیگر جہان
چمن سبز و خرم چو فرش بھشت　　گشودہ بہ ہر سوی مرغی دھان(۳۲)

فروغ فرخزاد کے نام سے کون واقف نہیں۔ وہ انسانی اور مخصوصاً نسوانی جذبات و احساسات کو بلا جھجک شعر کا رنگ دیتی ہیں۔ پاکستانی ادب کے ماتھے پر درخشاں ستارہ پروین شاکر کافی حد تک فروغ فرخزاد کی پیروی کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ فروغ بہار کے حوالے سے یوں لب کشا ہیں:

Marfat.com

خندید باغبان کہ سرانجام شد بہار　　　دیگر شگوفہ کردہ درختی کہ کاشتم
دختر شنید و گفت چہ حاصل ازین بہار　　　ای بس بہارہا، کہ بہاری نداشتم(۳۳)

دوشیزہ منیر طہٰ (منیر) ۱۳۰۹ ہجری شمسی میں تبریز میں پیدا ہوئیں۔ آپ سرکاری ملازم رہیں۔ آذربائیجان میں ریلوے کے محکمے میں ڈائریکٹر اکاؤنٹس تھیں۔ موسیقی کی رموز سے آشنا اور ستار نوازی میں بھی ماہر تھیں۔ وہ بہار میں محبوب کو روٹھنے نہیں دیتیں اور صلح کے لیے ہاتھ بڑھاتی ہیں۔

عید است و نوبہار و گل و بلبل، آشتی
در این مہ خجستہ، چرا قہر می کنی(۳۴)

پروانہ شالی کہتی ہیں:

بہار آمد جہان از نو جوان شد　　　گلستان ہمچو روی دلبران شد
زمستان طی شد و بلبل ز شادی　　　میان باغ و بستان نغمہ خوان شد(۳۵)

دوشیزہ ثریا امانپوری، ثریا تخلص، ۱۳۲۳ ہجری شمسی میں پیدا ہوئیں۔ خوبصورت شعر کہتی ہیں۔ وصف بہار میں یوں رقمطراز ہیں:

بوی بہار مست کند بلبل و مرا　　　ما ہر دو مست بوی بہار و نگار خویش
می گویم از نشاط و گل و سبزہ و چمن　　　از فرط وجد، دادہ ام از کف قرار خویش
از ہر طرف نظر فکنم، وہ، چہ دلکش است!　　　باید بہ عطر گل بزدایم غبار خویش(۳۶)

ایک اور معروف شاعرہ حمیدہ سپہری بہار کی توصیف یوں کرتی ہیں:

فصل گل و مل رسید و رونق گلزار　　　ہمچو زمرد شدہ است دامن کہسار
باد بھاری وزید و باغ جوان شد　　　بلبل بیدل زبان گشود بگفتار
لالہ بروئیدہ است از لب ہر جو　　　چون گل صوری نشستہ در بر دلدار
ہست زمرد نگار زیر درختان　　　بوی بنفشہ نمود طبلۂ عطار(۳۷)

وہ ایک اور مقام پر روز بہار کی ستائش ان الفاظ میں کرتی ہیں:

روز عیش و طرب و بادہ و جام است امروز
چون مرا دیدن آن بدر تمام است امروز
مژدگانی بدہ ای بلبل بی برگ و نوا
فرودین آمد و خم فصل بہار است امروز(۳۸)

Marfat.com

ایک اور شاعرہ غزال کی غزلیات اور اشعار بھی اطلاعات بانوان (تہران) میں باقاعدہ چھپتے رہے ہیں۔ وہ آفتاب بہار کے عنوان سے کہتی ہیں:

نازنینا، بیا تماشا کن آفتاب بہار می خندد
خندہ ای کن تو ھم کہ دل گوید چون بہاری نگار می خندد (۳۹)

مستورہ افغان، جن کا اصلی نام زبیدہ ہے اور مستورہ، تخلص کرتی ہیں وہ اعلیٰ حضرت امیر عبدالرحمٰن خان سابق امیر افغانستان کے منشی میرزا محمد امین خان کی صاحبزادی ہیں۔ مستورہ نے پشتو زبان میں بھی شعر کہے۔ وہ اپنے ایک قصیدہ میں یوں بہار کی توصیف کرتی ہیں:

ایدل بیا و منظرۂ نوبہار بین در گلستان بہ صنعت پروردگار بین
گاھی بکوہ و گاہ بہ صحرا نظر فکن گاھی فضای گلشن و گہہ چشمہ سار بین
سامان عیش و خرمی آمادہ در چمن جوش طراوتی بہ نسیم بہار بین
از نشۂ نسیم بہاران دلفریب چشم شکوفہ را بہ چمن پرخمار بین
گاھی بہ شاخ نسترن خوشنما نگر گاھی بہ ماہ نیم شب زندہ دار بین
باری بہ گلستان محبت گذارکن "مستورہ" را بہ عشق وطن سر دچار بین (۴۵)

میہن قریشی سیرجانی ۱۳۱۶ ہجری شمسی میں شہر کرمان میں پیدا ہوئیں۔ بچپن ہی سے حساس روح اور زود رنج طبیعت اور پردرد دل پایا تھا۔ معاشرتی محرومیاں، طبقاتی کشمکش اور درجہ بندیاں ان کی روح پر گہرے اثرات ڈالتیں۔ بہت چھوٹی عمر میں 'ترانہ بہاری' کہا، جو بہار جاوید کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

آمد بہار و گشت ز نو لالہ داغدار داماں دشت موج زد از لشکر بہار
رخت بہار خیمہ بزد بر دشت و بر دمن از پرنیان سبزہ و از نرگس خمار
فریاد شوق برکشد از طرف جوی گل آندم کہ می خرامد آن یار گلعذار
بلبل فدا کند سر و جان را بہ پای گل وانگہ بناز بوسہ کند گل بر او نثار

اور اب ملاحظہ کیجیے حضرت امام روح اللہ الموسوی الخمینیؒ کے چکیدہ ھای قلم۔ وہ عارف حق شناس، کوچۂ محبت الٰہی کے مقیم، عاشق خدا و رسولؐ، بہار کا کس خلوص اور صدق دل اور عارفانہ انداز میں استقبال کرتے ہیں:

باد بہار مژدہ دیدار یار داد شاید کہ جان بہ مقدم باد بہار داد
بلبل بہ شاخ سرو در آواز دلفریب بر دل نوید سرو قد گلعذار داد
ساقی بہ جام بادہ در آن عشوہ و دلال آرامشی بہ جانِ منِ بیقرار داد

Marfat.com

در بوستان عشق نشاید غمین نشست باید کہ جان بہ دست بتی میکسار داد

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

بہار شد در میخانہ باز باید کرد بہ سوی قبلہ عاشق نماز باید کرد
کنون کہ دست بدامان بوستان نرسد نظر بہ سروقدی سرفراز باید کرد

آپ کا ایک اور نمونہ کلام ملاحظہ ہو بہ عنوان 'قصیدہ بہاریہ انتظار':

آمد بہار و بوستان شد رشک فردوس برین
گلھا شگفتہ در چمن چون روی یار نازنین
گسترده باد جانفزا فرش زمرد بی ثمر
افشانده ابر پرعطا، بیرون ز حد دُرِ ثمین

امامؒ کے کلام میں عارفانہ روح کو بخوبی درک کیا جاسکتا ہے:

بہار آمد، جوانی را پس از پیری ز سرگیرم
کنار یار بنشینم، ز عمر خود ثمر گیرم
بہ گلشن باز گردم، با گل و بلبل درآمیزم
بطرف بوستان دلدار ھوش را بہ بر گیرم
خزان و زردی آنرا نھم در پشت سر روزی
کہ در گلزار جان از گلعذار خود خبر گیرم
پر و بالم کہ در دی از غم دلدار پرپر شد
بفروردین بیاد وصل دلبر بال و پر گیرم
بہ ھنگام خزان در این خراب آباد بنشستم
بہار آمد کہ بھر وصل او بار سفر گیرم
اگر ساقی ازان جامی کہ بر عشاق افشاند
بیفشاند بمستی از رخ او پردہ بر گیرم(۴۱)

آپ ایک اور مقام پر ابا صالح امام زمان کی مدح اور بہار کی توصیف میں فرماتے ہیں:

مژده فروردین ز نو بنمود گیتی را مسخر
حیشش از مغرب زمین بگرفت تا مشرق سراسر
رایتش افراشت پرچم زین مقرنس چرخ اخضر
گشت از فرمان وی، در خدمتش گردون مقرر

Marfat.com

بر جہان و ہرچہ اندر اوست، یکسر حکمران شد
کرد لشکر را از ابر تیرہ اردویی منظم
داد ہر یک را ز صرصر بادیہ پیمایی ادہم
برسران لشکر از خورشید نیر داد پرچم
رعد را فرمان حاضر باش دادی چون شہ جم
برق از بہر سلام عید نو، آتشفشان شد(۴۲)

منابع و مراجع

۱۔جشن نوروز و چہار شنبہ سوری و سیزدہ بدر، از انتشارات ادارۂ کل نگارش وزارت فرہنگ و ہنر

۲۔ایضاً

۳۔"نوروز عالم افروز" سید سبط حسن رضوی، مجلہ وحدت اسلامی، شمارہ ۹۴، فروری ۔ مارچ ۱۹۹۳، ص ۲۲،

۴۔ایضاً

۵۔دایرۃ المعارف سرزمین و مردم ایران ، تالیف عبدالحسین سعیدیان، از انتشارات علم و زندگی، تہران، ۱۳۶۳ ہجری شمسی

۶۔ایضاً، ص ۴۷۷

۷۔گنزینہ سخن پارسی ۲ ، رودکی، بکوشش دکتر خلیل خطیب رہبر، تہران، ۱۳۴۵ ہجری شمسی

۸۔ایضاً، ص ۱

۹۔"صدف"، تذکرہ سخنوران روز، دکتور صبور، کتابخانہ ابن سینا، ص، ۴۳۰

۱۰۔دیوان کلیم کاشانی، بہ تصحیح و مقدمہ پرتو بیضایی، کتابفروشی خیام، ۱۳۳۶ ہجری شمسی

۱۱۔ایضاً،ص ۴۸

۱۲۔ایضاً

۱۳۔دیوان ادیب الممالک فراہانی، باہتمام و تصحیح وحید دستگردی، مطبعہ ارمغان، ۱۳۱۲ ہجری شمسی

۱۴۔دیوان مسعود سعد سلمان، بتصحیح رشید یاسمی، موسسہ چاپ و انتشارات پیروز

۱۵۔ایضاً، ص ۴۹۵

۱۶۔ایضاً، ص ۳۶۶

۱۷۔کلیات سعدی، از محمد علی فروغی، انتشارات نگاہ

۱۸۔ایضاً

۱۹۔ایضاً

۲۰۔گزیدۂ اشعار ناصر خسرو از دکتر محمد جعفر شعار، شرکت چاپ و انتشارات علمی، ص ۱

۲۱۔دیوان اشعار حکیم ابو معین حمید الدین ناصر خسرو قبادیانی، با تصحیح حاجی سید نصر اللہ تقوی،

Marfat.com

بکوشش مہدی سہیلی، چاپخانہ گیلان، ۱۳۳۹ ہجری شمسی
۲۲۔گنج سخن، از دکتر ذبیح اللہ صفا، انتشارات ابن سینا، جلد اول، ص ۱۲۸
۲۳۔دیوان حافظ شیرازی، با مقدمہ علی دشتی، با استفادہ از نسخہ تصحیح شدہ علامہ محمد قزوینی و دکتر قاسم غنی وانجوی شیرازی
۲۴۔ایضاً، ص ۱۵۶
۲۵۔ایضاً، ص ۱۸۲
۲۶۔ایضاً، ص ۴۴۷
۲۷۔ایضاً
۲۸۔دیوان قصاید و غزلیات نظامی گنجوی، از سعید نفیسی، کتابفروشی فروغی
۲۹۔زنان سخنور، از علی اکبر مشیر سلیمی، شرکت چاپ و انتشارات کتاب ایران، جلد دوم
۳۰۔ایضاً
۳۱۔زنان سخنور، از علی اکبر مشیر سلیمی، شرکت چاپ و انتشارات کتاب ایران، جلد سوم
۳۲۔ایضاً
۳۳۔ایضاً، جلد دوم
۳۴۔ایضاً
۳۵۔ایضاً، جلد سوم
۳۶۔ایضاً
۳۷۔ایضاً
۳۸۔ایضاً
۳۹۔ایضاً
۴۰۔ایضاً
۴۱۔ایضاً
۴۲۔دیوان امام، سرودہ ھای حضرت امام خمینیؒ، موسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی

☆☆☆

Marfat.com

جام دُرک

مسز صوفیہ یوسف ☆

وہ مصنفین (شعرا) جو کسی بھی زبان میں ایک مثال کا درجہ رکھتے ہوں، کلاسیک کے زمرے میں آتے ہیں۔ ایسا ادب صرف ہمارا علمی و ادبی ورثہ ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ ہماری تاریخ و روایات کا بھی امین ہوتا ہے۔ Sainte Beuve کلاسیک کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
''کلاسیک ایک ایسے قدیم مصنف کو کہا جاتا ہے جو اپنے مخصوص اسلوب میں اپنا ثانی نہ رکھتا ہو اور اس کی یہ حیثیت مستند اور مسلّم ہو۔''(۱) ویسے تو کلاسیک کی کئی تشریحات ملتی ہیں، لیکن صرف مندرجہ بالا وصف کو مدنظر رکھا جائے تو ہمیں ہر زبان میں چند شخصیات ایسی ضرور ملیں گی جنھوں نے اپنی قوم کو آنے والے وقت کے لیے اس انداز میں سرخرو رکھا ہے کہ جب بھی کوئی ان کی طرف کچھ سیکھنے کے ارادے سے مڑ کر دیکھے تو کئی نئے زاویے اسے نظر آئیں گے۔ بالکل اسی طرح بلوچی زبان میں جام دُرک کا کردار بھی روشنی کے مینار کی طرح ہے جس سے تحقیق کے مسافر کو جلا ملتی رہے گی۔ اس مضمون کی معرفت ان کی شاعری میں موجود مختلف رنگوں کی جھلک آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔

بلوچ قوم کے ایران کے ساتھ شروع سے ہی گہرے روابط رہے ہیں اور جب دو قوموں کے درمیاں روابط پیدا ہوتے ہیں تو ان کے درمیان ان روابط کی بنیادی کڑی زبان ہی ہوتی ہے اور اس زبان کی بنیاد پر باقی سماجی اور ثقافتی رشتے خودبخود پیدا اور مضبوط ہوتے جاتے ہیں۔

فارسی زبان کو ہندوستان میں سرکاری زبان کی حیثیت حاصل رہی اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی پاکستان اور ہندوستان کے کتب خانے فارسی قلمی کتابوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ میرا تعلق صوبہ سندھ سے ہے اور بلوچ شاعری میرا موضوع ہے۔ اس لیے یہاں پر اتنا ضرور واضح کردوں کہ آج بھی سندھ اور بلوچستان کے قدیم سرکاری کتب خانے، خانقاہیں، مسجدیں

☆ شعبۂ اردو، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، خیر پور، سندھ

Marfat.com

اور کئی نامور شخصیات کے ذاتی کتب خانے فارسی قلمی کتب سے بھرے ہوئے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ فارسی یہاں کے لوگوں کے لیے بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ ویسے تو فارسی زبان کے علم و ادب سے ہندوستان کی تقریباً تمام زبانوں نے استفادہ کیا ہے لیکن جس طرح فارسی نے اردو کی پرورش کی ہے بالکل اسی انداز میں اس نے سندھی اور بلوچی زبان و ادب کے چمن کو بھی سیراب کیا ہے۔ قصیدہ، غزل، رباعی، مثنوی اور اس طرح تمام اصناف اردو، سندھی اور بلوچی میں زیادہ تر فارسی ادب کی دین ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی بلوچی شاعری میں ذخیرۂ الفاظ کے ساتھ فارسی تشبیہات و استعارات بھی روانی سے مستعمل ہیں۔

انہی روابط کا نتیجہ ہے کہ جام دُرک کی شاعری میں دیگر زبانوں (عربی، سندھی، اردو) کے ساتھ فارسی الفاظ، تشبیہات و استعارات کا خوبصورت استعمال دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے بلوچی اور فارسی کے میل سے نئی تراکیب بھی تخلیق کیں جن میں سے چند برائے نمونہ پیش خدمت ہیں:

دُرگال	شیریں مقال
دُر جمال	جلوہ بار
دُر چین	نغز گو
دُر حدیث	خوش گفتار وغیرہ

وہ اپنے اشعار میں فارسی کے الفاظ بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ ان کے کلام سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انہوں نے فارسی ادبیات کا گہرا مطالعہ کیا تھا مثلاً عین، پیکان، رعد، مہتاب، جبیں، قلب، بستر، ناوک، مژگان، لیل، صنوبر، طاؤس، داور وغیرہ (۲)

دنیا کی کسی بھی زبان میں اگر لفظوں کی ساخت کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ کسی انسان کے ارادے کی پیداوار ہوں یا خود ہی کسی وجہ سے بن گئے ہوں ہر حال میں انسانی ذہن اور قوت متخیلہ کا ان کی تشکیل میں اہم حصہ ہوتا ہے۔ (۳) اگر ہم اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے جام دُرک کے کلام کا مطالعہ کریں تو یہ واضح ہوگا کہ انہوں نے اپنے مافی الضمیر کو واضح کرنے کے لیے بلوچی زبان میں کئی نئے الفاظ کا اضافہ کیا، مثلاً: شہ جمال، موگونگ، نم کش، سیم بر، دُر جمال، سلطان پر وغیرہ۔ (۴)

انہوں نے بلوچستان کے مشرقی اور مغربی علاقوں میں بلوچی زبان کے بولے جانے والے مختلف لہجوں کے امتزاج سے زبان کو نہ صرف غیر معمولی وسعت دی بلکہ بلوچی کو ایک معیاری اور علمی زبان بنانے کی راہ ہموار کی۔

Marfat.com

جام دُرک لطیف و حسین احساسات کو بیان کرنے پر قدرت رکھتے تھے۔ ان کے ہاں حسن و عشق کا چرچا، قلبی واردات کا مذکور ہے۔ انہوں نے رنگ اور خوشبوؤں کی محفل سجائی اور شوق کو زبان دی۔ ان کا انداز بیان شوخ و دلکش اور اسلوب دل کو موہ لینے والا ہے۔ مثلاً قوس قزح سب نے دیکھی ہے مگر جام دُرک اسے کچھ اور طرح بیان کرتے ہیں:

ترجمہ: دکن کی سمت سے قوس قزح پھوٹی ہے اس کے پہلو میں بادل کا سفید ٹکڑا کیا عجب بہار دکھلاتا ہے ان پر محبوب کے ملبوس اور صورت کا گمان ہوتا ہے۔(۵)

جس طرح فارسی شاعری میں فردوسی، انوری اور سعدی کو پیغمبر سخن مانا گیا ہے اسی طرح کلاسیکی دور کے بلوچی شعرا میں جام دُرک کو عظیم شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔ بلوچی زبان کے محقق میر گل خان نصیر، جام دُرک کے بارے میں لکھتے ہیں:

بلوچی شاعری میں جام دُرک وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے بلوچی شاعری میں حسن و عشق کی تصوراتی کیفیتوں کو بیان کیا ہے۔ جام دُرک نے شاعری میں ہجر و فراق اور وصل و دید سے عاشق کے دل و دماغ پر طاری ہونے والی سرمدی کیفیت کو الفاظ کا جامہ پہنایا اور اسے خوبصورت انداز بیان اور سلاست و روانی سے پیش کیا ہے۔(۶)

جام دُرک ایک قادر الکلام اور بدیہہ گو شاعر تھے۔ انہوں نے بلوچی شاعری کو نیا آہنگ اور لب و لہجہ دینے کے ساتھ ساتھ ایک نئی جہت سے بھی متعارف کرایا۔ انہیں خود بھی اپنے کمال فن پر ناز تھا جس کا اظہار وہ اپنے کلام میں بھی کرتے ہیں:

ترجمہ: میں نے اشعار کہے ہیں
موتی پروئے ہیں
اور لعل جڑے ہیں۔(۷)

ایک مرتبہ جام دُرک کسی محفل میں شریک تھے محفل میں اصرار ہوا کہ آپ کچھ کلام سنائیں۔ جام دُرک نے اہل محفل کے اصرار پر فی البدیہہ کہنا شروع کردیا اور برجستہ ساٹھ اشعار پر مشتمل ایک طویل نظم کہہ ڈالی جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ترجمہ: آج میرے دل کی رفتار کا عجب حال ہے
(کیونکہ) وہ نگاہیں اٹھا کر میری جانب دیکھ رہی ہے
(وہ) زلفیں سنوار کر محو خرام ہے۔
محبت کی منزلیں طے کرنے کے لیے (شوق نے) مجھے اسپ راہوار بنا دیا ہے
دوست مہربان ہو تو میں دیوانہ نہیں
وہ خود ملتفت ہو تو (زہے نصیب) ورنہ میری کیا مجال

Marfat.com

رفیقو! جام کی فریاد سنو..(۸)

بلوچ شعرا کے ہاں یہ عام دستور تھا کہ وہ اپنے خیالات سیدھے سادے انداز میں بیان کرتے تھے۔ ان کے ہاں تشبیہ، استعارہ، اشارہ، کنایہ اور تخیل کی رنگ آمیزی کا رواج نہ تھا۔ کلاسیکل شعرا میں جام دُرک پہلے شاعر ہیں جنہوں نے تشبیہ و استعارہ کو نازک اور لطیف جذبات کے بھرپور اظہار کے لیے استعمال کیا۔ ان کے کلام میں رنگین تخیل کے نادر شاہکار ملتے ہیں۔ انہوں نے جذبات نگاری اور واردات عشق کے اظہار کے لیے ایک نیا اسلوب اپنایا اور جداگانہ انداز بیان اختیار کیا۔ وہ احساسات کو تشبیہ، تمثیل اور استعارہ کے ذریعے پیکر محسوس میں ڈھالنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ انہوں نے قدیم شاعری کے جملہ محاسن کو اپنانے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے تقاضوں کی بھی بھرپور عکاسی کی۔ وہ تشبیہات و استعارات کے معاملے میں بڑے جدت پسند تھے۔ مثال کے طور پر وہ ''دل'' کو سرکش حاکم سے تشبیہ دیتے ہیں جو کسی کی بات سننے پر آمادہ نہیں۔

ترجمہ: دل کو جتنا بھی قابو میں رکھنے کی کوشش کرتا ہوں
قسمیں دے کر باز رہنے کی ہدایت کرتا ہوں لیکن یہ حضرت دل حاکموں کی طرح قابو میں آنے کا نہیں ۔(۹)

اگر بلوچی زبان و ادب کی تاریخ کا اجمالی جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کا بڑا حصہ شاعری پر مشتمل ہے۔ یہ شاعری عام طور پر دو طرح کی ہے۔ رزمیہ شاعری اور عشقیہ داستانیں۔ یہ عشقیہ داستانیں بیشتر المیہ ہیں۔ ان داستانوں کی وساطت اور مجموعی فکری پس منظر کے ذریعے بھی بلوچی شاعری میں ہجر و فراق، درد و داغ، سوز و ساز در آتے ہیں۔ سوز و گداز کے اظہار کا جو لب و لہجہ اور انداز ہمیں جام دُرک کے ہاں ملتا ہے بلوچی زبان کی شاعری میں ملنا محال ہے۔ وہ فراق کے جانگداز لمحوں کی داستان کو بڑے ہی پرسوز انداز میں بیان کرتے ہیں:

ترجمہ: ہجر کی آگ شعلوں کی طرح جلا ڈالتی ہے۔
آدھی آدھی رات کو میں بے قرار ہو کر اٹھتا ہوں حسینوں کے صبر آزما ناز قیامت ڈھاتے ہیں کبھی ناپید کبھی فراواں..
کاش فراق کے غموں سے ستانے کا موقع مل سکے۔(۱۰)

اردو کے بڑے شاعر مرزا غالب اپنا حال دل لکھتے لکھتے تھک جاتے ہیں تو اپنی فگار انگلیاں اور خونچکاں خامہ محبوب کو دکھا کر اپنے حال زار سے آگاہ کرنے کا ارادہ کر لیتے ہیں:

Marfat.com

دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں انکو دکھلادوں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

اسی کیفیت کو جام دُرک اس طرح بیان کرتے ہیں:

ترجمہ: دل بھی پاگل ہے جو مجھ سے الجھتا ہے
یہ سنہری رنگت والے بیٹے کی طرح ضد کرتا ہے
ظالم ترک بادشاہ کی طرح زیادتی کرتا ہے
وہ غبار آلود بادلوں میں زنجیر آسا زلفوں
والی محبوبہ کا متلاشی ہے۔(۱۲)

''کوئے یار'' سے آنے والی ''نسیم سحر'' کو فارسی زبان کے شاعر حافظ شیرازی اس طرح بیان کرتے ہیں:

صبا وقت سحر بوئی ز کوی یار می آرد
دل شوریدۂ ما را دگر در کار می آرد(۱۳)

اسی نسیم سحر کو جام دُرک تسکین روح اور آرام جان کا سبب قرار دیتے ہیں:

ترجمہ: مرحبا نسیم سحر تو بن پوچھے بہشت کی مکیں ہے
کیونکہ تو محبوب کی جانب سے آئی ہے۔(۱۴)

ایک رومانی شاعر ہونے کے باوجود جام دُرک اخلاقی اقدار کی سربلندی کے بھی علمبردار ہیں۔وہ منکسر مزاجی، بردباری اور صبر کا درس اور قول کی پابندی اور استقامت پر زور دیتے ہیں۔

ترجمہ: بات جب منہ سے نکل جاتی ہے
تو وہ باہر پڑے ہوئے پتھر کی طرح ہوجاتی ہے
(قول) سنجیدہ اور وزنی ہوتا ہے جیسے پتھر کا بارگراں اور باد و باران اور طوفانوں سے بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹ سکتا۔(۱۵)

وحدت الوجود اور فلسفیانہ مسائل پر بحث بھی جام دُرک کے کلام میں ملتی ہے۔

ترجمہ: وہ خود ہی ظاہر بھی ہے اور باطن بھی
ازل سے ہر وقت اس کی ذات موجود ہے۔(۱۶)

وہ تکمیل ذات کے لیے ضبطِ نفس پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں:

Marfat.com

ترجمہ: زندگی دریائے موج در موج بہتی چلی جاتی ہے
(اس میں) کشتیوں کی آمد و رفت ہے
ہمارے اعمال ہی اس کشتی کے بادبان ہیں
ضبط نفس چپو کا کام دیتا ہے۔(۱۷)

جام دُرک مناظر قدرت کے عاشق تھے ان کے اشعار میں مہر و ماہ، ذرہ و خورشید، برق و شرر، شفق کی سرخی، افق کی لالی، ابرو باد، برف و باران، پھولوں کی رنگینی اور قوس قزح کے رنگوں کا بھرپور تذکرہ ملتا ہے۔ قوس قزح انہیں محبوب کے حسن کی یاد دلاتی ہے تو بجلی کی چمک میں انہیں محبوب کی مسکراہٹ نظر آتی ہے:

ترجمہ: رات بجلیاں مسکراتی ہوئی آئیں
جنہوں نے محبوب کی نشانیاں یاد دلائیں
ہم نے انہیں پھولوں کے لمس کی مانند محسوس کیا
جنوب کی جانب جو ایک دھنک ابھری ہے
اس کے آس پاس عجب رنگ کے بادل چھاتے ہیں
(ان مناظر میں) ہماری محبوبہ کے نقوش کا رنگ جھلکتا ہے۔(۱۸)

وہ ابر و باران اور گرج چمک کے سماں کو نوید بہار سے تعبیر کرتے ہیں۔ انہوں نے ابرو باراں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ مثال کے طور پر صرف ان کی ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ترجمہ: گھنے بادلوں سے بارش کی جھڑی برسنے لگی
(بادل) خراسان کے ڈھلوانوں
شالکوٹ اور مستونگ کے رہگذاروں پر برسے
میری سیمیں بدن محبوبہ
اور شکر لب نازنین کو بھگو دیا۔(۱۹)

کسی بھی زبان کے ادب کا اگر مطالعہ کیا جائے تو اس میں ہمیں دوسری تمام خصوصیات کے ساتھ ساتھ وطن کی محبت اور زادگاہ سے پیار کا اظہار بھی جگہ جگہ ملتا ہے۔ یہی پیار جام دُرک کی شاعری میں بھی بھرپور طور پر نظر آتا ہے۔ وہ خاک وطن کے ذرے ذرے سے محبت کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں وطن عزیز کے صحراؤں اور بیابانوں، دشوار گذار پہاڑوں، سنگلاخ چٹانوں، برف پوش کوہساروں، برستے بادلوں اور پرشور ندی نالوں کا تذکرہ

Marfat.com

ملتا ہے۔ وہ رومانی شاعر ہیں لیکن ان کے کلام میں ''بلوچ افغان جنگ'' کے عنوان سے طویل نظم بھی موجود ہے جو وقائع نگاری کی بلند پایہ تخلیق ہے۔

غزل فارسی ادب کی ایک ایسی خوبصورت صنف ہے جس کو اس کی خوبصورتی اور جامعیت کی وجہ سے فارسی کے زیر اثر ہندوستان کی تقریباً سب زبانوں نے اپنایا۔ بلوچی زبان کی کلاسیکل شاعری میں غزلِ مسلسل کی روایات موجود تھیں۔ جام دُرک نے ان روایات کو مزید آگے بڑھایا۔ ان کی عشقیہ نظمیں غزلِ مسلسل کے ذیل میں آتی ہیں۔ ان کی نظموں میں ڈرامے کے بھی عناصر ملتے ہیں۔ وہ ان منظومات کی ابتدا میں موضوع کو کرداروں کے باہمی مکالمہ کی صورت میں زیرِ بحث لاتے ہیں۔ مسٹر ورتھ ڈیمز لکھتے ہیں:

'' جام دُرک نہ صرف بلوچی زبان کا ایک خوش نوا اور بے مثال شاعر تھا بلکہ وہ میدان کارزار کا بھی ایک سرفروش مجاہد تھا۔ جام دُرک مشہد کی جنگ میں نوری نصیر خان (خان قلات) کے لشکر کے ہمراہ تھا اور میر نصیر خان کے دوش بدوش میدان جنگ میں حصہ لے کر اس نے بڑا نام پیدا کیا۔'' (۲۰)

جام دُرک نے بلوچی شاعری کے اس تمام سرمائے کا جائزہ لیا تھا جو زبان و بیان کی رنگا رنگ خصوصیات کا حامل ہے۔ بیانیہ نظموں کا ایک بہت بڑا دفتر ان کی نظروں سے گذرا تھا جس میں رزمیہ داستانیں بھی تھیں اور ایسی نظمیں بھی جو ہجر و فراق، سفر و حضر اور زندگی کے نشیب و فراز کی ترجمان تھیں۔ظاہر ہے کہ اس طرح جام دُرک کو ذخیرہ الفاظ پر بڑی قدرت حاصل ہوئی، لیکن انہوں نے اپنی خداداد ذہانت سے بلوچی شاعری میں فارسی غزل سے متاثر ہو کر رومانی شاعری کے ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔(۲۱)

جام دُرک بنیادی طور پر رومانی مزاج رکھتے تھے۔انہوں نے فارسی غزلوں کا گہرا اثر قبول کیا۔ اس لیے ان کی غنائیہ شاعری میں تغزل کی کیفیات نمایاں ہیں۔ انہوں نے جس فصاحت و بلاغت سے بلوچی شاعری میں طربیہ اسلوب بیان کو اوج کمال تک پہنچایا وہ ایک مثالی حیثیت اختیار کر گئی۔(۲۲)

جام دُرک بلوچی زبان کے ہمہ جہت شاعر تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے نہ صرف دوستی اور محبت کا پیغام دنیا تک پہنچایا بلکہ بلوچی زبان و ادب میں گراں قدر اضافہ بھی کیا جو اکیسویں صدی کے ادبا کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔نظیر صدیقی، کلاسیک کیا ہے، ادب عالیہ، شعبہ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، ص ۱۱

Marfat.com

۲۔میر مٹھا خان مری، دُر چین (جام دُرک بلوچی کلام کا اردو نثری ترجمہ) اکادمی ادبیات پاکستان، ص ۵۳
۳۔سید محی الدین قادری زور، ہندوستانی لسانیات، عزیز پبلیشرز، لاہور، ص ۲۳
۴۔دُر چین، ص ۵۴
۵۔ایضاً، ص ۶۶
۶۔میر گل خان نصیر، بلوچی عشقیہ شاعری، ص ۴۸
۷۔دُر چین، ص ۹۵
۸۔ایضاً، ص ۱۰۱
۹۔ ایضاً، ص ۶۲
۱۰۔ایضاً، ص ۵۷
۱۱۔ دیوان غالب، سنگ میل پبلیکشنز، ص ۲۶۷
۱۲۔ دُر چین، ص ۱۵۰
۱۳۔ دیوان حافظ، مترجم مولانا قاضی سجاد حسین، فرید بک سٹال، لاہور، ص ۴۱۴
۱۴۔دُر چین، ص ۸۱
۱۵۔ ایضاً، ص ۹۷
۱۶۔ ایضاً، ص ۸۴
۱۷۔ ایضاً، ص ۱۶۶
۱۸۔ ایضاً، ص ۱۱۹
۱۹۔ ایضاً، ص ۱۳۴
۲۰۔ مسٹر ورتھ ڈیمز، دی پاپولر پوئٹری آف بلوچس، ص ۸۷
۲۱۔آفاق صدیقی، عظیم بلوچی شاعر جام دُرک ، ص ۴۷، اخبار اردو (مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد) نومبر ۲۰۰۳ء، ص ۴۷
۲۲۔ ایضاً، ص ۴۵

☆☆☆

Marfat.com

نواب یکتا اور اس کی فارسی مثنوی ہیر رانجھا

ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی ☆

پنجاب میں جو قبول عام داستان ہیر رانجھا کو حاصل ہوا ہے وہ کسی اور عشقیہ داستان کو نصیب نہیں ہوسکا۔ پنجابی اور فارسی کے کئی ایک پرانے شعرا نے یہ قصہ منظوم کیا ہے۔ وارث شاہ کی ''ہیر'' کے برعکس جسے پنجابی زبان کی مثنویوں میں برتری حاصل ہے، فارسی مثنویاں مختصر لکھی گئی ہیں۔ راقم کے پاس اس قسم کی دو مثنویاں ہیں جو باون ترپن سال پہلے خریدی گئی تھیں۔ ایک سید محمد اکبر کی جو بادشاہ فرخ سیر کے زمانے میں لکھی گئی، اس میں لفاظی بہت ہے؛ دوسری نواب احمد یار خان گورکانی، تخلص یکتا کی ۔ اس مضمون میں یکتا اور اس کی اس مثنوی کا تذکرہ مقصود ہے۔

نواب احمد یار خان گورکانی، تخلص یکتا، کا برلاس قوم سے تعلق تھا۔ اس کے والد اللہ یار خاں کو جو لاہور، ملتان اور ٹھٹھہ کا حاکم تھا، خوشاب میں جاگیر و اقطاع ملی ہوئی تھیں۔ یکتا کی ولادت لاہور میں ہوئی، جبکہ خوشاب میں اسے بڑے نازونعم سے پالا گیا۔ جب جوان ہوا تو حاکم ٹھٹھہ کا عہدہ ملا۔ ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء میں وہ بھکر پہنچا اور علامہ میر عبدالجلیل بلگرامی سے ایک عرصہ تک معتقدانہ صحبت رہی اور قرآن کریم کا ایک نسخہ خطِ نسخ میں لکھ کر علامہ کو بطور یادگار پیش کیا۔

وفات خوشاب ہی میں پائی۔ آزاد نے تاریخ وفات ۲ جمادی الاول ۱۱۴۷ھ/۱۷۳۴ء لکھی ہے اور ایک قطعۂ تاریخ بھی لکھا ہے جس میں ایک عدد تعمیہ کے طور پر زیادہ دیا ہے:

خانِ والا رتبہ احمد یار خان　　ذاتِ او آیینۂ خُلق عظیم
در فنونِ فضل یکتائے زمان　　زادۂ افکار او دُرِّ یتیم
کرد از معمورۂ گیتی سفر　　ماتم او ساخت دلہا را دو نیم
چونکہ یکتا رفت شد تاریخ او　　''جائے احمد یار خان بزمِ نعیم'' (۱۱۴۸ھ)

یکتا نے طبیعت بہت نازک پائی تھی۔ کہتے ہیں کہ ایک روز اس نے خوشاب میں

☆ یزدانی اسٹریٹ، ملت روڈ، سمن آباد، لاہور

Marfat.com

کسی شخص کو بُھنے ہوئے چنے کھاتے دیکھا تو کہنے لگا کہ چنے آدمی کی نہیں گھوڑے کی خوراک ہے، تم کیوں کھا رہے ہو؟ اس واقعہ کے کچھ ہی عرصہ بعد اس کی تمام جاگیر واقطاع وغیرہ چھن گئیں اور دوسرے لوگ ان پر قابض ہوگئے۔ اس نے اس سلسلے میں کوئی بھی شکایت دہلی نہ لکھی اور پورے صبر کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگا۔ ایک روز اس کا ایک سات سالہ بیٹا جو تین دن سے فاقہ کشی کا شکار تھا، اس سے کہنے لگا "بابا، میں فاقے سے مرا جارہا ہوں۔ مجھے بازار سے تھوڑے سے بُھنے ہوئے چنے تو لادیں تاکہ نئے سرے سے زندگی پاؤں۔" یکتا کو فوراً وہ تکبر والے الفاظ یاد آگئے جس پر اس نے بہت گریہ و زاری کی۔ کچھ عرصہ بعد دہلی سے احکام صادر ہوئے کہ اس کی تمام جاگیر وغیرہ واگذار کردی جائے، لیکن یکتا نے اس کی وصولی سے انکار کردیا اور بقیہ عمر گوشۂ قناعت اور ذکر الٰہی میں گذار دی۔

یکتا صاحب دیوان تھا اور مثنوی "ہیر رانجھا" کے علاوہ اس نے کئی اور مثنویاں مثلاً "گلدستہ حسن" اور "شہر آشوب" وغیرہ بھی لکھی ہیں لیکن مثنوی ہیر رانجھا کے سوا، جو لاہور کے مطبع مفید عام میں ۱۳۲۱ھ میں چھپی، باقی مثنویاں دستیاب نہیں ہیں۔ اس مثنوی کے مرتب نے تذکرہ شمع انجمن کے حوالے سے یکتا کی تاریخ وفات ۱۱۷۴ھ (۶۱-۱۷۶۰ء) لکھی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ چونکہ کسی تذکرہ نویس یا شاعر نے قطعۂ تاریخ نہیں لکھا اس لیے راقم (مرتب) نے فی البدیہہ سال وفات منظوم کیا ہے:

یکتا کہ بشر بود یکتا مشہور ز ماہ تا بماہی
او بود شہی بملکِ عرفان در ملک سخن نمودہ شاہی
اشعار چو گوہر آبدارش اینک بکمالِ او گواہی
سہ شنبہ ز رجب شانزدہم کو گشتہ بملک خُلد راہی
بنوشت حسین سالِ فوتش "پیوست بہ رحمت الٰہی"

یہ تاریخ غلط ہے کیونکہ آزاد بلگرامی نے "سروِ آزاد" ۱۱۶۶ھ میں تصنیف کیا ہے اور اس میں، جیسا کہ ذکر ہوا، قطعۂ تاریخ بھی دیا گیا ہے، اور چونکہ آزاد یکتا کا معاصر ہے اس لیے اس کا بیان زیادہ صحیح ہے۔

مثنوی ہیر رانجھا کوئی ایک ہزار تین سو آٹھ (۱۳۰۸) اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کا سال تصنیف تو معلوم نہیں، لیکن اس کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ یکتا نے یہ مثنوی گوشۂ تنہائی اختیار کرنے کے دوران میں لکھی ہے، کیونکہ مثنوی میں کہیں بھی عیش و طرب کا ذکر نہیں ہے۔ یکتا نے سادہ اور عام فہم تشبیہات اور کنایات و استعارات استعمال کیے ہیں۔ اس نے خود اس

Marfat.com

سادہ و پختہ گوئی کے بارے میں مثنوی کے آخر میں اشارہ کیا ہے:

سادہ و پختہ گفتن آسان نیست کارِ ہر شاعرِ سخنداں نیست

حمد و نعت میں چند اشعار کہنے کے بعد حسن و عشق کے متعلق چند اشعار ہیں۔ پھر پنجاب کی تعریف میں چند اشعار کہے ہیں اور ساتھ ہی داستان کا آغاز کردیا ہے۔ بادشاہِ وقت کی مدح سے اس نے جو اجتناب کیا ہے وہ اس کی قناعت پسندی پر دال ہے۔ حمد کے چند اشعار ملاحظہ ہوں، جن میں جدت و دلکشی کمال کی ہے:

آن زبانیکہ موجۂ خون است شعلۂ نورِ حمد بیچون است
نالہ یک نغمہ ریزِ بلبل او دُودِ دل طُرّۂ ز ... او
دلِ پُرخون، گلی ز بستانش آہ، یک سرو از خیابانش
دیدہ غربال، خونِ دل بیز است مژہ ہا شاخِ ارغوان خیز است
ہر دلے کز غمش پریشان است از تپشِ نخل برگِ ریزان است
چرخ سرگشتۂ ز سوادیش بستۂ زنجیر کہکشان پایش
آتش از سوز عشق سوختہ جان شعلہ از وجدِ شوق دست افشان
رعد، آہی بجان رسیدۂ اوست برق یک بسملِ تپیدۂ اوست
ذرہ ہا در ہوای او رقصان ہمچو طاووسِ مست، چرخ زنان
ہمہ اشیا گواہِ وحدت او معترف ہر یکی بقدرتِ او

یکتا کو، جیسا کہ اس کی مثنوی سے واضح ہوتا ہے، پنجاب، بالخصوص لاہور سے والہانہ عشق تھا۔ دونوں کی تعریف میں چند اشعار ملاحظہ ہوں جو میرے اس قول کی تصدیق کریں گے:

صفتش را کہ گل زبان گردد نطق، باغِ ارم فشان گردد
تا بگُل کشتِ، وصف او زد گام گشت گلبرگ تر، زبان در کام
از بیانش، رقمِ ختن در بر حرفہا، مشکِ نافۂ اذفر
لفظ، گلدستہ بندِ شعلۂ نور سطر، سنبل طرازِ طرّۂ حُور
وہ! چہ کشور طرازِ چین و چگل گلستانِ خیال عالمِ دل
مزرعِ حُسن و دشتِ محبوبی گلشنِ ناز و جنتِ خوبی
بردہ آبش گرو ز آبِ حیات زہر جان گیر رنجِ مرگ ممات

Marfat.com

یعنی پنجاب کا پانی جاں گیر دکھ اور رنج کے لیے زہر ہے اور خود "موت" کے لیے باعثِ مرگ ہے۔ اب لاہور کی تعریف شروع ہوتی ہے:

گرچہ ہر گوشہ اش طرب خیز است	از مئے شوق جام لبریز است
لیک لاہور مصرِ محبوبی است	یوسفستانِ عالمِ خوبی است
از بلندی گذشت پایۂ او	نہ فلک پست زیر سایۂ او
از صفا لوحِ سینۂ ابرار	صدق، جنسِ دکانِ ہر بازار
صبح صادق کہ مطلعِ نور است	یکی از کوچہ ہای لاہور است
آسمان، گنبد نمودارش	کہکشان رستہ ای ز بازارش
از ہوایش کہ رنگِ می ریزد	با غبارش فرنگ می ریزد
ہست ہر باغِ آن خجستہ دیار	دائم از جوش گل، ہمیشہ بہار
صبح و شامش ز رنگ جلوہ گری	گردش چشم عشوہ ریز پری
خوبرویانِ آن بہشت اورنگ	ہمہ آدم فریب، گندم رنگ
ہر طرف خیل خیل ماہرویان	صندلی چہرہ، عنبرین مویان
ہر یکی نونہال سرو اندام	جلوہ بدمست موج نشہ خرام
غمزہ ہا برق ریزِ خرمن دل	مژہ ہا فوج دشنۂ قاتل
چشم و ابرو بکینہ ہندستان	تیغ در کف صفِ سیہ مستان
شہر بُستان و ماہرویان گُل	سنبل و سبزہ اش خط و کاکُل
از ہمین شہر جلوہ خانۂ نور	رستہ این شعلہ ہای آتشِ طور
نازنین شہر حسن بنیاد است	چمنِ محفلِ پری زاد است
تا سوادش ز دور کردہ نگاہ	از حسد روی ہند گشتہ سیاہ
دیدۂ عالم است مطلعِ نور	چشم بد زین سواد اعظم دور

اس کے بعد اصل داستان کا آغاز ہوتا ہے۔ رانجھا کے باپ اور ملکِ ہزارہ کا ذکر کرنے کے بعد اس کے حسن کی تعریف ان زوردار الفاظ میں کی ہے:

نازنین لعبتی پری زادی	در فنِ دل ربودن استادی
نونہال شگوفہ صد گلشن	رو چمن، مو چمن، کرشمہ چمن
برقِ گلبرگ ریز شعلۂ ناز	از ادا شوخیش بخود گلباز
لب لعلش فروغ شعلۂ گل	دہنِ خندہ رشکِ غنچہ و گل

Marfat.com

ابروش موج برق آتشبار لیک از تاب رنگ آن رخسار

رانجھا بڑا مہمان نواز ہے۔ مسافروں سے دلجوئی سے پیش آتا ہے۔ ایک روز ایک مسافر دوران گفتگو، اپنے وطن کی ایک حسینہ ہیر کے متعلق کچھ بتاتا ہے۔ ذرا ہیر کے بارے میں اس کی خوش بیانی ملاحظہ ہو:

ہیر نامی بہشت دیدنہا دور لیکن گلش ز چیدنہا
دلستان پیکری پری زادی حور عصمت، سرشت آزادی
آتشین جلوہ برق شعلہ خرام غنچہ لب، گل عذار، سرو اندام
ابرویش تیغ مغربی مانند تشنۂ خونِ بی گناہی چند
چشمش آہوئی شوخ وحشت خو می کند رم ز سایۂ ابرو
نگہش برق پاشِ مزرع دل غمزہ اش ہوش ریز عقل گسل
مژہ ابری کزو پری ریزد ہمہ جور و ستمگری ریزد
بر خراشِ جگر زند بی رو با نمک ریزہ ہا تبسمِ او
قامتش خیلِ فتنہ را سالار حشر برق افگنِ قیامت بار
ہست آن شوخ جملہ تن آتش گلشتانِ شعلۂ سرکش
ہیچ کس را چو خود نمی داند ہمہ گر یوسف است می راند
نیست خالی دلش ز عشق و جنون ہست لیلی ولیک بی مجنون

مسافر کی ان باتوں کا رانجھے کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ اس کا کھانا پینا چھوٹ گیا۔ چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا اور وہ ہیر کے غائبانہ عشق میں آہ و فغاں کرنے لگا، لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس نے کسی کو اپنی اس حالت سے آگاہ نہ ہونے دیا۔ بدقسمتی سے اسی دوران میں اس کا باپ فوت ہوگیا اور بھائی بندوں نے جائیداد وغیرہ کی تقسیم میں الجھ کر اس سے بُرا سلوک کیا، لیکن :

عاشقان را نہ رغبتِ جاہ است دو جہان نزد شان پر کاہ است

چنانچہ اس نے ہیر کی لگن میں اپنے شہر کو خیرباد کہا اور اپنی غائبانہ محبوبہ کے ملک کا رخ کیا۔ پوچھتا پوچھتا دریا کے کنارے پہنچ گیا۔ وہاں ایک بہت ہی خوبصورت کشتی دیکھ کر بہت حیران ہوا اور ایک ملاح سے کہنے لگا:

باز گو زین سفینۂ نیرنگ کہ نگارین بہشت رنگارنگ
بزم گاہ کدام سلطان است عقل آوارہ دیدہ حیران است

Marfat.com

که درین گلشن نشاط افزا می نماید نظارۂ دریا
صاحب این سفینه کیست بگو نام آن برگزیده چیست بگو؟

ملاح نے اسے بتایا کہ یہ کشتی جھنگی سالاں کے سردار کی لڑکی ہیر کی ہے۔ ہیر کا نام سنتے ہی رانجھا بیتاب ہوگیا۔ اسی بیتابی کے عالم میں وہ اس کشتی میں جا بیٹھا۔ دوسرے ملاح بڑے سٹپٹائے لیکن رانجھا کے رعب حسن کی وجہ سے کوئی بھی اسے ڈانٹ نہ سکا۔ آخر ہیر کو آگاہ کیا گیا۔ وہ غصے کی حالت میں کنارے پر آئی۔ پہلے تو اس نے ملاحوں کو ڈانٹا پھر کشتی کی جانب بڑھی؛ وہاں اس نے:

دید نقشی به هیبت تصویر که چکیده ز خامهٔ تقدیر
بوستانی شگفته بر بستر همه گل گل، چمن چمن پیکر
نوجوانی غبار دل رفته همچو رنگی به برگ گل خفته

یہ منظر دیکھتے ہی ہیر کی حالت غیر ہوگئی:

هیر را دیدنش ربود ز خویش شد درونش چو غنچه محشر ریش
هوشش از سر پرید و صبر از دل ماند یکجا چو سرو پا در گل
دل سراسیمه دیده سرگردان هوش دیوانه و خرد حیران

کچھ دیر اس کی یہی حالت رہی۔ آخر خودداری قائم رکھنے کی خاطر:

از تجاهل بسوی خادم دید دامنی بر زد آستین مالید
گفت "این خفته را بکن بیدار تا بر آرم ز خود سریش دمار"
خادم آمد بصد ستیزه و خشم گفت "کای خفته بخت واکن چشم
صبح شد صبح، رفت عشرت خواب جلوهٔ آفتاب را دریاب

رانجھا اٹھا تو اس نے عجیب منظر دیکھا۔ ہیر سے نظریں چار ہوتے ہی دونوں بے خود سے ہوگئے۔ جب تھوڑی دیر ساکت و خاموش رہنے کے بعد ہوش آیا تو:

هیر را شد ز حال خویش خبر دید خود را اسیر غارت گر
بتکلف ز روی لاچاری خویشتن را بخویشتن داری
غنچه اش گل شد و تکلم کرد رانجها را دیده و تبسم کرد

اس نے رانجھا سے اس کا نام و نشان پوچھا اور کہنے لگی کہ اگرچہ تم نے ہمارے بستر پر قدم رکھ کر ایک بہت بڑی گستاخی کی ہے، لیکن:

Marfat.com

لیک آئینِ ما ہمہ رحم است   ملّت و دینِ ما ہمہ رحم است
غم مخور سرگذشتِ خویش بگو   مرہم مرہم ز ریش بگو

جب رانجھا نے اپنی داستان غم بیان کی تو اسے سن کر ہیر بیحد متاثر ہوئی اور اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ بھی اپنی حالت و کیفیت اس پر افشا کردے، لیکن کچھ تو حیا اور کچھ والدین کا خوف مانع تھا۔ آخر طریقۂ گفتگو بدلا:

گفت با او ز روی خلق نکو   "کای غریب نژندہ بیکس و کو
وطن آوارہ ای، پریشانی   پی روزی خراب و حیرانی
غم مخور رزق را کفیلی ہست   در جہان خلق را وکیلی ہست
می کنم در حق تو غم خواری   بہرہ ای از ہنر اگر داری

اسی بہانے ہیر اسے اپنے گھر لے آئی۔ اپنی ماں سے کہنے لگی کہ یہ ایک بدقسمت نادار شخص ہے۔ مجھے اس کی حالت پر رحم آیا اور اسے ساتھ لے آئی ہوں۔ اس کے لیے آپ کچھ روزینہ مقرر کردیں، لیکن یہ آدمی چونکہ ایک متقی انسان ہے، اس لیے مفت کی روٹی قبول نہیں کرے گا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہم اسے اپنا چوپان مقرر کردیں، کہ اس کام میں اسے مہارت بھی ہے، ماں نے ہیر کی بات مان لی اور اپنا ریوڑ رانجھا کے سپرد کردیا۔ ہیر اس کے لیے کھانا لے کر جاتی اور اسی بہانے دونوں کچھ عرصہ چوری چھپے ملاقاتیں کرتے رہے، لیکن:

ہست ذاتِ زمانہ سفّاک   کہ اگر بشگفد گلی در خاک
نگذارد دمی بخندۂ ناز   کہ دلش با طرب شود ہمساز
ناتوان بینِدش کند طغیان   بدہد باد تند را فرمان
کہ بصد عنف و اشلم خیزد   برگ برگش ز ہم فرو ریزد

ایک روز ہیر کے چچا کیدو نے دونوں کو اکٹھے دیکھ لیا۔ ہیر اسے دیکھ کر چھپ گئی۔ کیدو نے خود کو فقیر ظاہر کرکے رانجھا سے کچھ کھانا لیا، تاکہ ثبوت کے طور پر پیش کرسکے۔ وہ غصے کی حالت میں ہیر کی ماں کے پاس آیا اور:

گفت "ای بانوی تغافل کیش   بے خبر از بلای خانۂ خویش
داد ناموس، دخترت برباد   این چنین زادہ را خدا میراد
ہیر بدبخت بس جفاکار است   با شبانی مصاحب و یار است"

"میرا فرض ہے کہ تمہیں صورت حال بتاؤں اور اس سلسلے میں کچھ سمجھاؤں، باقی تم جانو اور

Marfat.com

تمہارا کام۔ ہاں اتنا کہے دیتا ہوں کہ:

"غنچہ، گر با نسیم گردد یار گُل شود، نیست حاجتِ تکرار"۔

ماں نے اپنے شوہر سے مشورہ کیا، جس پر ہیر کو قید کردیا گیا۔ ایک دن موقع پاکر ہیر زندان سے نکل آئی اور باہر آکر اس نے کیدو کی جھونپڑی کو آگ لگا دی۔ وہ روتا پیٹتا اس کی ماں کے پاس آیا۔ آخر ہیر کو دوبارہ قید میں ڈال دیا گیا۔ اس دفعہ ہیر بیمار ہوگئی۔ ماں کی شفقت اس کی یہ حالت برداشت نہ کرسکی۔ چنانچہ ہیر کو اجازت دے دی گئی کہ وہ کسی وقت باہر سیر کرآیا کرے۔ ایک روز موقع پاکر ہیر رانجھا سے ملنے چلی گئی۔ اس کے بھائیوں کو بھی اس ملاقات کا علم ہوگیا۔ وہ تیر و تفنگ لے کر رانجھا کو مارنے دوڑے، لیکن جو تیر یا تلوار وہ رانجھا پر چلاتے اس کا وار الٹا ان پر پڑتا۔ آخر زخمی اور شرمندہ ہوکر واپس آگئے۔ ان کے باپ نے انہیں سرزنش کی اور کہا کہ ہیر اور رانجھا راستی پر ہیں:

رانجھا و ہیر بی نیازانند ہر دو بی شبہ پاکبازانند
بعد ازین جملہ با ادب باشید دلِ آن زار خستہ مخراشید

آخر دونوں میاں بیوی نے یہ فیصلہ کیا کہ ان دونوں کا عقد کردیا جائے لیکن برادری والوں نے ناک کٹنے کے خوف سے ان کے اس فیصلے کی مخالفت کی، اور یہ فیصلہ ہوا کہ ہیر کا عقد کہیں اور کردیا جائے۔ اس فیصلہ پر سب راضی ہوگئے، مگر شاعر کو اس پر دُکھ ہوتا ہے جس کا اظہار وہ ان لفظوں میں کرتا ہے:

ہمہ گشتند خوش دل و خرم ستم ای چرخ فتنہ کار ستم
این چہ ظلم است این چہ جور و جفاست این چہ بیداد، این چہ قہر و بلاست
تا بکی خون خستگان نوشی چند در قتلِ عاشقان جوشی
ناروا دار خصمِ دیرینہ بی مروت، بخیل پُرکینہ
چہ بگویم ز صفتِ بیدادت کندہ باد از بیخ بنیادت

مختصر یہ کہ ہیر رئیس رنگ پور کے بیٹے سے منسوب کردی گئی۔ جب ہیر نے یہ سنا تو ماں کے پاس آئی:

گفت "ای مادر! این چہ جور و جفاست بر ستم دیدگان ستم بیجاست
از چہ رو می زنی خدا زدہ را از خود و غیر پشتِ پا زدہ را
نیستم از زنانِ شوہر خواہ شہوت آلودہ خیرہ و گمراہ

Marfat.com

تو کجا واقفی ز اسرارم		شد ضرور این کہ پردہ بردارم؟
چند گوئی سخن ز ننگ و ز نام		طشتِ ناموسِ من فتادہ ز بام
عاشقم لیک عاشقِ پاکم		نی ز کس وہم نی زکس باکم

دوسری جانب جب رانجھا کو اس بات کا پتا چلا تو وہ بیتاب ہو کر درگاہِ الٰہی کی طرف متوجہ ہوا:

پُر جمالت کہ مہر تابان است		حُسنِ خوبان نہ پرتوِ آن است
یک نگہ کردم از رہِ جرأت		تا ابد در شگفتم و حیرت
چون ندیدی بدیدۂ منِ زار		یک نظر تاب طاقتِ دیدار
مظہر جلوہ ات عیان کردی		صورتِ ہیر ترجمان کردی
ہیر آئینہ ای بود سادہ		کہ درو عکسِ حُسنت افتادہ
کس نہ بیند اگر ندارد تاب		جلوۂ مہر را مگر در آب
عکس حُسنت مرا ربودہ ز دست		نہ ز تصویرِ ہیر گشتم مست
ہیر آئینہ ایست دوست نما		مظہرِ جلوۂ جمالِ خدا
زندہ ام من ز دیدنِ رویش		کشتۂ زخمِ تیغِ ابرویش
غیر او زندگی زوالِ من است		زہرِ من، مرگِ من، وبالِ من است
چرخ برمن سرِ جفا دارد		در تلاش است مُدعا دارد

آخر روز بد آ پہنچا۔ ہیر رنگپور کے رئیس کے لڑکے نورنگ سے بیاہ دی گئی۔ رخصتی کے وقت جب وہ لوگ جہیز میں ملا ہوا گلہ لے کر چلنے لگے تو تمام گاو میش اِدھر اُدھر بھاگ گئیں۔ پتا چلا کہ رانجھا کے بغیر ان کا ساتھ چلنا مشکل ہے۔ انہوں نے مجبوراً رانجھا کو ساتھ لے لیا۔ رنگپور میں دونوں چاہنے والے حیلوں، بہانوں سے حظ وصل اٹھاتے رہے۔ آخر نورنگ کو اس کی خبر ہوگئی۔ اس نے رانجھا کو قتل کرنا چاہا، لیکن جب ہیر کو پتا چلا تو اس نے فوراً کسی کے ذریعے رانجھا کو اس امر سے آگاہ کردیا تا کہ وہ اس علاقہ سے نکل جائے:

رانجھا از گفتِ ہیر شد ناچار		رفت گریان برنگِ ابرِ بہار
گشت مجنون و سر بصحرا زد		فوجِ اشکش بقلبِ دریا زد

کچھ عرصہ اسی طور گذرا۔ ایک دن ہیر کو خواب میں بشارت ہوئی۔ وہ بہت خوش ہوئی اور اس نے کسی نہ کسی طریقے سے رانجھا کو پیغام بھجوایا کہ جوگیوں کے لباس میں یہاں آؤ۔ رانجھا اس کے حسب خواہش رنگ پور کے نزدیک پہنچا اور وہاں ایک گوشۂ تنہائی میں

Marfat.com

اقامت اختیار کی۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ روحانی طبیب کے طور پر مشہور ہوگیا۔ ہیر نے بھی اپنے عاشق صادق کے دیدار کے لیے بہانہ تراشا:

بسوی پنبہ زار کرد گذر — پنبہ می چید بہرِ داغِ جگر
نیش خاری خلید در پایش — کہ بیک بار جست از جایش
آہِ تندی کشید از دلِ ریش — گفت ماری بپای من زد نیش
این قدر گفت بر زمین افتاد — گشت بیہوش طاقت از کف داد

خاوند اور سسر نے لاکھ علاج معالجہ کرایا، کچھ افاقہ نہ ہوا۔ جب وہ لوگ ہر طرف سے مایوس ہو گئے تو ایک واقفِ حال نے انہیں ایک مشہور جوگی کا پتا دیا۔ جوگی نے مریضہ کو دیکھ کر کہا ''اوہو! اسے تو سخت زہریلے سانپ نے ڈسا ہے'' اور یہ کہ:

بہ نگردد مریض زین آزار — مگر از سعی و محنتِ بسیار
تا درین حُجرہ خلوتی نہ کنم — سحر و افسون و حکمتی نہ کنم
تا نسوزم بخور عود و سپند — کی شود زائل این بلا و گزند
تا شود صبحِ عیش چہرہ فروز — کس نگردد بگردِ ما دو سہ روز

جوگی کا حکم بجا لایا گیا۔ چنانچہ اب ہیر اور رانجھا دونوں حجرے میں تنہا تھے:

ہیر بکشود چشم بر رخ یار — شد میسر سعادتِ دیدار
ہر دو گشتند خرم و شادان — ہمچو گلشن زکثرتِ باران
صد چمن گل ز عیش بشگفتند — گرد از خاطرِ غمین رفتند
ہر دو آہنگ پردۂ یک ساز — پای تا سر بجای ناز، نیاز
اشک شادی ز دیدہ افشاندند — شکوۂ ہجر بر زبان راندند
ہر یکی سرگذشتِ خویش بگفت — سخن از درد و داغ و ریش بگفت

جب رات ہوئی تو دونوں حجرے سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھے کہ نورنگ کے آدمیوں نے انہیں آ پکڑا۔ اسی پکڑ دھکڑ میں علاقے کے لوگ بھی جمع ہو گئے۔ جب انہیں حقیقتِ حال معلوم ہوئی تو یہ فیصلہ ہوا کہ انہیں قاضی کے پاس لے جایا جائے۔ قاضی نے نورنگ کے حق میں فیصلہ دے دیا اور وہ ہیر کو لے کر چل دیا۔ اس صورتِ حال سے رانجھا کے دل پر سخت چوٹ لگی اور قاضی سے کہنے لگا:

حق ما را بدیگران دادی — باز از ظلم خویش دل شادی

Marfat.com

عجب است ار عدالتِ یزدان　　　که درین ظلم گاهِ ناپُرسان
نزند شعله موجِ طوفانی　　　نزند آه و ناله را نی"
این بگفت و کشید از دل آه　　　زد بشهر آتشی عجب، ناگاه
از در و بام حجره و روزن　　　از سرِ راه و کوچه و برزن
شعله ها سر کشید تا بفلک　　　"الامان" گفت آسمان و ملک

اس آگ سے سارے شہر میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ قاضی بہت سٹپٹایا۔ مجبوراً اس نے چند آدمیوں کو پیچھے بھیجا کہ وہ ہیر کو لے آئیں۔ چنانچہ ہیر لا کر رانجھا کے سپرد کردی گئی۔ رانجھا اسے لے کر کسی اور ملک کی جانب روانہ ہوا، لیکن پھر راستے ہی میں نورنگ کے آدمیوں نے انہیں آ پکڑا۔ ہیر کو تو گرفتار کرلیا گیا اور رانجھا کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے ایک صحرا میں پھینک دیا گیا۔

اُدھر کسی نے نورنگ کو مشورہ دیا کہ ایسی عورت کو رکھنا گھر میں دشمن رکھنے کے برابر ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اس سے دست بردار ہوجاؤ۔ نورنگ کو یہ بات پسند آگئی، چنانچہ ہیر کو بھی صحرا میں ڈال دیا گیا۔ ابھی وہ دونوں گویا نزع کی حالت میں تھے کہ حضرت خضر وارد ہوئے۔ انہوں نے پانی کے چند قطرے دونوں کے حلقوں میں ٹپکائے۔ چنانچہ:

کوششِ پیر سازگار آمد　　　آبِ رفته بجوی باز آمد
اندکی هر دو چشم وا کردند　　　پیرِ جان بخش را دعا کردند

جب انہیں پوری طرح ہوش آیا تو وہ سیر جہاں کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ مختلف ملکوں کی سیر کی اور اب تک:

هر دو مستند زنده و قائم　　　تا قیامت همیشه و دائم
تا هنوز اند هر دو باهم یار　　　لیک پنهان ز دیدهٔ اغیار
اولیا تا ابد نمی میرند　　　دستِ از پا فتاده می گیرند

☆☆☆

Marfat.com

ضلع اٹک کے بعض قدیم فارسی گو شعرا

راجہ نور نظامی ☆

ضلع اٹک صوبہ پنجاب کے شمال مغربی کونے میں واقع خطہ پوٹھوہار کا ایک حصہ ہے۔ یہ ۷۱ درجے ۴۳ دقیقے طول بلد اور ۳۲ درجے ۳۴ دقیقے عرض بلد کے درمیان واقع ہے۔ بانی خاندان مغلیہ ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کے عہد (۳۷۔۹۳۲ھ/۳۰۔۱۵۲۶ء) میں ضلع اٹک کا علاقہ نیلاب، ہزارہ (گوجراں)، (ہزارہ) قارلوق، گھیب، کہاٹر اور کچا کوٹ میں منقسم تھا۔(۱) جلال الدین محمد اکبر بادشاہ نے کابل سے واپسی پر ۹۹۱ھ/۱۵۸۱ء کو دریائے سندھ کے کنارے ایک قلعے کی تعمیر کا حکم دیا جس کا نام اٹک بنارس رکھا گیا۔ قلعہ اٹک بنارس خواجہ شمس الدین خوافی کی نگرانی میں دو سال کی مدت میں تعمیر ہوا جس کے بعد نیلاب کی اہمیت ختم کر کے پرگنہ اٹک قائم کردیا اور دوسرا پرگنہ کچا کوٹ تھا۔ جب کہ ان دو پرگنوں کی محال (تحصیلیں) اٹک بنارس، کچا کوٹ، توکوسیرال کھٹڑ (کہاٹری) گھیب (پنڈی گھیب)، کاہوا (کواہنڈ)، ہزارہ گوجراں اور ہزارہ قارلوق تھیں۔(۲) درانی عہد حکومت (۱۲۲۴۔۱۱۶۵ھ/۱۸۰۹۔۱۷۵۲ء) میں اٹک درانی سلطنت کے اٹھائیس صوبوں میں سے ایک صوبہ تھا۔(۳) سکھوں کے عہد حکومت (۶۵۔۱۲۲۴ھ/۱۸۴۹۔۱۸۰۹ء) میں یہ علاقہ اٹک اور راولپنڈی کے ماتحت تھا۔ ۱۸۴۹ء میں جب انگریز اس علاقے پر قابض ہوئے تو یہ علاقہ ضلع راولپنڈی کی تین تحصیلوں پر تقسیم کردیا گیا: ۱۔ حسن ابدال ۲۔ پنڈی گھیپ ۳۔ فتح جنگ۔ (۴) ۱۲۷۵ھ/۱۹۵۹ء میں حسن ابدال کے بجائے اٹک کو تحصیل کا درجہ دے دیا گیا۔ ۱۹۰۴ء میں ضلع اٹک قائم کردیا گیا، جبکہ آجکل ضلع اٹک کی چھ تحصیلیں ہیں۔ ۱۔ اٹک ۲۔ حضرو ۳۔ حسن ابدال ۴۔ فتح جنگ ۵۔ پنڈی گھیپ ۶۔ جنڈ۔ ضلع اٹک کے شمال میں صوبہ سرحد کے اضلاع ہری پور اور صوابی جبکہ مغرب میں دریائے سندھ کے پار اضلاع نوشہرہ اور کوہاٹ اور جنوب کی طرف اضلاع میانوالی اور چکوال اور مشرق کی طرف ضلع راولپنڈی واقع ہے۔ ضلع اٹک تاریخی لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

☆ بھوئی گاڑ براستہ فاروقیہ ہزارہ ضلع اٹک

Marfat.com

یہ قدیم زمانہ ہی سے تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ علم و عرفان کا بھی مرکز رہا ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے دور میں ایران کے بیشمار علما و شعرا اس علاقے میں آئے اور ان کے زیر اثر اس علاقے کی درسی زبان فارسی قرار پائی جو اب تک بعض مدارس کے نصاب میں شامل ہے۔ فارسی زبان کو مغلیہ دور حکومت میں بہت فروغ حاصل ہوا۔ایران سے آنے جانے والوں کی اٹک سے گذرگاہ تھی۔ اس دور میں اٹک میں ایک بڑی تعداد مقامی علما اور شعرا کی موجود تھی۔ مقالہ ھذا میں ضلع اٹک کے مغلیہ دور سے لے کر قیام پاکستان تک کے فارسی گوشعرا کا مختصر تذکرہ بمعہ نمونہ کلام پیش کیا جارہا ہے۔

مولانا شیخ کریم الدین کریمی

مولانا شیخ کریم الدین کا نام عبدالکریم اور تخلص کریمی تھا۔ موضع عثمان کھٹڑ نزد حسن ابدال کے رہنے والے تھے۔عثمان کھٹڑ ہی مولانا کریمی کا مولد، مسکن اور مدفن ہے۔ علوم ظاہری کی تعلیم انہوں نے اپنے علاقے اور لاہور میں حاصل کی۔ علوم باطنی کی تحصیل کے لیے سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے بانی حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی (متوفی ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء) کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ ان کے فیض یافتہ مشہور ترین خلفا میں سے تھے۔ صاحب تصرف و خوارق تھے۔ اس علاقے میں آپ کے تصرفات کا بڑا چرچا تھا۔ بلند احوال اور قوی جذبات رکھتے تھے۔ آپ سے اس علاقے میں سلسلۂ مجددیہ کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ اپنے وقت کے مشہور عالم، شیخ طریقت اور شاعر بھی تھے۔ آپ کی وفات ۳ محرم ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء میں ہوئی اور اپنے وطن ہی میں اپنے رہائشی حجرے میں دفن ہوئے۔(۵) آپ کی قبر عثمان کھٹڑ میں بازار کے پہلو میں شاہی مسجد کے ساتھ مشرق میں راستے کی دوسری طرف ایک گنبد کے اندر واقع ہے۔آپ نے اپنے پیرومرشد کی وفات پر جو قطعۂ تاریخ کہا وہ درج ذیل ہے:

شہ ملک ولایت شیخ احمد　　کہ مثلش مادر ایام کم زاد
ازیں راہ خطرناک و پرآشوب　　قدم در شاہراہ خلد بنہاد
پرسیدم ز ہاتف سال تاریخ　　بگفتا ساکن خلد بریں باد(۶)

مولانا نصر اللہ نصر اللہ

مولانا نصر اللہ بن عبدالسلام بن تاج الدین بن بہاء الدین بھیرہ کے ایک کھوکھر راجپوت گھرانے میں ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۵ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے وقت کے مشہور عالم، مدرس، مصنف، شاعر اور کاتب تھے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء) سے

Marfat.com

بے حد متاثر تھے۔ ۱۰۹۹ھ/۱۶۸۸ء میں *تاج المصادر* بھیرہ میں لکھی اور ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء میں *رسالہ اصول حدیث* اٹک میں تحریر کیا۔ یعنی آپ اس دوران بھیرہ سے اٹک شہر منتقل ہو گئے تھے۔ باقی تمام زندگی آپ نے اٹک شہر میں بسر کی۔ آپ کی بعض مکتوبہ کتب ڈاکٹر عارف نوشاہی صاحب کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔(۷) آپ کے تین فرزند بدرالدین محمد، محمد عظیم اور محمد قدرت اللہ تھے۔ آپ کی ایک تصنیف، *المرآۃ فی شرح اسماء المشکوۃ* ہے۔ جس میں آپ کا کچھ کلام محفوظ ہے۔ ایک مناجات کے چند اشعار مندرج ذیل ہیں:

طبیعی عمر یا رب روزیم باد — بعفو و عافیت بہروزیم باد
پس آنکہ چون رسد وقت وفاتم — ز مکر نفس و شیطان دہ نجاتم
سلامت دار ایمانم در آن وقت — بایمانم بری جانم در آن وقت
ہزاران شکر کاین مراۃ المشکوۃ — کہ بودہ کاشف از اسماء و حالات
بپایان آمد از فضل الٰہی — قبولش باد از مہ تا بماہی
نداری گرچہ نصراللہ طاعت — نہ آخر داری آن صدر شفاعت
اگرچہ ہستی ای مسکین گنہ گار — نہ آخر حق تعالیٰ ہست غفار؟
ز بحر رحمت حق نم ترا بس — نگاہی سید عالم ترا بس
الٰہی تا زمین و آسمان است — عناصر را بیک دیگر قران است
سلام تو برحمت ہای بے حد — بود نازل بروح پاک احمدؐ
و بر اولاد و اصحابش گرامی — و بر اتباع دین او تمامی(۸)

شیخ عبدالشکور شاکر

شیخ عبدالشکور بن شیخ اسماعیل بن سرالاعظم شیخ محمد یحییٰ نقشبندی مجددی المعروف حضرت جی بابا اٹک بن شیخ پیرداد بن شیخ الیاس بن شیخ ہویا بن شیخ فیروز دین اندازاً ۱۱۰۷ھ/۱۶۹۵ء میں اٹک شہر کے ایک مشہور چغتائی مغل خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کی علوم ظاہری و باطنی میں تعلیم و تربیت اپنے جد امجد کے زیر سایہ ہوئی۔ سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ میں بھی آپ ان کے خلیفہ مجاز تھے۔ آپ نے ساری زندگی اٹک ہی میں بسر کی۔ درمیان میں کچھ عرصہ نوشہرہ صوبہ سرحد میں بھی مقیم رہے۔ ۱۱۸۳ھ/۱۷۶۹ء میں آپ کے اکلوتے فرزند صاحبزادہ احمد اور چند ماہ بعد آپ کی بیوی بھی فوت ہوگئی۔ آپ اپنے وقت کے ایک عظیم صوفی رہنما، عالم باعمل، مصنف اور شاعر تھے۔ آپ کا دیوان، مجلس نوادرات علمیہ اٹک کے معتمد حضرت نذر صابری صاحب نے

Marfat.com

۱۹۷۰ء میں مرتب کر کے شائع کیا۔ آپ کی چند دیگر تصانیف بھی ہیں۔ آپ کی وفات اٹک شہر میں ہوئی اور اپنے جد امجد کے مزار کے مغرب میں ایک چار دیواری کے اندر دفن ہوئے۔(۹)

آپ کے دیوان میں سے ایک نوحہ کے کچھ اشعار درج ذیل ہیں:

ما بی وطنان ایم ز ما ہیچ مپرسید　　ما خانہ بدوشیم ز ما ہیچ مپرسید
این کلبۂ احزان کہ بنا ساختہ ام من　　گریہم و بنالیم ز ما ہیچ مپرسید
پرسد ز من آن کس کہ زواید دلم از غم　　ما غم زدگانیم ز ما ہیچ مپرسید
در بیوطنی لخت جگر شد بتہِ خاک　　فرقت زدگانیم ز ما ہیچ مپرسید
آن لخت جگر ثمرہ نخورد از شجر عمر　　ما سوختگانیم ز ما ہیچ مپرسید
در وقت وداع آنچہ زلب گفت نگوئیم　　وحشت زدگانیم ز ما ہیچ مپرسید
فریاد و فغان ہا کہ نمودیم سوے حق　　پاسخ نشنیدیم ز ما ہیچ مپرسید(۱۰)

خواجہ محمد زاہد زاہد

خواجہ محمد زاہد بن خواجہ عزیز اللہ بن خواجہ محمد عارف بن خواجہ محمد قاسم بن خواجہ خلیل اللہ اٹک شہر میں پیدا ہوئے۔ آپ حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ بانی سلسلۂ فردوسیہ (کبرویہ) کی اولاد میں سے تھے۔ خواجہ محمد زاہد نے بچپن سے ہی حضرت سرالاعظم شیخ محمد یحییٰ نقشبندی مجددی المعروف حضرت جی بابا اٹک کی خدمت میں رہ کر سلوک کی منازل طے کیں۔ ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء میں آپ کے والد بزرگوار فوت ہوگئے۔ ۱۱۳۲ھ/۱۷۱۹ء میں حضرت جی بابا اٹک کی وفات کے بعد ان کے خلیفہ و جانشین مولانا حافظ سید محمد معصوم پیرسبا کی سے تجدید بیعت کی اور زندگی کا بیشتر وقت اپنے پیرو مرشد کی خدمت میں گزارا۔ اپنے پیرومرشد اور سلسلۂ نقشبندیہ کے دیگر بزرگوں کے حالات و واقعات پر ایک کتاب *قصۃ المشائخ* ۱۱۴۶ھ/۱۷۳۳ء میں لکھی جس میں آپ کا منظوم کلام بھی درج ہے۔ آپ کے دو فرزند خواجہ محمد عابد اور خواجہ محمد عارف تھے۔(۱۱) آپ کی مثنوی درج ذیل ہے:

پیر پُر تدبیر یحییٰ قبلہ خاص و عوام　　بر رضای دوست شاکر بود آن شیرین کلام
ہست شیخ آن پیر کامل مقصد دنیا و دین　　در ہمہ اوصاف موصوف است چوں روح الامین
نور چشم کل انسان منبع جود و کرم　　مرہم ریش درون و دافع درد و الم
رہبر آن کس کہ راہ گم کرد از حرص و ہوا　　میرساند او بمنزل محض از بہر خدا

Marfat.com

هر مرید اوست کامل پهلوان بندگی　　نیست میداند خود را باوجود زندگی
الخصوص اش سید عالی نسب کوه علوم　　آن سیادت مرتبت روشن چو مه اندر نجوم
حافظ قرآن بودهم دستگیر بیکسان　　اسم او معصوم سرتاج همه خورد و کلان (۱۲)

مولانا محمد غوث علوی

مولانا محمد غوث بن محمد فائق ۱۱۵۰ھ/۳۷-۱۷ء میں کابل کے ایک قریشی علوی خاندان میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں اپنے والد کے ہمراہ پشاور چلے آئے۔ تعلیم پشاور اور علاقہ چھچھ میں حاصل کی۔ آپ کے ایک استاد اخوندزادہ محمد زاہد ساکن خیر وخیل تھے جن کا ذکر آپ نے اپنے ایک قصیدہ میں کیا ہے۔ معاشی پریشانیوں کی بنا پر پشاور سے حسن ابدال چلے آئے تھے۔ احمد خان درانی اسحاق زئی (اخور باشی) سے تعارف کی بنا پر تیمور شاہ درانی بادشاہ سے مراسم ہو گئے۔ اس کی نصیحت کے لیے ایک کتاب *ریاض الملوک* لکھی۔ اس میں آپ کا منظوم کلام بھی ہے۔ قرآن مجید کے فارسی حواشی تحریر کیے۔ آپ کا کلام ایک قلمی بیاض میں بھی محفوظ تھا۔ دو فرزند مولانا حافظ وجیہہ الدین اور مولانا حافظ رفیع الدین تھے جن کی اولاد مواضعات غرشین تحصیل حسن ابدال اور نور پور علاقہ چھچھ میں آباد ہے۔ ۱۲۱۳ھ/۹۸-۱۷ء میں فوت ہوئے۔ (۱۳)

آپ کے کلام میں سے ایک حمدیہ مثنوی درج ذیل ہے:

گهی از شهی داد گر ملک را　　دهی رونق روضهٔ با صفا
ز بیداوگر گاه بخشش کنی　　همه هست و بودش بهم بر زنی
بهر روز شانی دگر باشدت　　کرا زهره آنکه بشناسدت
جهانرا بفرمان چندین شیون　　نگهداشتی از شیون و فتون (۱۴)

مولانا محمد علی مولوی

مولانا محمد علی بن محمد شفیع بن محمد داؤد ۱۱۶۵ھ/۵۱-۱۷ء میں بٹالہ مشرقی پنجاب، بھارت کے ایک قریشی علوی خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا جلال آباد افغانستان سے بٹالہ تشریف لائے تھے۔ والد گرامی شاہ محمد شفیع مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ/۶۲-۱۷ء) اور حضرت میرزا مظہر جان جاناں شہید دہلوی (متوفی ۱۱۹۵ھ/۸۰-۱۷ء) کے فیض یافتہ گان اور خلفا میں سے تھے۔ آپ کے برادر کلاں مولانا عبدالرسول سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے بزرگوں میں سے تھے۔ والد بزرگوار بچپن میں فوت ہو گئے تھے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت بھی برادر مولانا

Marfat.com

عبدالرسول نے کی۔ بعد ازاں مولانا اسد اللہ بہاول پور، مولانا مصطفیٰ جی پشاور، مولانا مرتضیٰ جی جیال ضلع اٹک اور مولانا محکم الدین مکھڈ ضلع اٹک سے علوم کی تکمیل کی۔ اپنے استاد گرامی مولانا محکم الدین کے انتقال کے بعد مکھڈ کے مخیّر پراچہ خاندان کی استدعا پر مسجد مولوی صاحب مکھڈ میں درس و تدریس میں مشغول رہے۔ سلسلۂ چشتیہ نظامیہ میں خواجہ شاہ محمد سلمان تونسوی کے خلیفۂ مجاز تھے۔ آپ عالم علوم ظاہری و باطنی تھے۔ پنجابی کے ساتھ ساتھ فارسی کے شاعر تھے۔ مولوی تخلص تھا۔ آپ کا کچھ کلام مولانا عبدالنبی قریشی ساکن بھوئی گاڑ تحصیل حسن ابدال نے اپنی تصنیف تذکرۃ المحبوب (۱۳۰۶ھ) میں یکجا کردیا تھا۔ ۲۹ رمضان ۱۲۵۳ھ/۲۷ دسمبر ۱۸۳۷ء کو فوت ہوئے اور مکھڈ تحصیل جنڈ میں دفن ہوئے۔(۱۵) آپ کے کلام میں سے جو تذکرۃ المحبوب میں شامل ہے، ایک فارسی غزل بطور نمونہ درج ذیل ہے:

یاد در جور دلبرانہ ہنوز آتشم میزند زبانہ ہنوز
ساقیا سوختم ز تشنہ لبی تا بکے حیلہ و بہانہ ہنوز
گرچہ بے رحمیت ز حد بگذشت سرمۂ خاک آستانہ ہنوز
واعظا بس کن از نصیحتِ پند چند ازین قصہ و فسانہ ہنوز
دل من در ہوائے آں عنقا کہ نہ بینم ازو نشانہ ہنوز
عاشق خستہ غرق دریاییست کہ ندید است ازو کرانہ ہنوز
غزلے خواند دوش مطرب عشق مولوی مست ازان ترانہ ہنوز(۱۶)

سید نجیب شاہ

سید نجیب شاہ موضع سلطان پور تحصیل حسن ابدال کے مشہور سادات خاندان میں سے تھے۔ بچپن سے نابینا تھے، اس کے باوجود علوم ظاہری کی تعلیم بھوئی گاڑ اور سلطان پور میں حاصل کی۔ سلوک کی تعلیم حضرت خواجہ نور محمد تیراہی نقشبندی مجددی ساکن چورہ شریف (متوفی ۱۲۸۶ھ) تحصیل جنڈ سے حاصل کی اور آپ کے مریدین خاص میں سے تھے۔

تفسیر سورۃ والضحٰی اور منظوم رسالہ عشق پنجابی آپ کا تھا۔ آپ پنجابی کے ساتھ فارسی کے بھی بڑے اچھے شاعر تھے۔ آپ کا ایک منظوم خط کتاب انوار تیراہی سے نقل کیا جاتا ہے:

ای ماہ تابان اوج قل ہو اللہ احد وی سہی سرو بلند از باغ اللہ الصمد
میزنی بر شیشۂ دلہا صقیلی از لم یلد نور لم یولد ز تو مرسینہ ہا را میرسد

Marfat.com

لشکر اشراک را از ملک بر دل کشی　　باسپاہی لم یکن یعنی لہ کفواً احد
آفتاب نور احمدؐ تافتہ بر کائنات　　زان ہمہ ذات ترا حق نور ہر دم می دہد
اسم تو بیشک موافق با مسمےٰ آمدہ　　زان کہ آن نور محمدؐ از رخت سر میزند
کشور دین متین آباد شد از علم تو　　لشکر حق الیقین را قوت از تو میشود
سالکانرا رہنمائی عاشقان را دل ربا　　عابدان را مقتدای اہل عرفان را سند
صد ہزاران لعنت حق باد بر اعدائے تو　　کفر مے بینم بلا شک با جناب تو رسد
عاجز و مسکین و محتاج و گدا ایم اے شہا　　بر نمی آید ز دستم خدمتے کین جا سزد
بست معذوری دو پایم، مفلسی دستم گرفت　　من چہ گویم حال زار داند آں ذات احد
بر درت افتادہ گویم الغیاث الغیاث　　کن نگہ برمن کہ تسکین دلم حاصل شود
پیش تو بے توشہ آمد بندہ سید نجیب　　باکرم کن شہر دارش تا براحت میرود
کاتب این بیتہا شہ شیخ احمد اے جناب　　با خطائے صد ہزاران ہم گناہے بے عدد
طالب عشق الٰہی آمدہ نزدیک تو　　قطرہ از بحر کرم برخاک پائے تو چکد (۱۷)

مولانا عبدالنبی قریشی

مولانا عبدالنبی بن مولانا قاضی امیر حمزہ بن مولانا حافظ شیخ احمد بن مولانا قاضی محمد عباس بن مولانا سنت اللہ بن قاضی عبدالوہاب ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۷ء میں بھوئی گاڑ تحصیل حسن ابدال کے مشہور قریشی خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا مولانا حافظ شیخ احمد قریشی موضع میانہ موہڑہ تحصیل گوجرخان ضلع راولپنڈی سے درانی دور حکومت میں بھوئی گاڑ تشریف لائے تھے۔ آپ نے تعلیم بھوئی گاڑ، مکھڈ اور لنگریال میں حاصل کی۔ آپ کے اساتذہ میں آپ کے والد محترم مولانا قاضی امیر حمزہ قریشی، عم محترم فاضل اجل مولانا قاضی محمد شفیع قریشی، مولانا خواجہ زین الدین مکھڈی اور مولانا محمد ابراہیم لنگڑالی مشہور ہیں۔ مولانا خواجہ زین الدین سجادہ نشین خانقاہ مولانا محمد علی مکھڈ کے مریدین خاص میں سے تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد تمام عمر بھوئی گاڑ اور مکھڈ میں درس و تدریس میں مشغول رہے۔ خواجہ اللہ بخش تونسوی، مولانا خواجہ عبداللہ شاہ فاضل دیو بند سجادہ نشین گڑھی افغانان، خواجہ غلام محی الدین سجادہ نشین مکھڈ شریف، خواجہ شمس الدین سیالوی جیسے اپنے وقت کے مشاہیر مشائخ عظام سے قریبی روابط

Marfat.com

تھے۔ اپنے پیرومرشد کے ہمراہ کئی بار تونسہ شریف اور مہار شریف بھی گئے۔ آپ اپنے وقت کے مشہور عالم، مدرس، مصنف اور شاعر تھے۔ تذکرۃ المحبوب (۱۳۰۶ھ) کے علاوہ ایک قلمی بیاض میں بھی آپ کا کلام درج ہے۔ ۸ رمضان المبارک، ۱۳۱۱ھ/۱۶ مارچ ۱۸۹۴ء کو فوت ہوئے اور اپنے آبائی قبرستان میں دفن ہوئے۔(۱۸) آپ کے کلام میں سے چند ابیات جو آپ نے اپنے پیرومرشد کے متعلق کہے درج ذیل ہیں:

اے رخت نور دیدۂ عشاق اے درت قبلہ گاہ ہر مشتاق
تو بخوبی بتا نداری جفت زانکہ ہستی بخوبروئی طاق
دلبران گرچہ دلبرند ولیک از ہمہ دلبری علی الاطلاق
زہر نوشندگان جام غمت مے نخواہند از کسے تریاق
دیگران می کشند ساغر وصل ما غریبان مدام درد فراق
مخبران دیار عالم عشق ایں خبر می دہند در آفاق
کہ بجز ذات پیر نیست کسے ار چہ جوئی ز چین و حد عراق (۱۹)

مولانا فقیر جمال الدین

مولانا فقیر جمال الدین شہر پنڈی گھیپ کے رہنے والے تھے۔ کچھ عرصہ میکی ڈھوک تحصیل فتح جنگ میں بھی مقیم رہے۔ آپکے فارسی کلام میں سے ایک رباعی ملی جو درج ذیل ہے:

وفا شد از این آسمان منقطع ہمہ جم غفیران بر این مجتمع
ندانم کسی رنگ و روی فرار معانی و مبانی برین مجتمع (۲۰)

مولانا عبدالرحمٰن

مولانا عبدالرحمٰن موضع چمکنی، نزد پشاور، صوبہ سرحد کے رہنے والے تھے۔ تعلیم کے حصول کے لیے علاقہ چھچھ تحصیل حضرو تشریف لائے۔ فیضی چھچھ مولانا سید احمد المعروف فیضی میاں(متوفی ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء) آپ کے اساتذہ میں سے تھے۔ بعد فراغت تعلیم موضع سلیم خان میں سکونت اختیار کرلی۔ آپ جید عالم، مدرس اور فارسی شاعر تھے۔ مولانا عبدالحق غورغشتی کی قلمی بیاض میں آپ کا کلام درج ہے۔ اندازاً ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء میں فوت ہوئے اور موضع سلیم خان میں دفن ہوئے۔(۲۱) آپ کلام میں سے ایک قطعہ تاریخ جو آپ نے اپنے استادمحترم کی وفات پر لکھا درج ذیل ہے:

Marfat.com

عالم بے عدیل و بے ہمتا　　مخزن فضل معدن تقویٰ
حاوی علم عقلی و نقلی　　در فروع و اصول چون دریا
کوکب آسمان علم و ادب　　دریائے در حکمت و معنی
بحر زخّار، نکتہ دانِ علم　　طوطی خوش بیان و شکرخا
سید دین احمد اندر دہر　　مجلس علم را چو شمع ضیاء
شد بہ فیضی شہیر در عالم　　قاف و تا قاف نام او ہر جا
ہر کہ دیدش بعلم حیرت　　گفت سبحان ربی الاعلیٰ
رخت خود ز دار فانی بست　　کرد عزم سفر بدار بقا
چونکہ ہر نفس ذائق موت است　　نیست چارہ بغیر صبر و رضا
انتقالش بسن یغفر ہو　　رب اغفر لہ ز لطف عطا
در نیاید بفہم جز بصریح　　سہ صد و یک بیک ہزار افزا
پانزدہ از حساب ماہ صفر　　در شب چہار شنبہ وقت عشاء
قاریا از صمیم قلب بر خوان　　رب ادخلہ جنت الماویٰ(۲۲)

مأخذ و حواشی

۱۔ظہیر الدین محمد بابر، تزک بابری، مترجم رشید اختر ندوی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۱۵۹

۲۔علامہ ابوالفضل، آئین اکبری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، س ن، ج ۲، ص ۱۰۳۳ تا ۱۰۳۶؛ شیخ ابوالفضل علامی، اکبر نامہ ،منشی نول کشور، کان پور، ۱۲۸۴ھ، ج ۳، ص ۳۳۵؛ عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ ، بے۔ ڈبلیو تھامس مشن پریس، کلکتہ، ۱۸۸۴ء، ج ۲، ص ۳۰۱

۳۔منظور الحق صدیقی، تاریخ حسن ابدال، ادارہ تحقیقات پاکستان دانشگاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۱۷۳۔۱۷۲

۴۔ایضاً، ص ۱۰۹

۵۔بدرالدین سرہندی، حضرات القدس، مکتبہ نعمانیہ سیالکوٹ، ۱۴۰۳ھ، ج ۲، ص ۳۹۳۔۳۸۳، ہاشم کشمی، زبدۃ المقامات ، مکتبہ اسلامیہ، سیالکوٹ، ۱۴۰۷ھ، ص ۵۲۵؛ خواجہ محمد احسان مجددی، روضۃ القیومیہ، مکتبہ نبویہ، لاہور ج ۱، ص ۵۳۸

۶۔حضرات القدس، ص ۲۳۸

۷۔فکر و نظر، اسلام آباد، ج ۳۸، شمارہ ۴، (اپریل۔ جون ۲۰۰۱ء)، ص ۱۱۹۔۱۰۳

۸۔السمراۃ فی شرح اسماء مشکوۃ، نصراللہ بن عبدالسلام اٹکی، (قلمی) ۱۱۲۸ھ، کتب خانہ فاضلیہ،

Marfat.com

گڑھی افغاناں، آخری ورق، نمبر شمار ۳۷
۹۔ڈاکٹر ظہور الدین احمد، پاکستان میں فارسی ادب ، ادارہ تحقیقات پاکستان دانشگاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۷۷ء، ج ۳، ص ۲۰۲۔۲۰۱؛ سکندر خان، دامن اباسین ، امید پرنٹر دربار مارکیٹ، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۳۳۰؛ شاکر (کتابچہ) توشیر احمد، ہمدرد بک سٹال، سرگودھا، ۱۹۹۵ء ؛ رشید نثار، وادی پوٹھوهار ، فیض الاسلام پریس، راولپنڈی، ۱۹۹۷ء، ص ۳۷۱۔۳۶۰؛ نذر صابری، سر الاعظم و خلفای او، (قلمی) مملوکہ راجہ نور محمد نظامی
۱۰۔ دیوان شاکر، مرتبہ نذر صابری، مجلس نوادرات علمیہ، اٹک، ۱۹۷۰ء، ص ۱۰۵
۱۱۔خواجہ محمد زاہد اٹکی، قصۃ المشائخ، (قلمی) مملوکہ راجہ نور محمد نظامی، ۱۱۴۶ھ، ص ۲۹۰۔۲۶۸، راجہ نور محمد نظامی ''حضرت سر الاعظم شیخ محمد یحیٰ نقشبندی مجددی المعروف حضرت جی اٹک اور ان کے خلفاء و معاصرین'' (غیر مطبوعہ) مملوکہ راجہ نور محمد نظامی بھوئی گاڑ ضلع اٹک، ص ۳۸۵ ؛ پاکستان میں فارسی ادب ، ج ۳، ص ۳۳۸۔۳۸۵
۱۲۔خواجہ محمد زاہد، قصۃ المشائخ (۱۱۴۶ھ) (قلمی)، کاتب کامل شاہ کٹڑی، مملوکہ راجہ نور محمد نظامی بھوئی گاڑ، ص ۱۸۵
۱۳۔ڈاکٹر ام سلمیٰ گیلانی، محدث کبیر حضرت شاہ محمد غوث ، مکتبہ الحسن، یکہ توت پشاور، ۱۹۹۰ء، ص ۱۸ ؛ سکندر خان، دامن اباسین، طبع سوم، ملی کتب خانہ، ویسہ ضلع اٹک، ۱۴۲۵ھ، ص ۳۴۶ ؛ پاکستان میں فارسی ادب، ص ۸۸۵
۱۴۔محمد غوث قطب شاہی، ریاض الملوک (قلمی) نمبر شمار P.C 143، پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور۔ تمہید
۱۵۔مولانا عبدالنبی قریشی بھوئی گاڑ، تذکرۃ المحبوب ، (قلمی)، ۱۳۰۶ھ، کتب خانہ ربانیہ، بھوئی گاڑ، ضلع اٹک؛ محمد الدین مکھڈی، تذکرۃ الولی ، مطبع شمس، ملتان، س . ن، ڈاکٹر صاحبزادہ محمد حسین للہی ، فیض المشائخ ، خانقاہ چشتیہ نظامیہ سلمانیہ، للہ شریف، ضلع جہلم، ۱۴۰۵ھ، ص ۱۸۴۔۱۸۳؛ حاجی نجم الدین سلیمانی، مناقب المحبوبین ، اسلامک بک فاؤنڈیشن، سمن آباد، لاہور ۱۳۹۹ھ، ص ۲۱۷۔۲۱۵؛ شاہ غلام علی، مقامات مظہری، مترجم محمد اقبال مجددی، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۴۲۴، ۴۶۵، ۴۶۶
۱۶۔تذکرۃ المحبوب (قلمی)، ص ۱۳۵
۱۷۔فقیر محمد شفیع نقشبندی، برکات نقشبندیہ انوار تیراهی، چورہ شریف ضلع کیمبل پور، ۱۹۵۷ء، ص ۱۲۲۔۱۲۱
۱۸۔ڈاکٹر ظہور الدین احمد، پاکستان میں فارسی ادب ، ادارہ تحقیقات پاکستان دانشگاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۹۰ء، ج ۵، ص ۲۴۴، راجہ نور محمد نظامی، تذکرہ علمائے بھوئی گاڑ، (قلمی): دارالکتب بھوئی گاڑ
۱۹۔تذکرۃ المحبوب (قلمی)، ص ۵
۲۰۔سید کمال حاج سید جوادی، میراث جاودان ، ثقافتی کونسلیٹ سفارت جمہوری اسلامی ایران، اسلام آباد، ۱۳۷۰ھ ش، ج ۱، ص ۱۵۶۔۱۵۵
۲۱۔دامن اباسین، طبع سوم، ص ۳۱۶
۲۲۔محمد مرید احمد چشتی، فوز المقال فی خلفائے پیر سیال، ادارہ تعلیمات اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۵۱۱

☆☆☆

Marfat.com

رباعی

نیسان اکبر آبادی☆

رباعی شعرائے عجم کی اختراع ہے اور شعرائے اردو نے بھی اسے اپنایا۔ کچھ لوگوں کے خیال میں رباعی ایسے چار مصرعوں کو کہتے ہیں جن کا مصرعۂ اول، مصرعہ ثانی اور چوتھا مصرع ہموزن اور ہم قافیہ ہوں اور دو شعروں میں پورا مطلب قلمبند کیا جائے، لیکن ہر چہار مصرع اشعار کو رباعی نہیں کہتے۔ کیونکہ رباعی صرف بحرِ ہزج میں کہی جاتی ہے۔ کسی دوسری بحر میں نہیں کہی جاتی۔ رباعی کے چوبیس وزن ہوتے ہیں جو مفعول سے شروع ہوتے اور شجرۂ اخرب کے تحت آتے ہیں۔ باقی بارہ وزن شجرہ اخرم کے وزن پر اور فعولن سے شروع ہوتے ہیں۔

پہلا وزن	مفعول مفاعلن مفاعیلن فاع
دوسرا وزن	مفعول مفاعیل مفاعیلن فاع
تیسرا وزن	مفعول مفاعیل مفاعیل فعل
چوتھا وزن	مفعول مفاعلن مفاعیلن فع
پانچواں وزن	مفعول مفعولن مفاعیلن فاع
چھٹا وزن	مفعول مفاعیل مفاعیلن فع
ساتواں وزن	مفعول مفاعیلن مفعول مفعول
آٹھواں وزن	مفعول مفاعیلن فعولن فعولن
نواں وزن	مفعول مفاعیلن مفعول فعل
دسواں وزن	مفعول مفاعیل مفاعیل فعول
گیارہواں وزن	مفعول مفاعلن مفاعیل مفعول
بارہواں وزن	مفعول مفاعلن مفاعیل فعل

شجرۂ اخرم کے وزن پر آنے والے بارہ وزن ہیں جو رکن مفعولن سے شروع ہوتے ہیں۔

پہلا وزن	مفعولن فاعلن مفاعیلن فع

☆ مکان نمبر 413، اسٹریٹ 56۔I-8/2، اسلام آباد

Marfat.com

دوسرا وزن	مفعولن مفعول مفاعیل فاع
تیسرا وزن	مفعولن فاعلن مفاعیل فعل
چوتھا وزن	مفعولن مفعولن مفعولن فاع
پانچواں وزن	مفعولن فاعلن مفاعیلن فعل
چھٹا وزن	مفعولن فاعلن مفاعیلن فع
ساتواں وزن	مفعولن مفعول مفاعیل فعول
آٹھواں وزن	مفعولن مفعول مفاعیلن فع
نواں وزن	مفعولن مفعولن مفعول فعل
دسواں وزن	مفعولن فاعلن مفاعیل فاع
گیارھواں وزن	مفعولن فاعلن مفعولن فعل
بارھواں وزن	مفعولن مفعولن مفعولن فعول

رباعی اپنے اصولوں کے حوالے سے دیگر اصنافِ سخن کے مقابلے میں ایک مشکل صنف ہے۔شاعرانہ اصطلاح میں رباعی اس صنف کا نام ہے جس کے چاروں مصرعوں میں ایک مکمل مضمون ادا کیا جاتا ہے۔ رباعی میں وزن کی تخصیص کے ساتھ قوافی کی ترتیب کا مخصوص نظام ہے۔ پہلے دوسرے اور چوتھے مصرع میں قافیہ لانا ضروری ہے۔ تیسرے مصرع میں بھی اگر قافیہ لایا جائے تو کوئی عیب نہیں بلکہ اہلِ فن کے نزدیک مستحسن ہے۔

رباعی میں تسلسل بیان اور خیال کے تدریجی ارتقا کے خوبصورت اظہار کے لیے ضروری ہے کہ اس کے چاروں مصرعے زنجیر کی لڑیوں کی طرح آپس میں مربوط ہوں۔

عروض کی مختلف کتابوں میں رباعی کے مختلف نام ملتے ہیں۔ ابتدا میں اسے دوبیتی اور ترانہ بھی کہا گیا ہے۔ اسے ترانہ کہنے کا سبب یہ ہے کہ اس میں غنائیت کی وجہ سے گائے جانے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔

قدر بلگرامی اور یگانہ چنگیزی کے مطابق "ترانہ" رباعی کو کہتے ہیں۔ بعض ماہرین نے رباعی کو چہار مصراعی اور جفتی بھی کہا ہے۔ اس میں عام طور پر تو وہی موضوعات لائے جاتے ہیں جو غزل سے وابستہ رہے ہیں لیکن اس میں بیشمار اور موضوعات کو بھی جگہ دی جاسکتی ہے۔

جوش ملیح آبادی "رباعیات محروم" کے دیباچہ میں رباعی کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یوں تو اس کے دائرے میں بیشمار موضوعات کو جگہ دی جاسکتی ہے لیکن درحقیقت اس صنف کی تخلیق اس

Marfat.com

غرض سے ہوئی کہ پختہ زندگی کے ژولیدہ اور وسیع تجربات کو ہموار کر کے اور رسیدہ فکر کے عجیب و عمیق افکار کو ترتیب دے کر قلیل لیکن بیحد جگر دار الفاظ کی معرفت ایسے استادانہ اختصار اور ایسے حکیمانہ لہجہ میں ادا کیا جائے کہ اس کے آستانہ جمال پر تفصیل کا جلال سر بہ سجود ہو کر رہ جائے۔

اس میں مذہبی، اخلاقی، عارفانہ، عشقیہ، حمدیہ اور اصلاحی موضوعات کے علاوہ سماجی تصورات، شخصی اور ذاتی حالات کو بھی جگہ دی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی لکھتے ہیں:

فارسی رباعیات کی طرح ہر شاعر کا ایک خاص موضوع رہا ہے اور اس موضوع کو ایک خاص رنگ میں پیش کیا ہے۔ چنانچہ قلی قطب شاہ کی رباعیات کا خاص موضوع عشق و محبت ہے۔ ولی دکنی کی رباعیات پر تصوف کا رنگ غالب ہے۔ میر تقی میر کی رباعیات پر محرومیت کی گہری چھاپ ہے۔ غالب کی رباعیات میں فلسفہ کی جھلک ہے۔

انیس و دبیر کی رباعیات میں زیادہ تر شہیدان کربلا کا خون ٹپکتا ہے۔ حالی اور اکبر کی رباعیات میں بدلے ہوئے زمانہ کی کروٹیں صاف نظر آتی ہیں۔ جوش کی رباعیات میں انقلاب کی للکار گونجتی ہے اور فراق کی رباعیات میں مٹھاس پائی جاتی ہے۔

رباعی بھی اور اصناف سخن کی طرح فارسی سے اردو میں آئی۔ اردو کے پہلی رباعی گو شعرا میں دو نام بہت نمایاں ہیں محمد قلی قطب شاہ اور ملا وجہی، لیکن ملا وجہی کی رباعیوں میں قلی قطب شاہ کی نسبت غیر مانوس الفاظ زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ان دونوں شعرا کے ہمعصر غواصی، شاہی اور نصرتی کے یہاں بھی چند رباعیاں پائی جاتی ہیں۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر میں جس دکنی شاعر نے باقاعدہ موضوعات میں رباعیات کہیں، عشق میں ناکامی نے انہیں سوز، درد اور کسک کی دولت بخشی جسے انہوں نے اپنی شاعری میں منتقل کر دیا۔

عبدالقادر سروری ''کلیات سراج'' کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ درد و سوز میر کے کلام کی بھی ایک نمایاں خصوصیت ہے لیکن ان کا مخصوص لہجہ یاس ہے اور وہ اس مضمون کے بادشاہ ہیں۔ ان کے مقابلہ میں سراج کے پاس، احساس قناعت، تسلیم و رضا اور درد میں لذت کی چاشنی موجود ہے۔ مرزا محمد رفیع سودا، میر تقی میر اور خواجہ میر درد نے اگرچہ ضمنی طور پر رباعیاں کہیں تاہم ان کی رباعیوں میں ایسے شعری محاسن جمع ہیں جن سے رباعی کے امکانات کو وسیع کرنے میں خاصی مدد ملی۔

سودا کے کلیات میں اسی (۸۰) رباعیاں ہیں۔ ان کے علاوہ جنھوں نے رباعی میں طبع آزمائی کی ان کے نام یہ ہیں: میر سوز، میر حسن، قائم چاندپوری، غمگین اور نظیر اکبرآبادی۔ ان کی رباعیات میں سادگی بھی ہے اور جذبات کا خلوص بھی۔ لکھنوی شعرا میں آتش، ناسخ، انشا اور جرات ہیں۔ اگرچہ یہ شعرا اپنے مبلغ علم، قادر الکلامی کے اعتبار سے بڑے شاعر ہیں لیکن

Marfat.com

رباعی گوئی کی حیثیت سے ان میں کوئی سودا، میر درد یا میر حسن کو نہیں پہنچتا۔

انیسویں صدی کے نصف اول کا زمانہ رباعی کی صنف کے لیے بہت سازگار تھا، اس عہد میں انیس، دبیر، غالب، مومن اور ذوق جیسے باکمال شعرا ہوئے۔ ان شعرا نے رباعی کو ایک قابل قدر صنف بنا دیا۔

اب عاشقانہ جذبات اور صوفیانہ خیالات کے ساتھ واقعات کربلا اور اس کے اثرات کا ذکر آنے لگا۔ انیس و دبیر نے نہ صرف رباعی کو معنوی اعتبار سے وسعت دی بلکہ غزل، قصیدہ اور مرثیہ کی طرح اس صنف کو روشناس بھی کرایا۔ مناظر قدرت دیکھ کر متاثر ہوئے اور رباعی کہی۔

صحرا میں پھروں کہ دشت و دریا دیکھوں
یا معدن کوہ و سیر صحرا دیکھوں
یا رب تیری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

اس دور کے دہلوی شعرا میں مومن کی رباعیات پہ رائے دیتے ہوئے ضیاء بدایونی لکھتے ہیں:

> مومن کی رباعیات معیار پر پوری اتری ہیں۔ اگرچہ اردو کے مشہور رباعی نگاروں میں انیس و دبیر و حالی کی طرح بلند نہیں تاہم ہماری اردو زبان کی عمدہ رباعیوں میں شامل کی جاسکتی ہے۔

انیسویں صدی کے ربع آخر میں اردو رباعی کا جدید دور شروع ہوتا ہے۔ شعر و ادب کی دنیا میں وقت کی رفتار کے ساتھ بڑی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ادب کا ذوق اور تفریحی حیثیت بدل کر اجتماعی مقاصد روشناس کرائے گئے۔ مولانا الطاف حسین حالی کے بارے میں ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی رقمطراز ہیں:

> یہ صنف جو قدمائے فارسی کے یہاں فلسفہ و حکمت اور اخلاق و معرفت کے سنجیدہ مضامین کے لیے مخصوص تھی حالی کے اصلاحی مقاصد سے ہم آہنگ ہوگئی۔ حالی کی رباعیات قوم کا مرثیہ ہیں۔ حالی کے بعد جس نے رباعیات میں نام پیدا کیا وہ اکبر الہ آبادی ہیں۔ اکبر نے اپنے کلام میں مغربیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی کوشش کی۔

ان کے متعلق خواجہ درد لکھتے ہیں:

> اکبر کی رباعیاں جوانی گزارنے کے بعد کی تخلیق ہیں۔ ان میں زیادہ تر رباعیاں پند و نصائح سے بھرپور ہیں۔ یہاں تک کہ فن کے تقاضوں کو نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ کہیں کہیں فن کی حدود میں رہنے کی کوشش ضرور کی گئی ہے۔

ہر عہد کے رباعی نگاروں نے اپنے اپنے عہد کے سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی اثرات

Marfat.com

کو قبول کر کے انہیں رباعی کا موضوع بنایا۔ انیسویں صدی کا ربع آخر اور بیسویں صدی کی ابتدائی چھ سات دہائیاں اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ ان میں اردو رباعی کو موضوع کے لحاظ سے ایک خاص جہت ملی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

اس دور میں جوش، فراق، محروم، یگانہ وغیرہ ایسے چند ممتاز رباعی نگار پیدا ہوئے جنہوں نے رباعی کو نظم و غزل کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا۔ آج نظم و غزل میں جن رجحانات کی کارفرمائی ہے۔ ان سب کی ترجمانی رباعی میں ملے گی۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے جن شعرا کا ذکر کیا ہے یہ سب کے سب نیر اکبر آبادی اور علامہ نجم آفندی کے معاصرین میں شمار ہوتے ہیں۔ ان تمام شعرا نے بیسویں صدی میں اردو رباعی کو اہم اور قابل قدر صنف سخن بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہاں قبلہ نیر اکبر آبادی کی ایک رباعی جو شجرۂ اخرب کے دسویں وزن پر ہے درج کرتا ہوں:

دنیا میں محمدؐ کا وصی آیا ہے ہاں جس کی تمنا تھی وہی آیا ہے
نیر ہوا معمورۂ عالم روشن اسلام کی صورت میں علیؑ آیا ہے

رباعی نگاروں کے تذکرے میں زیادہ تر انہی شاعروں کو درخور اعتنا سمجھا گیا جن کی وجہ شہرت کسی اور صنف کے حوالے سے ہے لیکن انہوں نے رباعیاں بھی کہیں۔ لہٰذا انہیں رباعی نگاروں میں بھی شامل کیا گیا۔ لیکن ظلم یہ ہوا کہ بڑے شاعروں کی شہرت کی گرد میں وہ شاعر گم ہو کر رہ گئے جن کی شاعری کا بیشتر حصہ رباعیوں پر مشتمل ہے اور وہ محققین کی نظر سے اوجھل رہے جن میں ایک بہت نمایاں نام علامہ نجم آفندی کا ہے جو بڑے رباعی نگار ہیں اور ان کی رباعیوں کے تین مجموعے "تہذیب مودت"، "اسرار و افکار" اور "رباعیات نجم آفندی" کے نام سے موجود ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ جوش و فراق و محروم، یگانہ اور فانی بدایونی کے ہم پلہ رباعی نگار ہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ بلکہ کچھ نمبر ان کا بڑھا ہوا ہے۔ سید معزالدین قادری نے "اسرار و افکار" کے دیباچہ میں یہ بہت درست لکھا ہے۔ مظفر حیدری جن کا شمار ممتاز شاعروں میں ہے نجم آفندی کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

نجم صاحب نے جہاں مرثیہ، سلام، نوحہ کی ہیئت میں نئی نئی تبدیلیاں کیں وہاں تعمیر ملت کے پرجوش جذبہ کے تحت رباعی کو بھی نیا رنگ اور آہنگ بخشا۔ معاشرہ کی برائیوں پر ان کی گہری نظر ہے اور انہوں نے مسائل حاضرہ پر بے دھڑک تنقید کی۔

مسائل حاضرہ پر ان کی براہ راست بے باکانہ تنقید حقائق و معارف کا اک ایسا سیل رواں تھی جسے کوئی بھی نہ روک سکا۔ اپنے گرما دینے والے پیغامات کے ذریعہ قوم کو بیداری کے درس دیے۔ ان کی شیرانہ للکار، ان کی گرج ان کے پیغامات کے ایک ایک لفظ میں سنائی دیتی ہے۔ وہ ایک عظیم مفکر، عدیم المثال مصلح، صاحب طرز شاعر، بلند پایہ ادیب اور یگانہ روزگار نقاد تھے۔

Marfat.com

یہ ایک نقاد شاعر کا عقیدت مندانہ خراجِ تحسین ہی نہیں بلکہ حقیقتِ احوال کا اظہار بھی ہے۔ نجم آفندی صاحب کے یہاں رباعیوں میں اصلاحی انداز پایا جاتا ہے۔ وہ قوم کی کمزوریوں کی نشاندہی کر کے بیدار کرتے ہیں۔ بگڑی ہوئی قوم کی حالت سنوانا چاہتے ہیں۔ نجم آفندی صاحب کی چند رباعیاں ان کے مزاج کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں

دل میں نماز جلوہ گر ہے کہ نہیں روزہ کی حقیقت پہ نظر ہے کہ نہیں
اللہ کے حق کی فکر رکھنے والے بندوں کے حقوق کی خبر ہے کہ نہیں

اس رباعی میں نماز اور روزہ کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ رسمی طور پر نماز اور روزہ کا ادا کرنا کافی نہیں بلکہ ان دونوں کی حقیقت پر بھی نگاہ رکھو۔ مانا کہ تم نے نماز پڑھی اور روزہ بھی فرض سمجھ کر رکھ لیا لیکن یہی کافی نہیں ہے جب تک کہ اصل مقصد کی طرف تمہاری نظر نہ ہو یعنی بندوں کے حقوق بھی ادا کرتے ہو کہ نہیں۔ یہ بھی گریبان میں جھانک کر دیکھ لو ورنہ خالی عبادات تمہارے کام نہ آئیں گی۔

قرأت کی یہ ہنگامہ طرازی کیسی یہ شان نماز اے نمازی کیسی
سر سجدہ میں گردن پہ دو عالم کے حقوق اللہ سے یہ شعبدہ بازی کیسی

حیرت ابھی واقف اسرار نہیں تفسیر مودت سے خبردار نہیں
مانا شب عاشور میں بیدار ہے تو بیداری کے مفہوم میں بیدار نہیں

افطار کے سامان سے مطبخ بھر جائے جو زیر گلو جائے وہ لقمہ تر جائے
ہوتی نہیں ایسے روزہ والوں کو خبر فاقہ سے اگر کوئی پڑوسی مر جائے

اس رباعی میں بے حس لوگوں کی طرف اشارہ کر کے انہیں جھنجوڑنے اور بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ روزہ رکھ کر افطار کے وقت اپنے لیے تو میز پر انواع و اقسام کے کھانے چن لیے گئے لیکن بے حسی کا یہ عالم ہے کہ بھوک کی شدت سے اگر پڑوسی جاں بہ لب ہے تو اس کی کوئی پروا کیے بغیر مزے اڑا رہے ہیں چاہے وہ پڑوسی بھوک سے اللہ کو پیارا ہی کیوں نہ ہو جائے۔

یہ تعمیری اور اصلاحی رباعی کتنی اہمیت کی حامل ہے ذرا اس پر غور کیجیے۔ راقم الحروف کے دور میں یوں تو کوئی رباعی نگار نہیں لیکن میری نظر میں ایک نمایاں نام میرے محترم کرمفرما قمر رعینی کا ہے، زیادتی ہوگی کہ رباعی نگاروں کا تذکرہ ہو اور جناب قمر رعینی کا ذکر نہ ہو۔
بڑی صاف ستھری اور سہل ممتنع رباعی کہتے ہیں جو دل پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ یہ

Marfat.com

بڑے کہنہ مشق شاعر ہیں اور رباعی کہنے میں ید طولی رکھتے ہیں۔ ان کی رباعیوں کا مجموعہ جس کا نام ''روشنی اور سائے'' ہے چھپ چکا ہے۔ اس کی پاکستان کی معروف شاعر راغب مراد آبادی نے بھی تعریف کی ہے۔ انہوں نے ''رباعیات عمر خیام'' کا بھی منظوم ترجمہ اردو زبان میں کیا ہے۔ ''روشنی اور سائے'' میں انہوں نے پانچ عنوانات قائم کیے ہیں: ا۔ افکار و حقائق ۲۔آیات پنہاں ۳۔ ماضی کا تصور ہے کہ نیزے کی انی ۴۔کرب آگہی ۵۔ متفرقات۔
ان کی دو رباعیاں نمونہ کے طور پر درج کرتا ہوں:

بغض اور حسد سے دل کو خالی رکھیے　　اپنے کردار کو مثالی رکھیے
جو داد کے قابل ہو اسے دیجیے داد　　دشمن ہی سہی ظرف تو عالی رکھیے

جس کو نہ شکایت ہے کسی سے نہ گلہ　　جو سب سے ملا جسکو کوئی بھی نہ ملا
کیوں اہل نظر تم نے کہیں دیکھا ہے　　مجھ سا گل خوشرنگ جو صحرا میں کھلا

اب مضمون کو سمیٹتے ہوئے اپنی ایک رباعی پر ختم کرتا ہوں جو مولا علیؑ کی شان میں ہے۔

جب مدح علیؑ میں ہونٹ ہلتے ہیں
احباب کے غنچہٴ دل کھلتے ہیں
تعریف کو الفاظ کہاں سے لاؤں
تعریف کو الفاظ کہاں ملتے ہیں

☆☆☆

Marfat.com

نصاب شاعری اور فارسی بلتی لُغت

ڈاکٹر محمد حسن خان عماچہ ☆

سید ابوالحسن تحسین رضوی کشمیری سے منسوب اشعار کا یہ مجموعہ اپنے اندر دو حیثیتیں رکھتا ہے۔ نصاب شاعری اور فارسی اور بلتی زبان کی لغت۔ شاعر نے خود اس مجموعے کو نصاب کا نام دیا ہے جو کہ ساتویں بند کے پہلے شعر سے ظاہر ہے:

شکراً للہ کہ این نصاب انجام
یافت از لطف ایزدِ علام

اس زمانے میں شاعری کی اہمیت زیادہ تھی اور شاعر کو بھی معاشرے میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ چونکہ کتابوں کی طباعت اور اشاعت ابھی شروع نہیں ہوئی تھی اس لیے نظم کو اہمیت حاصل تھی کیونکہ یادداشت میں محفوظ رہنے کی صلاحیت اور لفظی تحریف سے محفوظ رہنے کی صلاحیت نثر کی نسبت نظم میں زیادہ ہوتی ہے۔ فارسی میں شاعری سکھانے کے لیے نصاب کی کتابیں تحسین سے پہلے بھی موجود تھیں لیکن وہ کتابیں فارسی۔ عربی، فارسی۔ ترکی وغیرہ زبانوں میں تھیں جن سے بلتستان میں بیٹھ کر شاعری سیکھنے والا استفادہ نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے شاید تحسین نے اپنے بلتستانی ہم وطنوں کی سہولت کے لیے فارسی اور بلتی زبان میں نصاب شاعری نظم کرنے کی کوشش کی۔

حضرت تحسین کی ولادت کے بارے میں کوئی تحقیق ابھی تک نہیں ہوئی۔ البتہ ان کی وفات ۱۱۹۰ھ میں ہوئی اور نصاب ۱۱۴۲ھ میں مکمل ہوا۔ اس لیے اگر ان کی عمر اس وقت کے اوسط کے لحاظ سے ۷۰ سال فرض کر لی جائے تو نصاب کی تکمیل اور تنظیم کے وقت ان کی عمر صرف ۲۲ سال تھی۔ اس لیے اس بات کا امکان زیادہ ہے کہ تحسین کے والد گرامی نے جن کا تخلص مقیم تھا، اپنے بیٹے تحسین کو شاعری سکھانے کے لیے نصاب کو نظم کرنے پر آمادہ کیا اور شاید نصاب کے انجام تک رہنمائی بھی کی ہو۔ کیونکہ اس عمر میں وہ اپنے والد کی رہنمائی کے بغیر شاعری کے ایک مجموعے کو نظم کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے، اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانا تو دور کی بات ہے۔

☆ ڈپٹی ڈائریکٹر ہیلتھ سروسز، ناردرن ایریاز، سکردو

Marfat.com

اس مجموعے کی اہمیت نصابِ شاعری کے طور پر نسبتاً زیادہ ہے لیکن یہ ایک مکمل نصاب نہیں ہے کیونکہ اس میں عربی کے سارے اوزان پر طبع آزمائی نہیں کی گئی۔ اس نصاب میں عربی کے صرف پانچ اوزان میں شاعری کی گئی ہے۔

باب اول	بحر متقارب مسدس مقصور	۱۶ ابیات
باب دوم	ایضاً	۱۹ ابیات
باب سوم	ایضاً	۴۹ ابیات
باب چہارم	بحر رمل مسدس محذوف یا مقصور	۶۶ ابیات
باب پنجم	بحر خفیف مسدس مخبون محذوف	۱۲۷ ابیات
باب ششم	بحر مجتث مثمن مخبون مکفوف	۶۴ ابیات
باب ہفتم	ایضاً	۴۷ ابیات

پہلے تین ابواب میں بحرِ متقارب مسدس مقصور یعنی فعولن فعولن فعولن فعول کے عربی وزن پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ پہلے باب کے مطلع کو اس حمدیہ شعر سے شروع کیا ہے اور آخر تک اسی قافیہ کو قایم رکھا ہے۔

بہ　نام　خداوند　حی　قدیم
جہان　دار　جان　بخش　رب　کریم

دوسرے باب کے تین ابتدائی اشعار حمدیہ ہیں اور ایک ہی قافیہ ردیف میں ہیں جبکہ باقی اشعار کا مطلع چوتھے شعر کو بنایا گیا ہے اور اسی قافیہ پر باقی اشعار کو باقی رکھا گیا ہے۔

الٰہی　ز　اعمال　شرمندہ　ام
تو　پروردگاری　و　من　بندہ　ام
مرا　از　مکافات　عصیان　چہ　باک
تو　خود　وعدہ　کردی　کہ　بخشندہ　ام
فعولن　فعولن　فعولن　فعول
بخوان　بحر　چون　مہر　تابندہ　ام
بیا　اول　بروسوں　و　بنشین　دوک
بیروں　رو　فیرول　سوں　بگویم　زیروک

تیسرے باب میں وزن یہی اپنایا گیا ہے لیکن قافیہ مختلف ہے۔ اس باب کے پہلے دو اشعار فارسی میں ہیں اور باقی اشعار لغت کے ہیں لیکن اسی قافیے میں ہیں:

Marfat.com

الا اے خردمند صاحب ہنر تو این چند دم را غنیمت شمر
زبان را بکن آشنا با سخن شوی تا بہ نزد ہمہ معتبر

چوتھا باب فاعلاتن فاعلاتن فاعلات یعنی بحر رمل مسدس محذوف یا مقصور کے وزن پر ہے۔ ابتدائی تین اشعار فارسی میں ہیں جن میں عربی وزن والا مصرع بھی شامل ہے۔ اس کے بعد لغت کے ۶۳ اشعار ہیں لیکن قافیہ فارسی مطلع ہی کے تابع ہے:

آمد ایام بہار بعد از خزان عندلیب آمد بصحنِ بوستان
بلبل طبعم نواہا میزند یادِ کشمیر و لقائے دوستان
فاعلاتن فاعلاتن فاعلات موجزن شو اندرین بحر روان
ون بود کذ و وژھمہ ساگ دان شد خبت را نام شو تو در بیان

پانچواں باب فاعلات مفاعلن فعلات (فعلن) یعنی بحر خفیف مسدس مخبون محذوف کے وزن پر ہے۔ اس کے بھی تین ابتدائی اشعار فارسی میں اور باقی ۱۲۴ اشعار لغت کے ہیں۔ سب اشعار قافیے کے لحاظ سے مطلع کے تابع ہیں:

طوطی طبع من بملک شکر گشت گویا بذوق تنگ شکر
گفتگویم بہ نزد دانش مند ہست عیب نہفتہ زیر ہنر
فاعلاتن مفاعلن فعلات غوطہ در بحر خور بگیر گہر
تھور و پابین و ہست بالا یار ایکھ ایکھ است آن سرو این سر

چھٹا باب مفاعلن فعلات مفاعلن یعنی بحر مجتث مثمن مخبون کے وزن پر ہے۔ ابتدائی تین اشعار اس باب میں بھی فارسی میں ہیں لیکن بیاض کے ناقل نے اس کے ابتدائی دو اشعار کو درج ذیل سرخی کے ساتھ لکھا ہے۔ اس رباعی کے بعد ایک الگ شعر فارسی میں وزن کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ باقی ۶۳ اشعار اسی قافیے کی متابعت میں ہیں۔

رباعی در مقام فراق

بیا کہ بے تو بود زندگی بسے دشوار مرا ز محنت ہجران جانگداز بر آر
از انجم است فزون تر بہ سینہ داغ فراق فغان ز دست جفاہای چرخ کج رفتار
مفاعلن فعلات مفاعلن فعلات بیا سفینہ خود را ز بحر بر بکنار
علی الصباح بود موتو، چی تو فصل بہار کہ غبیرفہ است سفیدا و شینگیل است چنار

ساتواں باب اور آخری باب بحر خفیف مسدس مخبون محذوف اور فعلات مفاعلن فعلن

Marfat.com

کے وزن پر ہے۔ حسب سابق اس کے بھی تین ابتدائی اشعار فارسی ہیں۔ اس کے مطلع میں اس نصاب کے مکمل ہونے کا اعلان اور مطلع ثانی میں شاعر کا تخلص موجود ہے۔ باقی ۴۳ ابیات لغت کے ہیں اور قافیے کے لحاظ سے مطلع کی متابعت میں:

شکراً للہ کہ این نصاب انجام   یافت از لطف ایزد علاّم
باد بر طبع حسن تو تحسین   اختصار است بہ ز طول کلام
فعلات مفاعلن فعلن   یادگار تو ماند در ایام
تھوقتو بالا اوقتو زیر بنام   دونو پیش است لزا عقب را نام

تحسین نے اپنے نصاب کے تین باب بحر متقارب مسدس مقصور کے لیے مخصوص کیے ہیں۔ شعرنامہ بھی اسی وزن پر ہے جو علاقہ شگر کے مشہور حکمران امام قلی خان کی فتوحات اور واقعات پر مبنی رزمیہ کتاب ہے۔ اس بات سے شگر کے اماچہ خاندان میں موجود روایت اور مفروضے کو تقویت ملتی ہے کہ یہ رزمیہ کتاب بھی تحسین ہی کی نظم کی ہوئی ہے کیونکہ متقارب مسدس مقصور تحسین کی بچپن میں اور بعد میں بھی پسندیدہ بحر رہی ہے۔

لغت کے لحاظ سے نصاب نامہ کو مکمل نہیں کہا جاسکتا لیکن اس میں فارسی اور بلتی میں ان چیزوں کے نام بتائے گئے ہیں جن کی ضرورت ہر آدمی کو عام زندگی میں ہوسکتی ہے، مثلاً گھر کا سامان، سفر کا سامان، کھانے پینے کی چیزیں، ہفتے کے دن، سالوں کی گنتی اور مہینوں اور موسموں کے نام۔ اس میں روزمرہ کاموں کے فعل امر اور نہی دونوں کو فارسی اور بلتی میں نظم کیا گیا ہے۔ ان باتوں سے لگتا ہے کہ نظم کرنے والے کی نظر میں ایران سے بلتستان آنے والے مبلغین اور مقامی آبادی کا ایک دوسرے کی زبان کو سمجھنا اور سمجھانا مقصود تھا۔ اس مجموعے سے مبلغین کو بلتی سیکھنے اور مقامی آبادی کو مبلغین کی زبان سیکھنے میں آسانی ہوتی تھی۔ اسی آسانی کی خاطر مختلف الفاظ کو جو خواہ اسم ہوں یا فعل، حروف کی ترتیب میں نظم نہیں کیا گیا بلکہ مختلف قسم کی چیزوں کو گروہوں کی صورت میں نظم کیا گیا ہے، مثلاً سبزیوں کو ایک ہی جگہ چند اشعار میں نظم کیا گیا ہے، گھڑ سواری کے سامان کا ذکر ایک ہی جگہ پر ہے، ایک سے لے کر ہزار تک کی گنتی بھی اسی طرح ایک ہی جگہ چند اشعار میں نظم کی گئی ہے۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ شراب کے ساتھ ہی حرمت کا ترجمہ ہے۔ اس کے علاوہ علاقہ کے اہم اور خاص باتوں کا ذکر اس مجموعے میں موجود ہے جن کا کسی بھی نووارد کے لیے جاننا ضروری ہوتا، مثلاً حکمران خاندانوں کے نام، ان کا مزاج اور ان کی حکمرانی کے طریقۂ کار بتائے گئے ہیں۔

☆☆☆

Marfat.com

جدید اردو شاعری پر فارسی روایت کی چھاپ

یوسف حسین ☆

بیسویں صدی دراصل عالمی افق پر تبدیلیوں، اختراعات اور انکشافات کی صدی ہے۔ اس صدی میں دنیا بھر میں نہ صرف زندگی کا ہر پہلو متاثر ہوا بلکہ ادب میں بھی نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ فارسی ادب کے لیے نئی صدی نے نئے رویوں، نئے اسالیب اور نئے فکری ذائقوں کے ساتھ ساتھ نئے فنی انداز کو بھی جنم دیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ شاعر اپنے پیشروؤں سے زیادہ اچھا ہے جس نے اپنے زمانے کا رنگ اپنایا۔ قدیم شاعری میں قافیہ، ردیف اور وزن کی ایک مخصوص ہیئت ہے جبکہ جدید شاعری کی اپنی ایک ہیئت ہے۔ اب غزل، قصیدہ، رزمیہ و صوفیانہ مثنویوں اور تشبیہات و استعارات کا عہد گیا۔ قدیم شاعری، قدیم روش، قدیم معاشرے اور قدیم ذہنیت کی پیداوار تھی وہ زمانہ اور اس کے سمجھنے اور سمجھانے کے ڈھنگ الگ اور تقاضے جدا تھے۔ اب عصرِ جدید میں سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل کو بیان کرنے کے لیے نئی ہیئت اور نئے لباس کی ضرورت ہے۔ نئے زمانے اور نئے صبح وشام میں رجحانات، احساسات اور فکری سطح بھی جدا ہے۔ انہی احساسات اور رجحانات کو بہتر طریقے سے بیان کرنے کا بہتر ذریعہ نظمِ عاری یا شعرِ آزاد ہے جسے رواج دینے والوں میں نیما یوشیج اور انکا عہد سرفہرست ہیں۔ فارسی ادب میں نیما یوشیج ادبی شعری تغیرات کے لیے بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئے۔ انہوں نے شعر میں فکری اور فنی دونوں سطحوں پر ایک نئی تبدیلی کی بنیاد رکھی جس کے نتیجے میں مشروطیت کے بعد ادبی دنیا میں ایک نیا فکری اور تکنیکی انقلاب آیا۔ نیما کا سب سے عظیم کارنامہ فارسی شعر میں تغیر لانا ہے۔ وہ کہتا ہے:

> میں بار بار کہتا ہوں کہ ہمارا ادب ہر لحاظ سے تبدیل ہونا چاہیے۔ محض مصرعوں کی کمی بیشی یا قافیے کو آگے پیچھے لانا کافی نہیں ہے، بلکہ بہتر یہی ہے کہ طریقہ کار تبدیل ہو۔ ہمیں دنیا کو ایک نیا ماڈل بنا کر دینا چاہیے۔

نیما یوشیج وہ پہلا شاعر ہے جس نے فارسی شاعری کو قافیے، ردیف اور مروجہ عروض کی

☆ استاد ادبیات فارسی، پشاور یونیورسٹی، پشاور

Marfat.com

پابندیوں سے نجات دلائی فنی لحاظ سے تغیر لانے کے علاوہ فکری لحاظ سے بھی اس ''بدعت'' کے مرتکب ہوئے۔ انہوں نے فارسی کے صوفی شعرا کے طرز کلام سے یکسر انحراف کیا۔ وہ رنج اور ہراس سے لبریز زندگی کا خاکہ پیش کرتا ہے۔ نظم آزاد لکھنے کا خیال نیما کے دل میں فرانسیسی شعرا کے کلام کے مطالعے کے بعد پیدا ہوا اور انہوں نے فرانسیسی آزاد نظم کو خیال و مدعا کے بیان کرنے کے لیے بہترین ذریعہ سمجھ کر اسی نہج پر فارسی میں بھی نظم لکھنے کی ابتدا کی۔ لوِن سرکسیان نے نیما کے متعلق کہا تھا کہ وہ فرانسیسی شاعر مالارمہ سے متاثر ہے۔(۱)

اس کے بعد دیگر جدت پسند اور نسبتاً آزاد خیال شعرا بھی اس کی تقلید میں پیش پیش رہے۔ اکثر جدید فارسی شاعروں میں کئی باتیں مشترک ہیں۔ فروغ فرخزاد کی شاعری کا موضوع عشق اور حُسن ہے۔ یہ مضامین بقول راشد عورت کے چہرے کے گرد گھومتے ہیں۔ فروغ اپنی شاعری میں عورت کے دل کے وہ اسرار بیان کرتی ہے جو خود عورت کی زبان پر کم آتے ہیں اور جن سے مرد اکثر صرف نظر کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ رومانویت میں بھی فروغ نے نام کمایا۔ ''تولدی دیگر'' میں سماج کے تمام مروجہ عقاید کے خلاف احتجاج پایا جاتا ہے۔

جدید شاعروں میں احمد شاملو نے نہ صرف شاعری کو قافیہ اور ردیف سے بلکہ وزن سے بھی آزاد کیا۔ جدید شعرا نے زندگی کے نئے نئے مظاہرات سے تاثر لیا۔ لاہوتی نے ایک الگ فکری محاذ کھولا۔ اس نے خدا کو ایک دیرینہ اسطورہ خیال کیا:

زندگی آخر سیر آید بندگی درکار نیست
بندگی گر شرط باشد زندگی درکار نیست

نہ صرف قدیم زمانے میں اردو شاعری کئی طرح سے فارسی شاعری سے متاثر ہوئی۔ وہ دور اردو شاعری کا ابتدائی دور تھا بلکہ جدید شاعری میں بھی اردو شاعری فارسی شاعری سے الہام لے رہی ہے۔ فارسی ادب کے متعلق اردو زبان شاعر ن۔م۔ راشد کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ راشد کے حسن انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے جنہوں نے ایسے شعرا کو متعارف کیا جو واقعی قابل ستائش ہیں۔ انہوں نے ایرانی ادب کے مشاہیر سے استفادہ کیا اور ان کی بعض اعلیٰ تخلیقات کو اردو میں منتقل کیا۔ انہوں نے ان تراجم کے انتخاب میں اپنے ذاتی ذوق اور پسند کا بڑا خیال رکھا ہے اور بیشتر ایسے شعرا کا انتخاب کیا جنکے خیالات سے وہ متفق تھے۔ ان میں سے بیشتر شعرا اور ان کی شاعری کے مخصوص انداز کی روشنی میں راشد کی ذہنی دلچسپیوں اور ان کی مخصوص رجحانِ طبع کو بھی سمجھا جاسکتا ہے۔

راشد کے منظوم ترجموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ترجمہ اصل روح کے

Marfat.com

ساتھ کیا ہے۔ ترجمہ کے متعلق گوئٹے نے کہا تھا: ترجمہ عالمی سرگرمیوں میں سب سے زیادہ اہمیت اور قدرو قیمت رکھتا ہے۔"(۲)

راشد نے فارسی اشعار کا ترجمہ کر کے گویا اہل پاکستان کے لیے جدید ایرانی ادب کے انکشاف کا ایک دریچہ کھولا تھا۔ فارسی شعرا کے یہ منظوم ترجمے موضوع اور ہیئت کے حوالے سے اپنے دور کی اہم اور معیاری نظمیں ہیں۔ انکے موضوعات متنوع ہیں اور بیشتر نفسیاتی پہلو رکھتے ہیں۔ راشد جو جدید ایرانی ادب سے خاطر خواہ واقف تھا، فروغ فرخزاد کے اشعار کو اس دور کا نمائندہ وژن یا اسلوب فکر خیال کرتا ہے۔ اس کے ان اشعار کا اردو ترجمہ ایسا ہے کہ ترجمے پر تخلیقی ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔

اردو اور فارسی ادب میں نیما یوشیج اور ن۔م۔ راشد دو ایسے جدت پسند شاعر ہیں جو اپنے مزاج کے اعتبار سے حدود و قیود کے پابند نہیں۔ ان کے شعری سفر میں بھی "ضبط" سے "اجتناب" عیاں ہے۔ راشد نے بھی نیما کی طرح پرانے فنی رویوں سے اختلاف کیا اور قوافی بحور کے مروجہ تصورات کی نفی کر کے نظم کے لیے نئی شعری ہیئت اور آہنگ اختراع کیا۔ راشد کہنہ اقدار کو مٹا کر جدت پسندی پر مصر ہے۔ ان کے بقول نیا آہنگ قدیم عروض کے اصولوں کے ذریعے نمایاں نہیں ہوسکتا تھا۔ لہٰذا اگر جدید شاعر طرز کہن سے گریز اختیار نہ کرتا تو نئے تجربات اور نئے احساس کو جوڑنے کا اور کوئی طریقہ نہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہیئت کے مقررہ اصولوں سے انحراف نے اردو شاعری کے گذشتہ جمود کو توڑنے میں مدد دی اور شاعروں کو بیان اور معانی کے وہ نئے راستے سجھائے جن سے ہماری قدیم شاعری ناآشنا تھی۔ راشد ایران میں اجنبی کے دیباچے میں شعری "بدعت" کے مرتکب ہونے کے متعلق دلیل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> جدید شاعری پر یہ اعتراض صحیح ہے کہ یہ سب کی شاعری نہیں ہے۔ بے شک یہ ہر شخص کی شاعری نہیں۔ یہ صرف اس شخص کی شاعری ہے جس کا شعور نیا ہو، جس کے تجربات اور مشاہدات نئے ہوں اور جس کی ترتیب میں نئے علم، ذوق اور احساس کا کوئی عنصر موجود ہو۔ جدید شاعر نے جس زمانے میں آنکھ کھولی ہے اس میں نہ صرف لباس بدلا ہوا ہے بلکہ مکانوں کی ساخت، آداب محفل، خاندانوں کی زندگی کے طور طریقے سب پہلے زمانے سے مختلف ہیں۔(۳)

اشیا کے متعلق نیما کی نظر زیادہ تر سماجی ہے۔ اسی طرح ن۔ م راشد کی شاعری کا بیشتر حصہ بھی سماجی مسائل سے لبریز ہے۔ نیما کا شعر فرد اور سماج سے مربوط ہے۔ یہ وابستگی اس کو مقصدیت کی راہ دکھاتی ہے۔ راشد کے ہاں بھی قسم قسم کے نقوش کی فراوانی پائی جاتی

Marfat.com

ہے۔ جدید ایرانی شاعروں کے منظوم ترجموں میں بھی مختلف قسم کی نفسیاتی اور تخیلاتی جہتیں غالب ہیں۔ راشد کے ہاں فرد کا سماجی اصولوں کے خلاف ردِعمل صاف دکھائی دیتا ہے۔اسی طرح نیما کی شاعری بھی کئی تضادات کا مجموعہ ہے۔نیما یوشیج دیگر شعرا کی طرح تین مسلسل شعری ادوار سے گذرا ہے۔

۱۔ خودشناسی

۲۔ معاشرے سے واقفیت

۳۔ جہان بینی

نیما کی خودبینی کا مرحلہ اسکی جوانی کا مرحلہ ہے۔ وہ اپنی شاعری کے خودبینی کے مرحلے سے گذر کر دوسرے دو مراحل کی طرف گامزن ہو جاتے ہیں۔ پہلے دور میں وہ اکثر اپنے ہمزاد یا سایہ سے مخاطب ہوتا ہے:

من نمی دانستم این ہمراہ کیست؟
قصدش از ہمراہی ودرکار چیست
ہر کجا بودم بہر جا می شدم
بود آن ہمراہ دیرین در پی ام

نیما یوشیج نے اسی ہمزاد یا اپنے سائے کے وصف میں ایک بے مثل نظم لکھی ہے جسکا ترجمہ ن۔م راشد نے اصل شعر سے بھی بڑھ کر دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ عنوان ہے ''سایۂ خود'':

من وتو کے مسافر خانے کی ڈیوڑھی میں
ایک شخص بیٹھا ہے مشعل نور لیے
ہر روز اور ہر رات من وتو کی خاطر
اس دور تک پھیلی ہوئی رات کا نقشہ
اسکے سامنے کھلا رہتا ہے...
وہ رات کے کھنڈر کی تہہ میں
ایک بجھے ہوئے شرارے کی دمک میں
جھانکتا ہے
ایک ایسے دن کی یاد میں، جس میں کوئی سورج نہیں تھا،
ایک ہی دردناک رات کی گردش کے اندر

Marfat.com

وہ ہزاروں چھپے ہوئے غم تازہ کرلیتا ہے۔
لیکن جب اچانک اسکی نظر اپنے سائے پر پڑتی ہے،
وہ سایہ جو خود اسکے وجود سے الگ نہیں
تو وہ مسکرا کر ایک نعرہ لگاتا ہے
اور پھر وقت کی پہنائیوں میں
من و تو کی آنکھوں سے غائب ہوجاتا ہے۔

نیما یوشیج جب ذاتی فکر میں ڈوب کر شعر کہتا ہے تو بیشتر وہ اپنے سائے یا ہمزاد ہی سے ہم کلام ہوتا ہے:

قصہ ای دارم من از ہمزاد خود
ھمرہ خوش ظاہر و بد خواہ خود
او مرا ہمراہ بودی ہر دمی
سیرہا میکردم اندر عالمی

ن۔م۔ راشد کے بقول نیما یوشیج کی شاعری قوم کی سرنوشت اور نئی بیداری کی عکاس ہے۔ نیما کو خیام کا اسلوب اور طرز فکر مرغوب تھا۔ چنانچہ خیام کی شاعری کی مماثلت نیما کی رباعیوں میں کافی نظر آتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ رومانویت میں منظر کشی کو سحر انگیز پیرائے میں بیان کرتا ہے۔ اس کی منظر نگاری ملاحظہ ہو:

جنبش دریا، خروش آبہا
پرتو مہ طلعت مہتاب ہا
ریزش باران، سکوت درہ ہا
پرش و حیرانی شب پرہ ہا
نالۂ جغدان و تاریکی کوہ
ھای ھای آبشار باشکوہ

نیما یوشیج کی یہ چند خصوصیات، اسلوب اور بنیادی امتیازات انہیں جدید نظم کی تاریخ میں ایک اہم مقام عطا کرتے ہیں۔ ان کی نظمیں محض اپنے عہد اور سماج ہی کا نہیں، جدید اور ترقی یافتہ ادب کا بھی ایک قیمتی اثاثہ ہیں۔ اسی طرح اردو ادب کے نامور اور بے مثل نظم نگار ن۔م۔ راشد فارسی روایت کے تسلسل میں شعر کہتے ہیں۔ ان کا فنی ڈھانچہ فارسی نظم کے مماثل ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد کے بقول راشد جدید عجمی روایت کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے فارسی

Marfat.com

کے جدید شعرا سے جدت کا الہام حاصل کیا۔وہ خود ''ماوراء'' کے دیباچے میں تبدیلی کی ضرورت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں" ہم تقدیر پرست ایشیائی عام طور پر زندگی کے کسی شعبہ میں بھی نیا قدم اٹھاتے ہوئے خوف اور بزدلی محسوس کرتے ہیں۔"

راشد کی سب سے پہلی صفت یہ ہے کہ وہ اپنے اسی ''خاکدان'' ایشیا کا پرستار ہے۔ راشد صرف اور صرف ایک ایشیائی شاعر ہیں:

میں کرتا رہا ہند و ایران کی باتیں
... اور اب عہد حاضر کے ضحاک سے
رست گاری کا رستہ یہی ہے
کہ ہم ایک ہوجائیں، ہم ایشیائی
وہ زنجیر، جسکے سرے سے بندھے تھے کبھی ہم
وہ اب سست پڑنے لگی ہے۔
تو آؤ کہ ہے وقت کا یہ تقاضا
کہ ہم ایک ہوجائیں۔ ہم ایشیائی!

آزاد نظم یا Blank Verse انگریزی اور فرانسیسی ادب سے فارسی اور اردو ادب میں وارد ہوئی۔ جدید فارسی شعرا نے اکثر و بیشتر اسی اسلوب میں نظمیں لکھیں۔ ن۔م۔ راشد نے بھی شہرت اسی آزاد نظم سے پائی۔راشد کے اشعار میں خیال آفرینی اور الفاظ کا چناؤ بے مثل اور عمیق ہے۔ ان کی نظموں میں ان کا اپنا ایک وژن جھلکتا ہے۔وہ انسانی جبلتوں کو تہذیب کا ایک بے باک اور سرکش لباس پہنانے کی تلقین کرتے ہیں:

یہ مل رہی ہے میرے ضبط کی سزا مجھ کو
کہ ایک زہر سے لبریز ہے شباب مرا
اذیتوں سے بھری ہے ہر ایک بیداری
مہیب و روح ستاں ہے ہر ایک خواب مرا
مگر یہ ضبط میرے قہقہوں کا دشمن تھا
پیام مرگ جوانی کم تھا اجتناب مرا

اقبالؒ کے خیال میں ماضی زندہ ہے لیکن راشد ماضی کو ایک مردہ روایت کے سوا کچھ نہیں سمجھتے۔ وہ ماضی سے ربط اور جنونی لگاؤ (Nostalgia) کو نئی تخلیق کی موت خیال کرتا ہے۔ وہ خود کہتا ہے کہ ہر شخص اپنی بے ہمتی سے تاریخ کی مبہم یادوں کا سہارا لیتا ہے۔

Marfat.com

رہِ جستجو میں
اگر اس لق و دق بیاباں میں
دیکھا پلٹ کر
تو پتھر کا بُت بن کے رہ جائیگا تو!
جہاں سب نگاہیں ہوں ماضی کی جانب
وہاں رہرو ہیں فقط عازم نارسائی!

راشد کو ماضی سے کوئی دلچسپی اور رغبت نہیں۔ جب ماضی سے رغبت اور وابستگی نہیں تو وہ لازماً ماضی کی پروردہ تہذیب و ثقافت اور اقدار سے بھی گریزاں ہے۔ وہ ہر ایک چیز کی ازسرنو تخلیق کرنے پر مصر ہے۔ وہ آج کے انسان (جوان) کو جہانِ تازہ کی طرف دوڑنے کا اشارہ، بلکہ سندیسہ دیتا ہے، وہ جہان جس میں سرور و نشاط اور بغاوت دمادم موجود ہیں:

جاگ اے شمعِ شبستان وصال
مخملی خواب کے اس فرش طربناک سے جاگ
لذت شب سے ترا جسم ابھی چور سہی
آمری جان، میرے پاس دریچہ کے قریب
دیکھ کس پیار سے انوار سحر چومتے ہیں
مسجد شہر کے میناروں کو
جنکی رفعت سے مجھے
اپنی برسوں کی تمنا کا خیال آتا ہے
سیمگوں ہاتھوں سے اے جان ذرا
کھول مے رنگ جنوں خیز آنکھیں
اسی مینار کو دیکھ
صبح کے نور سے شاداب سہی
اسی مینار کے سایہ تلے کچھ یاد بھی ہے
اپنے بیکار خدا کے مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانہ میں
ایک افلاس کا مارا ہوا مُلّائے حزیں
ایک عفریت اداس

Marfat.com

تین سو سال کی ذلت کا نشان
ایسی ذلت کہ نہیں جسکا مداوا کوئی

راشد جب اجتماعی مدار میں قدم رکھتا ہے تو سماج کے ہر سنگ و خشت تلے اُسے وہم وگمان اور انسانی حزن ملتا ہے۔ وہ سماجی قیود کی جکڑ بندیوں پر چار حرف بھیجتا ہے اور ان سے فرار کے راستے تلاش کرتا ہے:

آہ انسان کہ ہے وہموں کا پرستار ابھی
حُسن بے چارہ کو دھوکا سا دیے جاتا ہے
ذوقِ تقدیس پہ مجبور کیے جاتا ہے،
ٹوٹ جائیں گے کسی روز مزامیر کے تار
مسکرا دے کہ ہے تابندہ ابھی تیرا شباب
ہے یہی حضرت یزداں کے تمسخر کا جواب

راشد نوجوانوں کا آدرش رکھتا ہے۔ وہ اپنی خواہشات کو موقع غنیمت پر کھلم کھلا عیاں کرکے ''مساعدت وزدیدہ'' سے لطف اندوز ہونے کی تلقین کرتا ہے:

خوفِ موہوم تری روح پہ کیا طاری ہے
اتنا بے صرفہ نہیں تیرا جمال
اس زمستاں کی جنون خیز حسین رات کو دیکھ
آج اس ساعت وزدیدہ و نایاب میں بھی
تشنگی روح کی آسودہ نہ ہو
جب تیرا جسم جوانی میں ہے نیسان بہار...
آسمان دور ہے لیکن یہ زمیں ہے نزدیک
آ اسی خاک کو ہم جلوہ گہِ راز کریں

ان سطور کا مقصد دونوں فارسی اور اردو کے شعرا کی فکری ہم آہنگی اور اثر پذیری کا ایک جزوی جائزہ پیش کرنا اور ان خصوصیات اور سلیقوں کی جو دو مختلف ممالک میں مختلف زبانوں کے باوجود مشترک اور یکساں ہیں نشاندہی کرنا ہے۔ گویا یہ خصوصیات جغرافیائی قیود سے محدود نہیں بلکہ فکر انسانی ہر اس چیز کو دوسروں سے مستعار لیتی ہے جو اسے بھاتی ہو۔ راشد اس اثر پذیری کے متعلق اپنا نقطۂ نظر یوں بیان کرتا ہے:

فطرت انسانی جو دنیا کے ہر حصے میں شعر و ادب کا سرچشمہ ہے غیر منقسم اور یکساں ہے یہ

Marfat.com

فطرت جغرافیائی فاصلوں سے بہت کم بدلتی ہے۔ فرق صرف ظاہری حالتوں کا ہوتا ہے، باطنی کیفیات تقریباً ایک جیسی ہوتی ہیں۔

ایران میں اجنبی ان کی کتاب کا عنوان ضرور ہے لیکن وہ ایران میں رہتے ہوئے کبھی اجنبی نہ رہے بلکہ ایرانی مزاج میں گھل مل گئے۔ اسی کتاب میں لکھتے ہیں۔ "ایران نے راقم الحروف کے ذہن پر ایک مستقل اثر چھوڑا ہے اور اس ملک کے ساتھ ایک لازوال محبت اور شیفتگی پیدا کردی ہے۔"

بقول پطرس بخاری ایران کی زبان راشد کے رضائی بھائی کی زبان ہے اجنبی کی نہیں۔ (۴) اس شعر میں قریبی مماثلت ملاحظہ کیجیے:

اردو:

خدائے برتر
یہ داریوش بزرگ کی سرزمین
یہ نوشیروان عادل کی دادگاہیں
تصوف و حکمت و ادب کے نگارخانے...

فارسی:

خدای بزرگتر
این سرزمین داریوش بزرگ
این دادگاہ نوشیروان عادل
نگارخانۂ تصوف و حکمت و ادب

وہی انداز فکر اور سوچ جو ایک فرانسیسی ادیب کے ذہن میں ہوتے ہیں وہی ایک عجمی اور ایشیائی ذہن میں بھی ہوتے ہیں۔ ان کو نقالی نہ سمجھا جائے بلکہ اسے ہم نظری یا احساس یگانگت ہی سمجھنا چاہیے۔ فارسی ادب فکری مواد سے غنی ادب ہے۔ اردو ادبا اور شعرا اس فکری مواد سے استفادہ کرکے اعلیٰ تخلیقات تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔

حوالے

۱۔ ظہور الدین احمد، نیا ایرانی ادب، یونیورسٹی بک ایجنسی، لاہور، ص ۱۰۶

۲۔ ڈاکٹر رشید امجد، میرا جی کے تراجم، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ص ۲۱۷

۳۔ ن م راشد، ایران میں اجنبی، گوشہ ادب، لاہور، ۱۹۵۷، ص ۲۵

Marfat.com

۴۔ ایران میں اجنبی، تمہید از پطرس
۵۔ ”من و سلویٰ،“ ایران میں اجنبی

ماٰخذ

۱۔ اردو شاعری پر ایک نظر از محمد جمیل احمد، غضنفر اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۶ء
۲۔ از صبا تا نیما، از یحییٰ آرین پور، انتشارات زوار، تہران، ۱۳۷۲ ش
۳۔ ایران میں اجنبی از ن۔م۔ راشد، گوشۂ ادب، لاہور، ۱۹۵۷ء
۴۔ ن۔م۔ راشد از ڈاکٹر تبسم کاشمیری، نگارشات، لاہور، ۱۹۹۴ء
۵۔ میراجی شخصیت اور فن، ڈاکٹر رشید امجد، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور
۶۔ نیا ایرانی ادب از ڈاکٹر ظہور الدین احمد، یونیورسٹی بک ایجنسی، لاہور
۷۔ نیما و شعر فارسی از بہمن شارق، کتابخانۂ طہوری، تہران، ۱۳۵۰ ش

☆☆☆

Marfat.com

مرزا ادیب، محبتیں اور روشنیاں

ثاقبہ رحیم الدین ☆

آج مجھ پر یہ مشکل آن پڑی ہے کہ ابر بندھا ہے، پتوار ہاتھ میں ہے اور گہرے نیلے پانیوں سے پارا اُترا نہیں جارہا۔ پانی کی ان لہروں میں ایک چہرہ، ایک شخص ابھرتا ہے۔ یہ مرزا ادیب ہیں جو پچھلے سالوں میں بے شمار کہانیاں، نظمیں، ڈرامے، ناول اور پینسٹھ افسانے لکھ چکے ہیں۔ اکثر ادبی تخلیقات کے پس پردہ ایک شخص کا رواں دواں وجود موجود رہتا ہے۔ یہ وجود کبھی تخلیق کار کا اپنا وجود ہوتا ہے اور کبھی اس کا آئیڈیل انسان۔ ہر فن کے آئینے میں ایک انسان سانس لیتا ہے۔ مرزا ادیب کی کتابوں کے انبار میں، ان کو تلاش کرنا بڑا سہل ہے۔

ہاں تو میں گہرے نیلے پانیوں اور سمندر کنارے بسے شہر اور مرزا ادیب کی شخصیت کا ذکر کرنے چلی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب سندھ میں کراچی کے آسمان پر محبت بھرے بادل چھائے رہتے تھے، ٹھنڈی ٹھنڈی سمندری ہوائیں چلتی تھیں، اور معصوم بچے ریت میں گھروندے بناتے اور کھلکھلا کر ہنستے تھے۔ اس دیس میں ایک چھوٹی سی لڑکی رہا کرتی تھی جسے سمندر سے بڑا پیار تھا اور کتابیں اس کی پکی سہیلیاں۔ وہ کبھی کبھی اپنی عمر سے کہیں بڑی، مشکل اور ان جانی کہانیاں بھی پڑھتی رہتی تھی جو اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ کلفٹن کی ہوائیں جانتی ہیں کہ وہ چلتی کشتی میں، دھیرے دھیرے جھولا جھولتے میں، اونٹ کی پیٹھ پر سواری کرتے وقت، ریل کے سفر میں، اور گرمیوں کی خاموش دوپہر میں تنہا کتابیں پڑھتی تھی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب وہ اپنے پرائمری اسکول کی لائبریری سے مرزا ادیب کی کتابیں چچا چونچ، نکی کی گڑیا، جن ماسٹر، ماں کا خواب، بچوں کی عدالت، اور وطن کی پکار لے آئی۔

کچھ یادیں ایسی ہوتی ہیں جو دلوں کو دکھی کر جاتی ہیں اور کچھ ایسی ہوتی ہیں جو جی کو سدا ہنساتی اور بہلاتی ہیں۔ پاکستان کو قائم ہوئے بہت تھوڑا عرصہ گذرا تھا اور لوگ نیک ارادوں سے دوستی اور محبت کی بستیاں آباد کررہے تھے۔ اس لڑکی کے لیے یہ ٹوٹ پھوٹ اور مشکلات کا دور حیرت، جستجو اور ہمدردیوں کا دور تھا۔ وہ اپنے بابا کی انگلی پکڑ کر چلتی اور سندھ

☆ 9۔ جامی روڈ، راولپنڈی کینٹ

Marfat.com

کے وسیع صحراؤں میں فلاح و خدمتِ خلق کے اداروں کو نہ صرف آنکھ سے دیکھتی بلکہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے کتابیں اور دوائیاں تقسیم کرنا اور خیموں کی عام صفائی کا کام بھی کردیتی تھی۔ وہ اپنی پاکٹ منی بچا کر، مرزا ادیب کی کتابیں خریدتی اور شکارپور، میرپور، لیاری اور ملیر کے مکتبوں کے بچوں کو تحفے میں دیتی تھی۔ وہ مرزا ادیب کے لکھے ڈراموں کا مجموعہ ''ماں کا خواب'' میں ماں کا کردار پڑھ کر خوب روئی۔ وہ لڑکی جب دوسری جماعت میں آئی تو اس نے ان کے ڈرامے ''ہمدردی'' میں جگنو کا پارٹ ادا کیا اور انعام لیا۔ پھر یوں ہوا کہ دن گذرے راتیں گذریں اور سمندر اور اجلے آسمان کے ملاپ کو تکتے رہنے والی جگنو کو سب منوچہ، مینا اور ثاقبہ کہہ کر بلانے لگے۔

میں نے پہلی بار جب مرزا ادیب کو دیکھا تو میں نویں جماعت میں پڑھتی تھی اور اس تقریب میں ان سے زیادہ ان کے ہاتھوں کو معصومیت سے تکتی رہی اور پھر بیس سال کا عرصہ گذر گیا کہ ملاقات کا کوئی موقع نہ ملا۔ ۱۹۷۸ء کے بعد سے قلم اور قلم قبیلے کا رشتہ پھر سے جڑا۔

مجھے یہ سعادت ہمیشہ حاصل رہی کہ مرزا صاحب نے میری بہت ادنیٰ سی ادبی کاوشوں اور تنظیموں کو سرآنکھوں پر رکھا، خطوط لکھے، ہر قدم پر سراہا اور حوصلہ افزائی کی۔

اس بات میں بڑی صداقت ہے کہ ابتدائی زندگی کی محرومیاں اور خاص کر وہ جو شدت کی ہوں ضرور رنگ لاتی ہیں۔ جیسے بار بار زور کی چوٹ لگنے سے ہاتھ پیر یا تو ٹیڑھے ہوجاتے ہیں یا ٹوٹ جاتے ہیں۔ اس میں دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ ہاتھ پیر زیادہ مضبوط اور لچکدار ہوجاتے ہیں۔ محبتوں کی محرومیاں اور حد درجہ بے اطمینانی کی کیفیت اکثر قلب کو مردہ اور ذہن کو سرد کردیتی ہیں۔ کبھی کبھار پیارے رب کی خاص توجہ سے، شخصیت کے دامن میں خود بخود خوبصورت پھول کھل اٹھتے ہیں۔ کچھ یہی حال مرزا ادیب کا ہے۔

مرزا ادیب کا بچپن مٹی کا دیا ہے جس کے اندھیرے آنگن میں دو مجذوب صفت اور فاترالعقل چچا نظر آتے ہیں، سخت مزاج اور غصہ ور باپ موجود ہیں اور ایک ماں ہے جس سے ہمیشہ ہمیشہ بدسلوکی کی گئی۔ مرزا ادیب دادی کے پاس چلے گئے جہاں ان کی دادی نے ان کو پہلے بڑھئی اور پھر لوہار کے سپرد کیا کہ وہ کام سیکھ لیں۔ ان کے والد کو تعلیم سے بیر تھا اور انہوں نے مرزا صاحب کی کتابوں کا بستہ سراج الدین دھوبی کی بھٹی میں جھونک دیا تھا۔ مرزا جلتی کتابوں کے شعلوں کو دیکھ کر روتے رہے۔ ان کی تینوں بہنیں قطعی طور پر جاہل تھیں۔ لہٰذا ان کا ذہنی فاصلہ بہت تھا۔ اس تمام تر بوجھل فضا، معاشی تنگی اور تاریک ماحول میں مظلوم ماں

Marfat.com

روشنی کی کرن تھیں۔ وہ صبر، محبت، سادگی اور سچائی کا پیکر تھیں۔ آپ کے کردار پر ماں کی عظیم ہستی کی گہری چھاپ محسوس ہوتی ہے۔ مرزا ادیب اپنے دور کی تہذیب کے صحیح نمائندے ہیں جو اچھی بھی تھی اور سیاہ بھی۔ ان کے اپنے الفاظ اداسیوں سے بھرپور ہیں۔ ''یہ نسل ایک جگہ رک گئی تھی جیسے غار میں اتر گئی ہو اور باہر نکلنے کا راستہ نہ جانتی ہو۔ یہ نسل میری نسل ہے جو صرف جینا جانتی ہے اور یہ صرف اس وجہ سے کہ جینے پر مجبور تھی۔''

جب مرزا ادیب سے جان پہچان ہوجائے تو ان کی خوبیاں معصومیت، خلوص، انکساری اور نرم اور دھیما لب ولہجہ سب کو چپکے سے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

مرزا ادیب پریم چند کی طرح ادبی خدمت کو پوری عبادت سمجھتے ہیں۔ میرے خیال میں ان کو ساری عمر محبتوں اور روشنیوں کی تلاش رہی اور وہ ان دونوں جذبوں کے ناتے، بچوں کا ادب اور ڈرامے تخلیق کرتے رہے۔ زندگی کے آخری زمانے نے چاہے ان کو کتنی ہی نعمتوں سے نوازا ہو، محبتیں اور روشنیاں ان کی طلب اور جستجو ہیں۔ وہ یہی دو دیئے ہمیشہ بچوں کے ادب اور ڈراموں میں جلاتے رہے۔

مرزا ادیب کی طبیعت میں رچی بسی نیک دلی، طبعی لڑکپن، حیرت سے بھری آنکھیں وہ صفات ہیں جو آپ سے بچوں کا ادب تخلیق کرواتی رہیں۔ وہ صابر، شاکر اور درویش منش ہستی ہیں۔ بچوں کا ادیب اس دنیا میں کبھی کوئی صلہ نہیں پاتا۔ وہ تو اپنے کم سن اور بھولے قاری میں چھوٹی چھوٹی خوشیاں بانٹتا رہتا ہے۔ اس کے قاری تو کبھی اس کے شکر گزار نہیں ہوتے اور نہ عظمتوں کا اقرار کرتے ہیں۔ بچوں کا ادیب تو بس اپنے فطری تقاضے اور بچوں سے بے لوث پیار کی وجہ سے بڑے سرور کے عالم میں لکھتا رہتا ہے۔ وہ اپنے دوست بچوں کو ایسی دنیا میں لے چلتا ہے جہاں پھول ہی پھول ہیں۔ نور ہے۔ خوشبو ہے۔ پیار کے گیت ہیں۔ ہرے بھرے درخت، جگنو اور تتلیاں ہیں۔ کتابیں ہیں، جھولے ہیں۔ کھیل کھلونے ہیں۔ سورج اور چاند تارے ہیں۔ قہقہے ہیں۔ چھیڑ چھاڑ ہے۔ دوست، دوست اور ہر طرف دوست ہیں۔ یہ دنیا طلسماتی اور خیالی نہیں، یہ اس دنیا میں بھی بسائی جاسکتی ہے۔ بچوں کا ادب دلوں میں محبت کے بیج بوتا ہے۔ بچے بچپن ہی سے ان محبتوں کو تعمیر کرنا شروع کردیتے ہیں جو آگے چل کر زندگی کو آزادی، نیکی اور حسن کی قدروں سے بھر دیتی ہیں۔ بلاشبہ مرزا ادیب ہمارے بچوں کے بڑے مخلص ادیب ہیں۔

یوں تو مرزا ادیب اٹھہتر کتابوں کے مصنف ہیں اور ادبی دنیا میں تاریخی مقام رکھتے ہیں مگر میں بچوں کے لیے ان کی چند مقبول کتابوں کا مختصراً ذکر کروں گی۔ ان کی اکثر کتابوں

Marfat.com

میں رنگ برنگے خوشبو دار پھولوں اور پرندوں کا ذکر ہے۔ ''سونے کے پروں والا کبوتر'' میں آنے والی نسلوں کو ادب آداب، اچھی زبان و اسلوب سے واقف کرایا ہے۔ کہانی ''تتلی'' میں کمزوروں اور بے زبان جانوروں سے محبت کا درس ہے۔ ''چچا چونچ'' مزاحیہ ناول ہے جس میں علم کو چراغ بنادیا ہے۔ ''گڑیوں کا شہر''، ''پہاڑ کی چوٹی پر''، ''بادشاہ اور قاضی''، ''وطن کی پکار'' بڑی دلچسپ مہم جوئی سے لبریز، اور حب الوطنی کے جذبات سے بھرپور کتابیں ہیں۔ آپ نے اقبال کی نظموں پر مبنی ڈرامے ''ماں کا خواب'' بڑے دلنشیں انداز سے لکھے۔ اسی طرح ''بکی کی گڑیا'' اور ''ننھی عذرا کی اپنی امی سے شکایت'' بچوں کے ہر دلعزیز ڈرامے اور نظم ہیں۔ ''نانی اماں کی عینک'' ہنسانے والا پُرلطف ڈرامہ ہے اور ''تیس مار خان'' ''وہ ڈاکٹر نہیں تھا'' اور مشاعرے وغیرہ بچوں میں حد سے زیادہ پسند کیے جاتے ہیں۔

محبتوں میں کبھی اندھیرا نہیں آتا، بلکہ انسان کا سفر روشنی کی جانب اور پھر اصل نور کی طرف جاری رہتا ہے۔ یوں تو فنون لطیفہ کے سب ہی راستے اسی نور کی طرف کھلتے ہیں مگر ڈرامہ اس کا اولین اور بنیادی شعبہ ہے۔ یہ بے شک اصل زندگی کی نقل ہے اس قدر موثر کہ ہمارا ایمان ہوجاتا ہے کہ یہ حقیقی زندگی ہے یا یہ ایسی تھی، یا ایسی ہوسکتی ہے، یا ایسی ہوگی۔ ڈرامہ انسانی جذبات و احساسات کے اَن کہے، اچھوتے، اور اہم لمحات کو گرفتار کرتا ہے جسے ہم بغیر ڈرامے کے کبھی نہیں دیکھتے۔ ایک لحاظ سے تو ڈرامہ وسیع کینوس رکھتا ہے کیونکہ ایک اعلیٰ پائے کا ڈرامہ نگار اپنے ڈرامے میں جاندار کہانی پلاٹ، بہترین موسیقی، مؤثر کردار نگاری، اعلیٰ زبان و مکالمے، اچھی اداکاری اور اسٹیج کا بلند معیار پیش کرنا چاہتا ہے۔ لیکن دراصل ڈرامہ نگار خاکہ تیار کرتا ہے اور اس کی کامیابی کے لیے دیگر عوامل کارفرما رہتے ہیں۔ وہ ڈرامے جو صرف پڑھے جائیں ان میں اس میں قاری کو ایکٹرز اور ڈائریکٹر کا کام اپنے تخیل سے لینا پڑتا ہے۔

یہ امر قابل غور ہے کہ قیام پاکستان سے قبل اور آج بھی ہمارے ہاں ڈرامے کا فن افسوسناک حد تک عالمی سطح سے پیچھے ہے۔ اس کی وجوہات تاریخی، تہذیبی، مذہبی، معاشرتی اور سیاسی ہیں۔ ہمارے اجتماعی شعور اور مجلسی زندگی میں ڈرامہ صحیح معنوں میں کبھی نہ پھل پھول سکا۔ اکثر اہل ذوق اس ڈرامائی عنصر کو سراہتے ہیں جو دیگر اصناف افسانہ، ناول یا شاعری میں شامل ہوجاتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد لکھنے والے ڈرامہ نگاروں میں مرزا ادیب کا نام بہت ممتاز ہے۔ وہ ایک سچے آرٹسٹ یا ڈرامہ نگار کی طرح ڈرامہ تخلیق کرکے خود پس منظر میں چلے جاتے ہیں اور کرداروں میں جان آجاتی ہے۔ اگرچہ جدید ڈرامائی اصولوں کے تحت بے شمار نئے نکتے شامل ہوگئے ہیں مثلاً صوتی اثرات، روشنی، لباس و اداکاری اور میک اپ وغیرہ مگر اسلوب کی

Marfat.com

اہمیت میں ہرگز بھی کمی نہیں آئی۔ مرزا ادیب کا اسلوب سادہ اور دلنشین ہے۔ وہ متوازن الفاظ اور ضرورت کے مطابق جزئیات نگاری میں ملکہ رکھتے ہیں۔ وہ ہلکے پھلکے رواں جملوں اور سیدھے سادے مکالموں سے کرداروں کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈرامے کے ماحول اور مکالمے میں اچھی ہم آہنگی ملتی ہے۔ مثال کے طور پر ''بچہ گاڑی'' ڈرامہ میں رحمت اور مہراں کی بات چیت دیکھیے۔

مرزا ادیب نے پچھلے بیس پچیس سال سے ڈرامے کے فن کو جو توانائی بخشی وہ واقعی قابل تحسین ہے۔ اردو ڈرامے کی تاریخ میں مرزا ادیب نے سو سے زیادہ ڈرامے لکھ کر ایک سنہرے باب کا اضافہ کیا ہے۔ ان کے ڈرامے دس مجموعوں کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کے ڈراموں میں عام طور سے بہت زیادہ فلسفہ اور گہرائی نہیں ہے۔ اسی طرح ڈراموں کے موضوعات آسمان سے نہیں اترتے۔ مرزا ادیب کے ڈراموں میں ہمارے اکثریتی طبقے کے لوگ رہتے ہیں اور ان کے دکھ سکھ اور مشکلات سامنے آتی ہیں۔ ان کے پلاٹ میں بھی خاص پیچیدگی نہیں اور ہر جگہ روزمرہ کے جیتے جاگتے انسان بستے ہیں۔

مرزا ادیب نے یک بابی ڈرامے پر بھرپور توجہ دی ہے۔ تقسیم ہند و پاک کے بعد سے اردو ادب میں یک بابی ڈراموں کو جو مقبولیت ملی اس میں مرزا ادیب کو بہت زیادہ دخل ہے۔ یک بابی ڈرامے میں مرکزی خیال کو سادہ، مربوط اور مکمل ہونا چاہیے۔ یہ حساس صنف بڑے حساس قلم کا تقاضا کرتی ہے۔ اس مختصر ترین ڈرامے کی تعمیر میں ایک واقعہ، ایک مکالمہ، اور ایک غیر ضروری کردار کی موجودگی سارے کے سارے تاثر کو بگاڑ دیتی ہے۔

ایک خوبصورت مثال دیکھیے۔ مرزا صاحب ''سمندر کا دل'' میں حسناں سے کہلواتے ہیں۔ ''ماں کا دل تو ایک سمندر ہوتا ہے جس میں دکھوں اور غموں کے پہاڑ چپ چاپ سما جاتے ہیں۔'' اسی ڈرامے کے آخر میں حسناں دکھ اور کرب سے مر نہیں جاتی بلکہ ساری دنیا کے بچوں سے محبت کرنے لگتی ہے۔ مرزا ادیب کے چودہ ڈراموں کا مجموعہ ''ستون'' واقعی ان کی ادبی زندگی کا ستون ہے۔ ڈرامہ ''دروازہ'' معاشرے میں پھیلی منافقت کی بدبو کو سامنے لاتا ہے۔ ''حویلی'' میں انسان فرار پسند ہے اور سچائی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا ہے۔ ''اپنا اپنا روگ'' میں یہ روگ ہے کہ ذاتی مفاد زندگی کا اولین مقصد ہے۔ ڈرامہ ''قندیل'' میں بڑی خوبی سے خارجی واقعات کے تصادم کے پس پشت ایک داخلی کشمکش نظر آتی ہے۔ ڈرامہ ''فنکار'' میں وحدتِ زماں، وحدت مکاں، اور وحدتِ عمل نے اسے ایک مکمل یک بابی ڈرامہ قرار دیا ہے۔ ''لہو اور قالین'' میں زندگی کے سفاک پہلو کو بڑا المیہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

Marfat.com

"شیشے کی دیوار" پانچ ابواب پر مشتمل ڈرامہ ہے۔ اس ڈرامے میں دیوار کا گر جانا، دھوپ کا اندر آنا، علامتی طرز اظہار میں نیکی، خیر اور آزادی کی فتح دکھائی گئی ہے۔ یہ ڈرامہ بلاشبہ مرزا صاحب کا شاہکار ڈرامہ ہے۔ ان کے ڈراموں میں ڈرامائی تاثر کو اہمیت حاصل رہی ہے۔ مثلاً سراج الدولہ، نواب نجابت خان اور حضرت محل پر لکھے گئے ڈرامے بہت سراہے گئے۔ وہ تاریخی ڈراموں میں معروف اور غیر معروف کرداروں کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ یہ بڑی خوش آیند بات ہے کہ مرزا ادیب کی کتابوں کے ترجمے روس، چین، بنگلہ دیش اور بھارت میں ہو رہے ہیں اور بھارت میں ان کی ادبی خدمات پر پی ایچ ڈی کی جا رہی ہے۔

آج اس انسانی اقدار کے ٹوٹ پھوٹ کے دور میں، خودغرضیوں کی آندھیوں میں، مرزا ادیب کو بچوں کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ان کو روشنیوں کی خاطر اور روشنیوں پر ایمان کی خاطر، ڈرامے کی حسین اور کلیجے میں اتر جانے والی صنف کو آگے بڑھاتے رہنا چاہیے۔ ہمیں یہ دو باتیں مرزا ادیب سے کہنا ہیں۔

☆☆☆

Marfat.com

اردو انشائیہ کی جمالیات

پروفیسر جمیل آذر☆

عجیب اتفاق ہے کہ سوائے گیت نگاری کے تمام بڑی نمائندہ اصناف ادب مغربی ممالک سے ہی برصغیر میں متعارف ہوئیں اور پروان چڑھیں۔ جس طرح افسانہ اور ناول مغرب کی دین ہیں اسی طرح انشائیہ بھی مغرب کی عطا ہے اور جس طرح افسانہ اور ناول نے برصغیر میں اپنی انفرادیت منوائی ہے اسی طرح انشائیہ نے بھی یہیں اپنی انفرادیت کا سکہ جمایا ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ برصغیر میں انشائیہ واحد صنفِ ادب ہے جس کی ابتدا اور ارتقائی منازل کا سہرا پاکستان کے سر ہے اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جتنی مخالفت اس صنف ادب کی ہوئی شاید ہی کسی اور صنف اظہار کی ہوئی ہو۔ تاہم انشائیہ کو اب اپنا سفر طے کرتے تقریباً پچاس سال گذر چکے ہیں اور اسے اہل فکر و نظر نے نہ صرف شرفِ قبولیت بخشا ہے بلکہ اسے پاکستان کی اہم اصنافِ اظہار میں بھی شمار کیا جانے لگا ہے۔

اکثر طالبان ادب پوچھتے ہیں کہ انشائیہ کی جامع تعریف کیا ہے، اس کے خدوخال کیا ہیں، ہم اسے کس طرح دوسری اصناف سے متمیز کرسکتے ہیں؟ یقیناً یہ اہم سوالات ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ کسی بھی صنف اظہار کی جامع اور مانع تعریف ممکن نہیں، تاہم ہر صنف کے کچھ نہ کچھ مبادیات و مقتضیات ضرور ہوتے ہیں جن کی بنا پر ہم اسے دوسری اصناف سے نہ صرف متمیز کرسکتے ہیں بلکہ پہچان بھی سکتے ہیں، مثلاً شاعری میں وزن اور آہنگ، داستان میں کہانی، ناول میں پلاٹ اور کردار، اور ڈرامہ میں اسٹیج اور عمل وغیرہ کے مقتضیات کا ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح انشائیہ کے بھی کچھ بنیادی عناصر ہیں جو اس کی شناخت بنتے ہیں۔ جس طرح دیگر اصناف ادب میں سے کسی ایک کی بھی جامع اور قطعی تعریف نہیں ہوسکتی اسی طرح انشائیہ کی قطعی تعریف بھی مشکل ہے، تاہم اردو انشائیہ کی جمالیات پر روشنی ڈالنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ انشائیہ کی اجمالاً کیا تعریف کی گئی ہے۔ سولہویں صدی کا مفکر ادیب بیکن (Bacon) جس کی نمایاں پہچان انشائیہ نگاری ہے، اپنے ایسیز (Essais) کو افکارِ پریشان (Dispersed

☆ مکان نمبر B/874، سیٹلائیٹ ٹاؤن، راولپنڈی

Marfat.com

(Meditations) کے نام سے یاد کرتا ہے۔ بیکن کے ہاں چونکہ انشائیوں کا انداز معروضی ہے اس لیے اس کے ہاں اپنی ذات (Self) کا انشراح نہیں ہے۔ اس کے برعکس مونٹین (Montaigne) جس نے فرانس میں سولہویں صدی ہی میں بیکن سے ذرا قبل اس صنف اظہار کا آغاز کیا تھا اپنے مضامین (Essais) کے مجموعہ کے بارے میں کہتا ہے:'' اس کتاب میں میرے پیش نظر شخصی اور ذاتی زندگی کے سوا اور کچھ نہیں۔ میں نے ایسیز دوستوں اور عزیزوں کی تسکین اور خوشنودی طبع کے لیے لکھے ہیں تا کہ میرے مرنے کے بعد وہ مجھے یاد رکھیں۔'' پرلطف بات یہ ہے کہ مونٹین کے انشائیے محض شخصی اور ذاتی نہیں رہتے بلکہ خواص و عوام کی دلچسپی اور مسرت کا سبب بھی بنتے ہیں۔ یوں وہ ذاتی ہونے کے باوصف غیر ذاتی بھی بن جاتے ہیں۔ان میں فلسفیانہ افکار کی لہریں رواں دواں ہیں۔ وہ مختلف اور دلچسپ عنوانات سے ایسے لکھتا ہے مثلاً '' جھوٹوں پر''، '' پڑھائی پر'' اور '' سست گفتاری پر''۔ مونٹین بات کا آغاز اپنی ذات سے کرتا ہے اور پھر دوسروں کی ذات تک پہنچ کر پوری کائنات کا احاطہ کرلیتا ہے، تاہم وہ آخر میں آکر اپنی ہی ذات پر ایسے کو ختم کرتا ہے۔ وہ مشاہدے اور تجربے سے بات شروع کرتا ہے پھر اس میں افکار کا رنگ بھرتا ہے لیکن کچھ اس طور سے کہ قاری محسوس کرتا ہے کہ یہ پیرہن فکر تو اس کا اپنا ہے۔ یہی مونٹین کے انشائیوں کی کشش کا راز ہے۔ دیکھیے اپنے ایک انشائیہ '' گفتگو کے فن پر'' میں وہ کس بے تکلفی سے کہتا ہے '' میں ان دوستوں کی صحبت پسند کرتا ہوں جو مجھے رگیدتے ہیں نہ کہ ان کی جو مجھ سے سہمے سہمے رہتے ہیں۔''

اس کے ہاں انشائیہ کا تانا بانا ذات سے شروع ہوتا ہے اور فلسفیانہ باریکیاں ننھے ننھے جزیروں، مرغزاروں، وادیوں اور نخلستانوں میں ڈھل جاتی ہیں جن کی صحت مند فضا میں وہ اس طرح اطمینان اور مسرت کا سانس لیتا ہے جس طرح کوئی بچہ اپنا کھویا ہوا کھلونا پا کر۔

اس کے ہاں انشائیہ کی مختصر تعریف ''Personal Light Essais'' یعنی ''شخصی ہلکے پھلکے مضامین ہے۔'' اٹھارویں صدی کے نقاد ڈاکٹر جانسن نے انشائیے کی تعریف کرتے ہوئے اسے ''A loose sally of the mind'' یعنی '' ذہن کی آوارہ خرامی'' کے نام سے یاد کیا۔

پاکستان میں ڈاکٹر وزیر آغا پہلے مفکر، ادیب اور نابغۂ روزگار نقاد ہیں جنہوں نے انشائیہ کے عناصر ترکیبی اور اس روح کو دریافت کیا جو انگریزی کے بلند پایہ انشائیوں کے اندر برقی رو کی طرح جاری و ساری ہے۔ انہوں نے نہ صرف بلند پایہ انشائیے سپرد قلم کیے بلکہ گراں قدر تنقیدی مضامین لکھ کر اس صنف ادب کے واضح نقوش کی نشاندہی بھی کی۔ اپنے ایک مضمون '' انشائیہ کے خدوخال'' میں وزیر آغا نے انشائیہ کی ایک بڑی جامع تعریف ان

Marfat.com

الفاظ میں کی ہے:

انشائیہ اس صنف نثر کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیاء یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طور گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آکر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

وزیر آغا نے اس تعریف میں جن نکات کی واضح نشاندہی کی ہے وہ انشائیہ نگار کے اسلوب کی تازہ کاری، کسی شے یا مظہر کے مخفی مفاہیم کی دریافت اور انشائیہ نگار کا ایسے جہان معنی کا نظارہ کرنا کہ اس کا شعور اپنے مدار کو پار کرکے ایک نئے مدار کو قائم کرنے میں کامیاب ہوجائے۔ انشائیہ کی یہ تعریف انہوں نے ۱۹۸۲ء میں کی تھی اور اس تعریف میں اردو انشائیہ کی جمالیات کے واضح اشارات ملتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے انشائیوں پر تنقیدی مضامین کا مجموعہ بعنوان ''انشائیہ کے خدوخال'' ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کتاب کے حرف آغاز میں انہوں نے ایک نہایت اہم بات کی:

جب بھی میں کوئی نیا انشائیہ لکھتا تو مجھ پر اس صنف کا کوئی نہ کوئی چھپا ہوا پہلو ضرور آئینہ ہوجاتا جسے میں اپنے لیے ایک نئے پتوار کے طور پر قبول کرلیتا تاکہ کشتی کو ڈگمگانے سے روکا جاسکے۔ یوں آہستہ آہستہ انشائیہ کے انفراسٹرکچر سے تعارف حاصل ہوتا چلا گیا۔ ہر صنف بجائے خود ایک طرح کی کائنات اصغر ہے۔ لہٰذا لازم ہے کہ لکھنے والا اس کائنات کے اندر سفر کرے اور اس سفر کے دوران اس صنف کا مسلسل عرفان حاصل کرتا جائے۔ انشائیہ کی صنف بھی ہمہ جہت، نقاب اندر نقاب اور بے حد پراسرار ہے۔ چنانچہ اس کی تنقید بھی چند بندھے ٹکے خطوط میں جکڑی ہوئی نہیں رہ سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ انشائیے کے زاویے بیشمار اور اس کے امکانات لامحدود ہیں

انشائیہ فہمی اور اس کی تعریف کے سلسلے میں ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر صاحب نے اپنے چار انشائی مجموعوں: *خیال پارے*، *چوری سے یاری تک*، *دوسرا کنارہ* اور *سمندر اگر میرے اندر گرے* کی اشاعت کے بعد کیا۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اصناف ادب جامد نہیں ہوتیں بلکہ ہمیشہ نئے امکانات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوتی ہیں جنہیں ہم دریافت کرتے ہیں۔ انشائیہ کے بارے میں ان چند ایک تعریفوں کے بعد آیئے دیکھتے ہیں کہ اردو انشائیہ کی مجموعی جمالیات کیا ہیں جو انشائیہ کے خدوخال اور اس کی ہیئت میں نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔

انشائیہ نگار کے پیش نظر موضوع اہم نہیں ہوتا۔ کوئی بھی موضوع ہوسکتا ہے۔ اصل بات تو اس کی اپنی شخصیت ہے۔ شخصیت سے یہاں مراد اس کی ذہنی سوچ ہے۔ اس کے ذہن کی تازگی، سوچ کی زرخیزی، شگفتگی اور نکھار، انشائیہ کی جمالیات میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ انشائیہ میں انشائیہ نگار کی ذات بہت اہم

Marfat.com

ہوتی ہے کیونکہ یہ واحد صنف ادب ہے جس میں انکشافِ ذات کا عمل پورے جذبہ کے ساتھ منعکس ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار بنے بنائے فکری سانچے سے ہٹ کر شخصی سطح پر اپنی سوچ کی انفرادیت کا مظاہرہ کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ انشائیہ ہمارے اجتماعی رویہ سے ہٹ کر انفرادی فکری رویہ کا مظاہرہ کرتا ہے۔ انشائیہ نگار بنیادی طور پر منفرد مزاج اور منفرد سوچ کا حامل ہوتا ہے۔ انشائیہ واحد صنف ادب ہے جس میں قلمکار اپنے تئیں انوکھے انداز میں سوچتا اور لکھتا ہے۔ وہ کسی بھی قاعدہ اور کلیہ کا پیروکار نہیں ہوتا۔ وہ ایک آزاد منش انسان ہے اس کے ذہن میں جو کوئی خیال یا کوئی بات سما جائے وہ اسے بھرپور جذبے، جوش اور خلوص کے ساتھ پیش کردیتا ہے۔ وہ اپنے خیال کو کسی ممانعت کے بغیر بیان کرنے کا فن جانتا ہے۔ انشائیہ نگار اشیا اور مظاہر کو کبھی صوفی کی نظر سے دیکھتا ہے تو کبھی فلاسفر کے سُبھاؤ میں ان پر گہری نظر ڈالتا ہے اور کبھی تماشائی کی صورت زندگی کے مختلف گوشوں میں حسن و رعنائی کا جلوہ دیکھتا ہے۔ غالب کا یہ شعر:

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

انشائیہ نگار کی شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ غالب کو اپنے زمانے میں عام شعرا کی تضحیک کا نشانہ بننا پڑا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ وہ منفرد ذہن کا حامل انسان تھا۔ اس نے ایک ایسا رنگِ تغزل اختیار کیا جو عام ڈگر سے مختلف تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ غالب بنیادی طور پر انشائی ذہن کا مالک تھا جس کا اظہار ان کے خطوط میں بھرپور طور پر ہوتا ہے۔ انشائیہ انفرادی فکر و خیال کی غمازی کرتا ہے۔ انشائیہ نگار اپنے مزاج میں سب کچھ ہوسکتا ہے مگر قنوطی ہرگز نہیں۔ انشائیہ نگار ایک آزاد منش، تعصب و ریا سے مبرا انسان دوست طبیعت کا مالک ہوتا ہے جو خیال کی آوارہ خرامی کو ضبطِ تحریر میں لا کر ہمیں ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ انشائیہ زندگی کے بندھے ٹکے نمونوں، اصولوں اور مقررہ راستوں سے ہٹ کر نئے پیکروں اور تمثیلوں کو تخلیق کرتا ہے۔ وہ اجتماعی سوچ کے برعکس شخصی سوچ کو بروئے کار لا کر مظاہرِ حیات کے نئے گوشوں اور پہلوؤں کو تلاش کرتا ہے اور ان میں نئے معانی دریافت کرتا ہے، مثلاً اگر کلیہ یہ ہے کہ عالم کی فراست انسان کا قیمتی سرمایہ ہے تو انشائیہ نگار اپنی فکری بصیرت سے عالم کی جہالت کو موضوع بنا کر تصویر کا دوسرا رخ پیش کردیتا ہے۔

انشائیہ نگار ہمیں وسعت آشنا کرتا ہے۔ وہ منظر کے ایک مدار سے نکال کر ہمیں دوسرے نئے مدار میں لاتا ہے۔ یہاں اگر میں وزیر آغا کے ایک انشائیہ "چرواہا" سے دو

Marfat.com

اقتباسات پیش کردوں تو اس اہم نکتہ کو بہ آسانی سمجھا سکتا ہے:

چرواہے کی چھڑی دراصل ہوا کا ایک جھونکا ہے اور ہوا کے جھونکے کو مٹھی میں بند کرنا ممکن نہیں۔ اسے تو دیکھنا بھی ممکن نہیں۔ البتہ جب وہ آپ کے بدن کو مس کرتے ہوئے گذرتا ہے تو آپ اس کے وجود سے آگاہ ہوجاتے ہیں کیونکہ بنیادی طور پر ہر جھونکا ایک پیغام بَر ہے۔ وہ ایک جگہ کی خوشبو دوسری جگہ پہنچاتا ہے۔ یہی کام چرواہے کا بھی ہے۔ تمام لوک گیت چرواہوں کی زبان پر لرزتے، ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے رہتے ہیں...

اب اس انشائیے کا ایک اور اقتباس دیکھیے:

میں تو صرف ان چرواہوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو درویشوں کے ریوڑ چراتے چراتے ایک روز انسانوں کے ریوڑ چرانے لگتے ہیں تب ان کی چھڑی عصا میں بدل جاتی ہے۔ ہونٹوں پر اسم اعظم تھرکنے لگتا ہے۔ وہ انسانی ریوڑوں کو پہاڑ کی چوٹی پر لا کر یا صحرا کے سینے میں اتار کر یا دریا کے کناروں پر بکھیر کر اس بات کا انتظار کرتے ہیں کہ یہ ریوڑ اپنی کہنگی اور یبوست کو گندی اون کی طرح اپنے جسموں سے اتار پھینکیں..

اس انشائیے کے کئی پرت ہیں۔ ہر پرت ہمیں عرفان کے ایک مدار سے نکال کر دوسرے مدار میں لے جاتا ہے۔ انشائیہ نگار اپنی بات کا آغاز عام چرواہے سے کرتا ہے پھر خیال کی اڑان کے ساتھ وہ ہمیں ان چرواہوں تک لے جاتا ہے جو ہماری لوک داستانوں اور ثقافت کے خالق اور امین ہیں۔ پھر خیال کی ایک اور اڑان کے ساتھ، ہمیں ان چرواہوں تک پہنچاتا ہے جو ہماری روحانی اور تہذیبی تربیت کرتے ہیں اور جو خود "تسبیح کے دانوں کی طرح پوری کائنات میں بکھر جاتے ہیں۔"

یہ انشائیہ ہمیں جہاں وسعت نظر عطا کرتا ہے وہاں یہ انکشاف ذات کی خوبصورت مثال بھی ہے جو انشائیہ کی جمالیاتی پہچان میں اہم نکتہ ہے۔ اس انشائیہ میں مصنف کے گہرے مطالعے، باریک مشاہدے اور منفرد سوچ کی خوبصورت جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

انشائیہ نگار زندگی کا بیک وقت زائر (Pilgrim) بھی ہے اور مسرور تماشائی (Amused Spectator) بھی۔ وہ زندگی کے پرشکوہ مناظر سے لطف اندوز ہوتا ہے اور میلوں ٹھیلوں میں شرکت کرتا ہے، سرکس میں بازی گروں، فن کاروں، ہاتھیوں اور شیروں کے کرتب دیکھ کر حیرت زدہ ہوتا ہے۔ حیرت و استعجاب انشائیہ کی جمالیات کے اہم عناصر ہیں۔ انشائیہ نگار زندگی کی رنگارنگی کو تجسس، حیرت اور استعجاب سے دیکھتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ مسرت کے ان پرکیف لمحات کو گرفت میں لا کر انشائیہ کی زینت بناتا ہے۔ وہ زندگی، فطرت اور کائنات کا کھلی آنکھ سے مشاہدہ کرتا ہے اور روزمرہ کے معمولات میں غیر معمولی بات اور پیش پا افتادہ اشیا میں چھپا ہوا انوکھا پہلو پالیتا ہے۔ انشائیہ نگار عام لوگوں سے مختلف ہوتا ہے۔

Marfat.com

عام لوگ آنکھیں رکھتے ہوئے بھی آنکھ کے لینز (Lens) کو کیمرہ مین کی طرح استعمال نہیں کرتے جبکہ انشائیہ نگار اپنی آنکھ کے لینز کو کیمرہ مین کی طرح استعمال کرتا ہے اور یوں وہ زندگی کا مشاہدہ ، مطالعہ، تجزیہ، ترجمانی اور عکاسی اپنی جمالیاتی سوچ کے مطابق کرتا ہے۔ دسمبر کے مہینہ کی آمد پر انور سدید کی حیرت دیدنی ہے۔ وہ جس محبت، یگانگت، جذبے اور جوش سے اس کی آمد کو اپنے خوبصورت انشائیہ ''دسمبر'' میں قلمبند کرتا ہے، وہ انشائیے کی جمالیات کی خوبصورت مثال ہے:

دسمبر آتا ہے تو کسی مہمان کی طرح کال بیل (Call Bell) دبا کر اپنی آمد کا اعلان نہیں کرتا، بلکہ ایک شریر بچے کی طرح پائیں باغ کی دیواریں پھاند کر پہلے گھر کے صحن میں آتا ہے، پھر برآمدے میں پلاسٹک سے بنی ہوئی کرسی پر اکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ میری بیوی اس کے مخصوص قدموں کی چاپ پہچانتی ہے۔ وہ جلدی سے آتش دان میں آگ جلا کر کرسیوں کو اس کے گرد نصف دائرے میں ڈال دیتی ہے۔ درمیان میں ایک چھوٹی سی میز رکھ دیتی ہے۔ اس میز پر بھاپ اگلتی نوبیاہتا لیڈی پٹن ٹی کوزی کا گھونگھٹ اوڑھے ہمہ تن اشتیاق بنی منتظر ہوتی ہے۔ سامنے چاندی کی چھوٹی چھوٹی کٹوریوں میں پستہ بادام اور کشمش آجاتے ہیں۔ ہم سب افراد خانہ جو گزشتہ گرمیوں میں جزواً جزواً اکائیوں میں بٹ گئے تھے، اب ایک دوسرے کے اتنے قریب آجاتے ہیں جیسے کٹی ہوئی پھانکیں دوبارہ تربوز میں سما گئی ہوں۔

اس انشائیہ میں ماہ دسمبر ایک نئے اور تازہ انداز سے جلوہ گر ہوتا ہے اور ہمیں حیرت و مسرت سے ہمکنار کردیتا ہے۔ انشائیہ نگار اپنی فنی بصیرت اور حسن نظر سے اسے مشخص (Personify) کرکے ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اور ہم بھی دسمبر کی اس آمد سے اور اس سے مل کر خوش ہوتے ہیں۔ انشائیہ نگار دسمبر کے مہینہ میں جس شادمانی سے خود سرشار ہوتا ہے وہ ہمیں اس میں نہ صرف شرکت کی دعوت دیتا ہے بلکہ اپنے افرادِ خانہ کے ساتھ ایک عزیز دوست کی طرح شامل کرلیتا ہے۔ انشائیہ نگار کا بنیادی منصب بھی ہے کہ وہ ہمیں مسرت کے لمحات بہم پہنچائے۔ انشائیے کی جمالیات میں مسرت (Delight) کا عنصر بہت ہی اہم ہے۔ یہاں مسرت سے مراد ذہنی اور روحانی انبساط ہے نہ کہ ٹھٹھا مخول اور طنز و مزاح۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اس نکتہ کو اپنے ایک مضمون ''انشائیہ کیا ہے''؟ میں اس طرح بیان کیا ہے:

بنیادی طور پر انشائیہ کے خالق کا کام ناظر کو مسرت بہم پہنچانا ہے۔ اس کے لیے وہ طنز سے کچھ زیادہ کام نہیں لیتا، کیونکہ طنز ایک سنجیدہ مقصد لے کر برآمد ہوتی ہے اور اس کے عمل میں نشتریت کا عنصر موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک اچھے انشائیہ میں طنز کبھی بھی مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک ''سہارے'' کا کام دیتی ہے۔ اسی طرح انشائیہ کا خالق محض مزاح تک اپنی سعی کو محدود نہیں رکھتا کیونکہ محض مزاح سے سطحیت پیدا ہوتی ہے اور بات قہقہہ لگانے اور ہنسنے ہنسانے سے آگے نہیں بڑھتی۔

Marfat.com

انشائیہ ہمیں فکری انبساط سے ثروت مند کرتا ہے۔ تجب خیزی اور فکری انبساط انشائیہ کے اہم جمالیاتی رنگ ہیں جنہیں انشائیہ نگار اپنے پیش نظر رکھتا ہے۔

انشائیہ نگار اشیا، مظاہر فطرت اور افراد کو عارفانہ نظر (Mystic Vision) سے دیکھتا ہے۔ یہ رویہ اس کی جمالیاتی سوچ کا آئینہ دار ہے اس کی خوبصورت مثال ہمیں وزیر آغا کے انشائیہ ''بارھواں کھلاڑی'' میں ملتی ہے۔ کرکٹ کی ٹیم کا بارھواں کھلاڑی کسی آڑے وقت کے لیے وقف ہوتا ہے لیکن انشائیہ نگار جب اسے عارفانہ بصیرت سے دیکھتا ہے تو اس کھلاڑی کی کایا کلاپ کچھ اس طرح ہوجاتی ہے:

بارھواں کھلاڑی ایک ایسا ہی سچا صوفی ہے۔ وہ بیک وقت اپنی ٹیم میں منسلک بھی ہے اور جدا بھی۔ وہ میدان میں پہلی کے چاند کی طرح آتا ہے جو دوسرے لمحے رخصت بھی ہوجاتا ہے۔ وہ کرکٹ کے کھیل کا نباض، مفسر، کارکن اور جاسوس ہونے کے باوجود اپنے دامن کو تر نہیں ہونے دیتا۔ ہونٹوں پر ایک عارفانہ مسکراہٹ سجائے وہ قلب مطمئنہ کا مظاہرہ کرتا ہے۔

انشائیہ میں جہاں فکر کی ندرت اور تازگی کو اہمیت دی جاتی ہے وہاں اسلوب کا شگفتہ غیر رسمی انداز بھی بڑا معنی خیز ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار سنجیدگی سے قطع نظر غیر رسمی طریق کار اختیار کرکے اپنے شخصی ردعمل کے اظہار سے ناظر کو اپنے حلقۂ احباب میں شرکت کی دعوت دیتا ہے۔ بقول وزیر آغا:

انشائیہ کا خالق اس شخص کی طرح ہے جو دفتر سے چھٹی کے بعد اپنے گھر پہنچتا ہے، چست اور تنگ سا لباس اتار کر ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن لیتا ہے اور ایک آرام دہ موڑھے پر نیم دراز ہوکر اور حقہ کی نے ہاتھ میں لیے انتہائی بشاشت اور مسرت سے اپنے احباب سے مصروف گفتگو ہوجاتا ہے۔ انشائیہ کی صنف اسی شگفتہ موڈ کی پیداوار ہے۔

انشائیہ کی ہیئت میں عدم تکمیل کا بڑا دخل ہے۔ انشائیہ نہ تو کوئی فلسفیانہ مضمون ہے اور نہ کوئی سنجیدہ مقالہ۔ یہ تو انوکھی کیفیات اور واردات کے غیر رسمی انداز میں اظہار کی صنفِ ادب ہے۔ مقالہ کے برعکس انشائیہ کی ساخت لچکیلی (Loose) ہوتی ہے۔ اس میں مقالہ کی گہری سنجیدگی نہیں ہوتی۔ انشائیہ میں ایک مرکزی خیال تو ہوتا ہے مگر انشائیہ نگار اس خیال سے چپکا نہیں رہتا بلکہ اس کے توسط سے ایسی باتیں کہہ جاتا ہے جو بظاہر مرکزی خیال سے متعلق نہیں ہوتیں بلکہ اس خیال سے نکلتی ہوئی شعاعیں ضرور ہوتیں ہیں جو انشائیہ نگار کے شخصی ردعمل کے نتیجے کے طور پر پیدا ہوتی ہیں۔ جس طرح غزل کے شعر میں بہت سی ان کہی باتیں قاری یا ناظر کے فکر و ادراک کے لیے ادھوری چھوڑ دی جاتی ہیں اسی طرح انشائیے میں بھی بہت سی باتوں کو قاری کے فکر و ادراک کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے کیونکہ انشائیہ نگار تو آپ کی جمالیاتی

Marfat.com

حس اور سوچ کو مہمیز لگاتا ہے اور آپ کو زندگی کے انوکھے پہلوؤں سے لطف اندوز ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ باقی کام قاری کے اپنے تخیل کا ہے کہ وہ اس سے کہاں تک فیض یاب ہوتا ہے۔

انشائیہ کے اسلوب میں ایجاز و اختصار کا بہت عمل دخل ہے۔ کفایت لفظی انشائیہ کی جمالیات میں اضافہ کرتی ہے۔ افسانے کا خالق چھوٹی سے چھوٹی بات یا واقعہ کو بڑی تفصیل سے بیان کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے جبکہ انشائیہ نگار بڑی سے بڑی بات کو چند لفظوں میں بیان کرنے کی سعی کرتا ہے۔ انشائیہ نگار کا ذہن، بہر کیف زرخیز ہونا چاہیے۔ ذہن کی زرخیزی اور تخلیقی قوت کا حامل شخص ہی انشائیہ لکھ سکتا ہے۔ خیالات کی فراوانی کو کم سے کم الفاظ بیان میں کرنے سے انشائیہ میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ دیکھیے اکبر حمیدی اپنے ایک انشائیہ ''جھاڑیاں اور جگنو'' میں کتنے اختصار کے ساتھ ایک بڑی بات کو کس طرح مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کرتا ہے:

> جب تک ہمارے اندر کا جگنو طلوع ہوتا رہے گا ہماری جھاڑیوں پر رات مسلط نہیں ہوسکتی۔۔ ضرورت تو اس جگنو کو زندہ رکھنے کی ہے۔

جگنو، رات اور زندگی کے تلازمہ سے آپ پوری کیفیت کو فکر کی گرفت میں لے سکتے ہیں۔ یہی انشائیہ کی جمالیات (Aesthetics) ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

علامہ اقبال کے فارسی متون پر تحقیق کے مسائل

پروفیسر ڈاکٹر مہر نور محمد خان☆

تحقیق یا ریسرچ، تلاش و جستجو کے ذریعے حقائق کو معلوم کرنے اور ان کی تصدیق کرنے کا نام ہے یعنی جو حقائق ہماری نظروں کے سامنے نہیں ہیں ان کا سراغ لگانا اور جو سامنے تو ہیں لیکن روشن اور واضح نہیں، ان کو واضح اور آشکار کرنا۔

تحقیقی مقالے سے مراد مختصر جائزہ یا مضمون نہیں جو کسی رسالے، میگزین یا اخبار وغیرہ کے لیے لکھا جائے بلکہ وہ طویل تر مقالہ ہے جو یونیورسٹی کی ڈگری کے حصول کے لیے لکھا جاتا ہے۔ اس میں زیر تحقیق موضوع سے متعلق جملہ مواد کو پیش کیا جاتا ہے، اس کی ارزشیابی کی جاتی ہے اور اس سے مناسب نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ اس طرح تحقیق ایک حقیقت پنہاں یا حقیقت مبہم کو افشا کرنے کا باضابطہ عمل ہے۔ اس سے علم و فن کی نئی راہیں دریافت ہوتی ہیں، نئی حقیقتیں ابھرتی ہیں، نئے انکشافات جنم لیتے ہیں اور علم کے دائرے میں کی توسیع ہوتی ہے۔

تحقیق کے کام میں جو بات بے حد اہم ہے وہ تحقیقی موضوع کا انتخاب ہے۔ محقق کو موضوع کا انتخاب کرتے وقت اپنی علمی استعداد، دلچسپی اور ذہنی رجحان کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اگر اسکالر نے اپنی صلاحیت، ذوق اور دلچسپی کے مطابق موضوع کا انتخاب نہ کیا ہو تو اس کی تحقیق سے مفید نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔ بعض اوقات ایسے موضوع کا انتخاب کرلیا جاتا ہے جو بظاہر بہت عمدہ اور جاذب نظر ہوتا ہے لیکن اس پر تحقیق اسکالر کے بس کی بات نہیں ہوتی مثلاً اگر ادبیات کا طالب علم یہ موضوع لے لے ''علامہ اقبال کی شاعری میں فلسفۂ اشراق'' تو علم فلسفہ کے اسرار و رموز سے کماحقہ واقفیت نہ ہونے کے باعث وہ تحقیقی مقالہ نہیں لکھ سکے گا اور اگر لکھے گا بھی تو اس میں جدید معلومات کا اضافہ نہیں ہوگا۔

موضوع کا انتخاب کرنے سے پہلے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اس پر کافی مواد مل سکے گا یا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ پوری مدت تحقیقی مواد کی تلاش ہی میں گزر جائے۔ یہ بات کئی بار

☆نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

Marfat.com

دیکھنے میں آئی ہے کہ اسکالر، ناتجربہ کاری کے باعث ایسے موضوع پر تحقیق کی ذمہ داری قبول کرلیتا ہے جس کے زیادہ تر یا اصل مآخذ کسی دوسرے ملک میں ہوتے ہیں جنہیں ڈھونڈنے اور منگوانے کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایسے بھی ہوتا ہے کہ تمام تر کوشش کے باوجود مطلوبہ مآخذ دستیاب نہیں ہوتے لہٰذا مجبوراً یا تو موضوع بدلنا پڑتا ہے یا دستیاب کم معتبر مآخذ پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ جہاں تک موضوع کے انتخاب کا تعلق ہے نئے اسکالر کے لیے موضوع منتخب کرنا مشکل ہے۔ اسے کوئی اندازہ نہیں ہوتا کہ کونسا موضوع کس معیار کا ہے۔ لہٰذا موضوع کی اہمیت، دائرہ کار اور مواد کی دستیابی کے امکانات سے متعلق، شعبہ اور خاص طور پر رہنما استاد سے مشورہ حاصل کرنا ضروری ہے۔

ایران میں اقبال پر ان گنت کتابیں اور بیشمار مضامین شائع ہوچکے ہیں۔ استادوں، دانشوروں، شاعروں اور حتی کہ سیاسی شخصیتوں نے کتابیں لکھ کر یا مقالے شائع کر کے یا تقریر و خطاب کے ذریعے نظم و نثر کی صورت میں علامہ اقبال کے کمال کا اعتراف کیا ہے۔ مثلاً ایران کے مایۂ ناز شاعر ملک الشعرا بہار نے یوں علامہ اقبال کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

قرن حاضر خاصۂ اقبال گشت
واحدی کز صد ہزاران برگذشت

اسی طرح رہبر انقلاب اسلامی آیت اللہ خامنہ ای اپنے آپ کو ''مرید اقبال'' کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں، جبکہ بیشمار عقیدت کے موتی جو مجلات، اخبارات اور کتب میں بکھرے پڑے ہیں ان کی جستجو اور تلاش کے لیے منابع اور مآخذ سے شناسائی ضروری ہے۔ نیز ایران کے مختلف تحقیقی مراکز اور کتب خانوں کا جاننا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح ان دانشمندوں اور اسکالرز سے بھی آشنائی ضروری ہے جو علامہ پر تحقیقی کام کررہے ہیں یا کرچکے ہیں۔

علامہ اقبال کے فارسی متون پر توضیحی و تشریحی یا تحقیقی کام انجام دینے کے لیے دائرۃ المعارف، لغت ناموں اور فرہنگوں کا جاننا بھی ضروری ہے۔ ایران میں سب سے اہم دائرۃ المعارف لغت نامۂ دھخدا ہے۔ یہ پچاس جلدوں پر محیط ہے جس میں چالیس لاکھ مدخل شامل ہیں۔ لغت نامۂ دھخدا میں ڈکشنری اور دائرۃ المعارف دونوں کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ اس میں فارسی میں زیر استعمال تمام فارسی، عربی، ترکی، فرانسیسی اور انگریزی الفاظ کے معانی کے علاوہ ادبی، تاریخی، جغرافیائی موضوعات اور مشہور شخصیات کے بارے میں تفصیلی اطلاعات دی گئی ہیں۔

Marfat.com

لغت نامہ کے بعد اہم ترین ماخذ فرہنگ فارسی مؤلفہ ڈاکٹر محمد معین ہے۔ اس کی چھ جلدیں ہیں۔ اس میں چار جلدیں الفاظ کے معانی اور دو جلدیں تاریخی، ادبی اور جغرافیائی موضوعات و شخصیات کے بارے میں اطلاعات پر مشتمل ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی ڈکشنریاں موجود ہیں جن سے استفادہ کیا جاسکتا ہے مثلاً فرہنگِ آنندراج، برہان قاطع، فرہنگ نظام اور فرہنگ نفیسی وغیرہ۔

نشریات اور جرائد میں بھی علامہ اقبال پر مقالات چھپتے رہتے ہیں۔ روزنامہ کیہان اور اطلاعات جیسے بڑے فارسی اخبارات کے اپنے منظم آرکائیوز ہیں۔ اسی طرح مختلف یونیورسٹیوں کے تحقیقی مجلات میں بھی علامہ اقبال پر مختلف مناسبتوں سے مقالات شائع ہوتے رہتے ہیں۔

ایران میں مطبوعہ کتب اور مقالات کی فہرستیں بھی شائع کی جاتی ہیں۔ ان میں موضوع کے لحاظ سے الفبائی ترتیب سے کتاب یا مقالے کا نام درج ہوتا ہے۔ فارسی کی مطبوعہ کتابوں کی اس وقت کئی چھوٹی بڑی فہرستیں شائع ہوچکی ہیں جن میں سے دو قابل ذکر ہیں۔ ایک ''فہرست کتابہای چاپی فارسی'' مولفہٗ خانبابا مشار۔ یہ فہرست چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ دوسری فہرست ''فرہنگ کتابہای فارسی'' مولفہ محمود مدبری ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے اور فارسی ادب سے متعلق گذشتہ ایک ہزار سال کی مطبوعہ کتابوں پر محیط ہے۔ اسی طرح فارسی مقالات کے بارے میں ایرج افشار کی ''فہرست مقالات فارسی'' ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ لہٰذا علامہ اقبال پر تحقیقی کام کرنے والے کی نظر میں یہ تمام منابع اور مآخذ ہونے چاہئیں۔ تحقیقی مقالے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر قسم کے مذہبی، علاقائی، نسلی اور تاریخی تعصبات سے پاک ہو۔ تحقیقی مقالے کی بنیادی خصوصیت اس کی اصالت (Originality) ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں کوشش کی جائے کہ مواد اصل مآخذ سے حاصل کیا جائے نہ کہ ثانوی مآخذ سے۔ تحقیق میں براہ راست مطالعے اور جستجو کی بڑی اساسی اہمیت ہے۔

تحقیقی مقالہ لکھنے کے لیے متعدد مآخذ سے رجوع کرنا لازمی امر ہے لیکن ان مآخذ کا معتبر اور اول درجے کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ صرف معتبر اور اصل مآخذ ہی کی بدولت ہماری تحقیقی کاوش کو اعتبار اور وقعت حاصل ہوگی۔ تراجم جیسے غیر معتبر اور غیر معیاری ثانوی درجے کے مآخذ سے استناد ہماری تحریر کی بے مائیگی و بے اعتباری اور علامہ اقبال کے حقیقی پیغام کی تحریف پر منتج ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر ڈاکٹر عبدالغنی نے علامہ اقبال پر اپنے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالہ "The English Translation of Iqbal's Poetry" میں غیر معیاری تراجم

Marfat.com

سے رجوع کرنے سے منع کیا ہے اور ایسے تراجم کو فوری طور پر ضبط کرنے کی سفارش کی ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ بعض اوقات ثانوی حوالوں میں معلومات غلط بھی ہوسکتی ہیں۔ بغیر تحقیق کے جب کوئی حوالہ دیا جاتا ہے تو نہ صرف وہ غلطی دہرائی جاتی ہے بلکہ ایک غلطی سے کئی غلطیاں پیدا ہوتی ہیں مثلاً نسیم امروہوی سے، علم و فضل کے بلند مرتبے پر فائز ہونے اور علمی اور لسانی تبحر رکھنے کے باوجود اپنی کتاب **فرہنگ اقبال** (فارسی) میں تاریخی اور جغرافیائی حوالہ جات میں کئی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں مثلاً وہ زرتشت کے بارے میں لکھتے ہیں:

مسیح سے تقریباً نو سو برس پہلے ایران کا ایک شخص جو نبوت کا مدعی تھا۔ یہ منوچہر کی نسل سے اور فیثا غورث حکیم کا شاگرد تھا۔ گشتاسپ ساسانی بادشاہ کے زمانے میں نبوت کا مدعی ہوا اور آتش پرستی کا دین ایجاد کیا۔ مجوسی اس کو پیغمبر سمجھتے ہیں اور اس کا نام ابراہیم بتاتے ہیں اور اس کی کتاب زند کو آسمانی صحیفہ خیال کرتے ہیں۔ علامہ نے اسے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کی نسل سے بتایا ہے:

من چہ گویم از مقامِ آن حکیم نکتہ سنج
کردہ زردشتی ز نسل موسی و ہارون ظہور

اس تفصیل میں نسیم امروہوی صاحب سے کئی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ مثلاً گشتاسپ کا تعلق ساسانی خاندان سے نہیں تھا۔ ساسانی خاندان کی حکومت کا عہد ۶۵۱-۲۲۴ء ہے جب کہ زردشت کا عہد نو سو برس قبل مسیح ہے۔ زردشت کی کتاب کا نام اوستا ہے۔ زند، اوستا کی تفسیر ہے جو ساسانی عہد میں لکھی گئی۔ بقول نسیم صاحب، علامہ نے زردشت کو حضرت موسیٰ اور ہارون کی نسل سے بتایا ہے، یہ بھی درست نہیں۔ درحقیقت یہ شعر مشہور جرمن سائنسدان آئن سٹائن کی تعریف میں ہے۔ چونکہ آئن سٹائن یہودی الاصل تھا، اس لیے علامہ نے اسے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کی نسل سے کہا ہے نہ کہ زردشت کو۔ حکمت و دانش کے حوالے سے اسے زردشت سے تشبیہ دی ہے۔

''زندہ رود'' کی توضیح لکھتے ہوئے نسیم امروہوی کہتے ہیں: شالی ایران میں ایک ندی کا نام ہے۔ جب کہ یہ مرکزی ایران بلکہ جنوب مرکزی ایران کا دریا ہے۔ علامہ کو یہ نام اتنا پسند تھا کہ آسمانوں کے سفر میں خود اپنا یہ نام رکھا ہے۔ علامہ اقبال زندہ رود کو ذوق خودی کا سمبل سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں:

ای خوش آن جوی تنک مایہ کہ از ذوقِ خودی
در دل خاک فرو رفت و بدریا نرسید

نسیم امروہوی کی **فرہنگِ اقبال** میں اس طرح کی غلطیاں غیر مستند ماخذ کا

Marfat.com

شاخسانہ معلوم ہوتی ہیں۔

ان مثالوں کے پیش نظر اپنے مآخذ اور حوالوں کو بار بار دیکھنے اور جانچنے کی ضرورت ہے کیونکہ تمام مآخذ قابل اعتبار نہیں ہوتے۔ معلومات جتنی بالواسطہ وسائل سے حاصل کی جائیں گی اتنا ہی ان کا اعتبار کم ہوگا۔ اس لیے جہاں تک ممکن ہو مواد کو اصل مآخذ ہی سے حاصل کیا جائے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اصل مآخذ سے مواد کے حصول کے باعث ایسی معتبر معلومات بھی ہاتھ لگ سکتی ہیں جن سے ابھی تک کسی دوسرے نے استفادہ نہ کیا ہو۔ اس طرح نئے حقائق کو منظر عام پر لانے سے تحقیقی مقالے کی ارزش و وقعت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

علامہ اقبال جیسے عظیم شاعر کے متون پر تحقیقی کام انجام دینا چٹان کا سینہ چیرنے کے مترادف ہے۔ ان کی شاعری ایک ایسے بحر بیکراں کی طرح ہے جس کی وسعتوں اور گہرائیوں کا اندازہ کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اقبال کے فکر و نظر کے اتنے پہلو ہیں کہ صرف ایک دانائے رموز زبان ہی ان پر تحقیق جیسے اہم اور حساس کام کو بہ حسن و خوبی انجام دے سکتا ہے۔ چونکہ علامہ اقبال کے بیشتر آثار فارسی میں ہیں لہٰذا اقبالیات میں تحقیقی کام کرنے والوں کو جن مآخذ سے استفادہ کرنا پڑتا ہے ان میں سے بیشتر فارسی زبان میں ہیں۔ یہ ایسے مآخذ ہیں جن کی طرف رجوع کیے بغیر اقبالیات پر تحقیق سے انصاف نہیں کیا جاسکتا اور ان مآخذ سے استفادہ کے لیے فارسی زبان سے کماحقہ واقفیت نہایت ضروری ہے۔ کچھ لوگ ''است'' اور ''بود'' کی حد تک فارسی جانتے ہیں اور کچھ اتنی بھی نہیں جانتے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ ترجمے سے کام چلایا جائے مگر ترجمے کی حیثیت ثانوی ماخذ کی ہوتی ہے اور یہ تحقیق نکتہ شناسی اور جزء رسی کے اہم مقاصد کو پورا نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ اردو متون کی تحقیق کے لیے بھی فارسی کا جاننا ضروری ہے۔ علامہ نے اپنے پی ایچ ڈی تھیسس کی تکمیل اور اپنی علمی منازل طے کرنے کے لیے فارسی کی بہت سی کتابوں اور دواوین کا مطالعہ کیا جس کا ایک اثر اقبال کے اردو کلام پر یہ ہوا کہ ان کی اردو نظموں میں فارسی ترکیبیں اور فارسی بندشیں بہت زیادہ ہیں۔ بعض جگہ فارسی اشعار تضمین کیے گئے ہیں۔ مزید یہ کہ عجمی فلسفے و خیالات کی چاشنی بھی ان میں موجود ہے۔ ان کے دقیق نکات اور پیچ و خم کو سمجھے بغیر مفہوم کی حقیقت بے نقاب نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا جس کے پاس فارسی زبان اور عجمی فلسفے سے متعلق کافی و وافی اطلاعات نہیں وہ ان دقیق خیالات کو بخوبی نہیں سمجھ سکتا۔

اسی طرح علامہ اقبال کے کلام میں عربی اور قرآنی آیات کا بہت استعمال ہوا ہے۔ اشعار میں سینکڑوں مقامات پر کسی نہ کسی آیت یا حدیث کا کوئی جزو موجود ہے۔ لہٰذا اقبالیات

Marfat.com

پر تحقیق کرنے والے اگر واقعی اقبال کے نقطہ نظر کو بخوبی سمجھنا چاہتے ہیں تو انہیں نہ صرف فارسی بلکہ عربی پر بھی دسترس حاصل ہونی چاہیے۔ نیز یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ قرآنی آیات اور احادیث کو معلوم کرنے کے لیے کن مآخذ سے رجوع کیا جائے اور ان سے کس طرح استفادہ کیا جائے۔

اقبال نے اپنے اشعار میں اگر کسی واقعہ یا کسی شخصیت کے متعلق اشارہ کیا ہے تو اس واقعہ یا شخصیت کے تاریخی پس منظر کو جاننا ضروری ہے۔ اس کے بغیر آپ شعر کی صحیح تشریح و توضیح نہیں کر پائیں گے۔ مثلاً علامہ اقبال نے رموزِ بیخودی میں ساسانی بادشاہ یزدگرد کی فوجوں کی مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کا ذکر کرتے ہوئے یہ شعر کہا ہے:

چون درفش کاویانی چاک شد
آتش اولاد ساسان خاک شد

اس شعر کی توضیح و تشریح کے لیے جب تک درفشِ کاویانی کی تاریخ، ساسانی عہد میں سرکاری مذہب اور اس کے عقائد کی وضاحت نہ کی جائے، اس کا مفہوم پوری طرح واضح نہیں ہوگا۔

اسی طرح مذہب، تاریخ، فلسفہ، تصوف، سیاست اور دنیائے شعر و ادب کی وہ تمام شخصیتیں جن کا ذکر اقبال کے اشعار میں آیا ہے، ان تمام کے حالات و واقعات اور تاریخی پس منظر کا جاننا بھی ضروری ہے۔

علامہ اقبال کی شاعری مسلمانوں کی تاریخی، علمی اور تہذیبی فکر کے نقطۂ نگاہ سے جتنی وسیع اور متنوع، فلسفۂ اسلامی کے اعتبار سے جتنی گہری اور عمیق اور مسلمانانِ عالم کی سیاسی و سماجی صورت حال کے پیش نظر جتنی جھنجوڑنے والی اور پرتحرک ہے اس کا تقاضا ہے کہ ان کے متون پر تحقیق کرنے والا شخص فارسی زبان پر کامل دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ بیک وقت تاریخ عالم، فلسفۂ اسلامی، مطالعۂ قرآن و حدیث، سیاست ملت اسلامیہ اور بیسویں صدی کے بین الاقوامی واقعات و مسائل پر بھی گہری نظر رکھتا ہو۔ جو شخص ان علوم و امور پر نظر نہیں رکھتا وہ شخص اقبال کا کلام نہ پوری طرح سمجھ سکتا ہے اور نہ اس کے متعلق علمی تحقیق کا حق ادا کر سکتا ہے۔

اسی طرح ایرانی دانشور بھی جب تک اردو زبان اور برصغیر کے سیاسی و سماجی حالات و واقعات سے کماحقہ واقف نہیں ہوں گے ان کے لیے بھی اقبالیات کے کسی موضوع پر تحقیق کا حق ادا کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ چونکہ پاکستانی اسکالرز کو فارسی زبان اور ایرانی تاریخ پر کامل دسترس نہیں ہوتی اور ایرانی اردو سے نابلد ہیں لہٰذا پاکستان اور ایران میں انجام پانے والی تحقیق کے نتیجے میں فی الحال علامہ اقبال کی نیم رخ تصویر ہی ترسیم ہو پاتی ہے۔ بقول مولانا

Marfat.com

رومی:

ہر کسی از ظن خود شد یار من　　وز درون من نجست اسرار من

علامہ اقبال کے بارے میں نیم رخ مطالعہ و تحقیق کے باعث ان کے اکثر فکری پہلو نظروں سے اوجھل رہتے ہیں اور اس طرح علامہ کے فکر و پیغام کے بارے میں ابہام پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ اس کی وضاحت میں مندرجہ ذیل واقعہ سے کرنا چاہوں گا:

چند سال پہلے معروف صوفی شاعر عطار نیشاپوری کی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کے لیے ایران جانا ہوا۔ کانفرنس کے دوران ایک معمر شخص سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے بتایا کہ میں علامہ اقبال کا بڑا مداح ہوں۔ ان پر ایک کتاب لکھنا چاہتا تھا لیکن جب میں نے علامہ اقبال کے رضا شاہ پہلوی کی تعریف میں مندرجہ ذیل اشعار پڑھے

آنچہ بر تقدیر مشرق قادر است　　عزم و حزم پہلوی ▪ نادر است

پہلوی، آن وارث تخت قباد　　ناخن او عقدہ ی ایران گشاد

تو اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔ میرا آپ سے سوال یہ ہے کہ علامہ اقبال نے عظیم فلسفی شاعر اور مفکر ہونے کے باوجود رضا خان جیسے ڈکٹیٹر کی تعریف کیوں کی؟ میں نے مولانا صاحب کو بتایا کہ علامہ نے اپنے اردو کلام میں رضا شاہ پر تنقید بھی کی ہے جس پر انہیں بہت حیرت ہوئی اور مجھ سے یہ شعر فراہم کرنے کی تاکیداً خواہش کی:

نہ مصطفیٰ، نہ رضا شاہ میں نمود اس کی　　کہ روحِ شرق، بدن کی تلاش میں ہے ابھی

ان حقائق کی روشنی میں جب تک اقبالیات پر تحقیقی کام کرنے والوں کو اردو، فارسی کے علاوہ مسلمانانِ عالم، خاص طور پر برصغیر اور ایران کے تاریخی، سیاسی ثقافتی اور سماجی حالات و واقعات سے کماحقہ واقفیت حاصل نہیں ہوگی علامہ کے

جعفر از بنگال و صادق از دکن　　ننگِ آدم، ننگ دین، ننگ وطن

جیسے اشعار کو ان کی مذہبی عصبیت اور فرقہ پرستی سے تعبیر کیا جاتا رہے گا۔

☆☆☆

Marfat.com

کلام اقبال میں ذکرِ حسین علیہ السلام

عاشق خواجہ جہانگرد☆

دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا مسلمان ہوگا، جو حکیم الامت، شاعر مشرق، مصورِ پاکستان، علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ کے نام نامی و اسم گرامی سے آشنا نہ ہو۔ بالخصوص دنیائے اسلام میں علامہ اقبالؒ لاہوری کا نام وشہرہ، لولؤ و مرجان یعنی ہیرے موتیوں کی طرح چمک دمک رہا ہے۔ اسلامی جمہوریۂ ایران ہو یا اسلامی جمہوریۂ پاکستان، افغانستان ہو یا ازبکستان، یا پھر شام و مصر و عربستان، غرض نیل کے ساحل سے لیکر تابخاک کاشغر، علامہ اقبال کے کلام بلاغت نظام کو، امت مسلمہ کی بھرپور تائید و حمایت حاصل ہے اور حقیقت حال یہ ہے کہ کلام وفکر و اثر اقبال کو نوائے ملت اسلامیہ تسلیم کیا گیا ہے۔ بے شک و شبہ علامہ اقبال کا کلام بحر بیکران و سمندر بے پایان ہے اور ان کا ہر شعر ایک خاص فلسفہ، خاص سائنس اور ایک خاص درس کا حامل ہے۔ چنانچہ اہل علم نے ان پر مختلف پہلوؤں سے جدا جدا ضخیم شرحیں اور مختلف موضوعات و عنوانات کے تحت اتنی زیادہ تفسیریں لکھی ہیں کہ اگر صرف ان کی فہرست ہی مرتب کی جائے تو ایک ضخیم رسالہ مرتب ہو جائے گا۔

علامہ اقبال کا اکثر و بیشتر کلام شیریں زبان فارسی میں ہے اس لیے ان کے فکر کو ہماری نسبت ایرانیوں نے کہیں زیادہ اپنایا ہے۔ ہم تو ذکر اقبال میں ہمہ تن گوش اور زیادہ سے زیادہ محو رہے اور ایرانی فکرِ اقبال میں ڈوب کر، انقلاب اسلامی ایران کی صورت میں ابھر کر نکلے۔ ہم نے بشمول مجھ ہیچمدان کے، بقول اکبرالہٰ آبادی مرحوم:

تصوف کے بیاں کو ہوش نے روح آشنا پایا   معانی کچھ نہ سمجھا پر قیامت کا مزا پایا

امید ہے کہ ہم علامہ اقبال کے بتائے اور سمجھائے ہوئے راستہ پر چل کر اسلامی اتحاد و اتفاق اور یگانگت و تقویت کا باعث بنیں گے۔ انشا اللہ العزیز! علامہ اقبال فرماتے ہیں:

تیر و سناں و خنجر و شمشیرم آرزوست   با من میا کہ مسلک شبیرمؑ آرزوست

(پیام مشرق، ص ۱۸۵)

علامہ اقبال فرماتے ہیں: میری خواہش تیر، برچھی، خنجر اور تلوار لینے کی ہے، میرے

☆مغل حویلی، اندرون موچی دروازہ، لاہور

Marfat.com

ساتھ مت آ کیونکہ میں نے شبیر کے طریق پر چلنے کی خواہش کی ہے۔

ارشاد فرمایا:

ازاں کشت خرابے، حاصلے نیست　　　که آب از خون شبیرے ندارد

(ارمغان حجاز، ص ۲۱)

جس کھیت کو شبیرؓ کے خون سے آب نہ ملا ہو، اس کھیتی سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستان حرم　　　نہایت اسکی حسینؓ، ابتدا ہے اسماعیلؑ

بال جبریل، ص ۹۲

مقام شبیری کے بارے میں پھر ارشاد ہوتا ہے:

حقیقت ابدی ہے مقام شبیریؓ
بدلتے رہتے ہیں، انداز کوفی و شامی

صبر حسین کے خصوص میں فرماتے ہیں:

صدق خلیلؑ بھی عشق، صبر حسینؓ بھی ہے عشق　　　معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

(بال جبریل، ص ۱۵۳)

فقر شبیری و سرمایۂ شبیری کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

اک فقر ہے شبیریؓ، اس فقر میں ہے میری　　　میراثِ مسلماں ہے، سرمایۂ شبیریؓ

(بال جبریل، ص ۲۱۳)

پھر فرماتے ہیں:

در نوائے زندگی سوز از حسینؓ　　　اہل حق حریت آموز از حسینؓ

یعنی زندگی کی آواز میں سوز، حضرت امام حسینؓ سے ہے اور آپ ہی سے اہل حق حریت سیکھتے ہیں۔

آں امام عاشقاں پور بتول　　　سرو آزادے ز بستان رسولؐ
اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر　　　معنی ذبح عظیم، آمد پسر

وہ عاشقوں کا امام (حسینؓ)، حضرت فاطمہ زہرا بتولؓ، جگر گوشۂ رسولؐ کا بیٹا، باغ رسول کا آزاد سرو، اللہ اللہ باپ (علیؓ) بسم اللہ کی ''ب'' اور بیٹا (امام حسینؓ). بہ معنی ''ذبح عظیم'' ہے۔

ینابیع المودۃ، باب ۱۴، صفحہ ۵۷ پر ''الدر المنظوم'' میں لکھا ہے کہ:

آسمانی کتابوں کے تمام اسرار، قرآن حکیم میں ہیں اور وہ سب کچھ جو قرآن مجید میں ہے وہ ''سورہ فاتحہ'' میں ہے اور سب کچھ جو سورہ فاتحہ میں ہے وہ بسم اللہ میں ہے اور سب کچھ جو بسم اللہ میں ہے وہ بسم

Marfat.com

اللہ کی با(ب) میں ہے اور سب کچھ جو با(ب) بسم اللہ میں ہے وہ اس نقطہ میں ہے جو اس ''ب'' کے نیچے ہے۔ قال الامام علی کرم اللہ وجہہ: انا النقطۃ التی تحت الباء' امیر المومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ ''(بسم اللہ کی) اس ''ب'' کے نیچے جو نقطہ ہے وہ میں (علیؑ) ہوں۔'' ابن عباسؓ کی روایت اس جگہ لکھی ہے کہ'' ایک چاندنی رات میں امیر المومنین حضرت علیؑ مجھے(ابن عباسؓ کو) عشاء کے بعد قبرستان بقیع لے گئے اور فرمایا (اے ابن عباسؓ) پڑھ، میں (ابن عباسؓ) نے بسم اللہ پڑھی ،فتکلم لی فی اسرار الباء الی بزوغ الفجر'' تو آپؑ (علیؑ) صبح نکلنے تک بائے ((ب) بسم اللہ کے اسرار و رموز بیان فرماتے رہے۔

انہی وجوہ کے پیش نظر حضرت علامہ اقبال نے امیر المومنین حضرت علیؑ کو بسم اللہ کی ''ب'' لکھا ہے۔ باپ (حضرت علی مرتضیٰؑ) تو اس شان کا ہے۔ بیٹا (امام حسینؑ) بہ معنی ذبح عظیم ہے۔ جب حضرت اسماعیلؑ کی قربانی ٹل گئی تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: و فدیناہ بذبح عظیم'' کہ'' ہم نے اسماعیل کا فدیہ (دُنبے کو) کردیا۔ '' ذبح عظیم کی وجہ سے''۔ اہل بیت عظام اور صوفیۂ کرام کے اقوال زریں نے ذبح عظیم سے سید الشہداء حضرت امام حسینؑ کو مراد لیا ہے جن کی شہادتِ عظمیٰ کو کبھی تو علامہ اقبال '' نہایت اس کی حسین، ابتدا ہے اسمٰعیل'' کہہ کر ذکر کرتے ہیں اور کبھی قربانی اسماعیل کو اجمال اور شہادت امام حسین کو تفصیل سے تعبیر کرتے ہیں!

پھر ارشاد فرماتے ہیں:

بہر　آں　شہزادۂ　خیر الملل　دوش　ختم　المرسلین　نعم　الجمل

حضرت علی بن عثمان، عرف داتا گنج بخش ہجویریؒ ، ثم لاہوری نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف **کشف المحجوب** میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ سرکار رسالت مآب حضرت محمدؐ نے حضرت امام حسینؑ کو اپنی پشت مبارک پر سوار کیا ہوا تھا اور رسی کا ایک سرا اپنے دہان مبارک میں اور دوسرا سرا حضرت امام حسینؑ کے ہاتھ میں دیا ہوا تھا۔ امام حسینؑ آپ صلعم کو چلاتے تھے اور آپؐ چلتے تھے۔ حضرت عمر خطابؓ نے دیکھ کر کہا:'' نعم الجمل جملک یا ابا عبداللہ۔'' (یا حسین) تیرا اونٹ کیسا اچھا اونٹ ہے۔'' حضرت پیغمبرؐ نے فرمایا: '' نعم الراکب ھو یا عمر۔'' اے عمر دیکھ سوار بھی کیا ہی اچھا ہے!'' اسی بنا پر حضرت علامہ اقبال کا یہ شعر ہے۔ پھر فرمایا:

سرخ　رو　عشق　غیور　از　خون　او　شوخی　ایں　مصرع　از　مضمون　او

'' عشق غیور آپؑ (حسینؑ) کے خون سے سرخرو ہوگیا اور اس کے مضمون سے اس مصرع کی شوخی ہے۔''

درمیاں　امت　آں　کیوان　جنابؑ　ہمچو　حرف　قل　ھو　اللہ　در　کتاب

Marfat.com

امت مسلمہ میں حضرت امام حسینؑ ایسے ممتاز ہیں، جیسے "قل ھو اللہ" قرآن حکیم میں! قل ھو اللہ، سورۂ توحید ہے اور سورہ توحید ہی میں وہ تمام قوت ہے۔ ویسے ہی حضرت امام حسینؑ میں تمام قوت ہے۔ توحید، اسلام و شرک میں امتیاز ہے۔ سورہ توحید، قرآن حکیم کا خلاصہ ہے۔ تین مرتبہ سورۂ توحید پڑھنے سے تمام قرآن پاک کی تلاوت کا ثواب ملتا ہے، ویسے ہی دل جان اور ارکان سے حضرت امام حسینؑ کی محبت اور آپ کا اتباع ہو تو تمام قرآن پاک پر عمل ممکن ہے۔ توحید، قرآن میں ممتاز، حسینؑ، اسرار میں ممتاز، سورۂ توحید، قرآن صامت کی سورت، حسینؑ قرآن ناطق کی سورت۔ قل ھو اللہ، قرآن صامت اور حسین، قرآن ناطق!

موسیٰؑ و فرعون و شبیرؑ و یزید　　این دو قوت از حیات آید پدید

یعنی موسیٰ و فرعون، شبیر و یزید، حیات سے یہ دو قوتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ مطلب یہ کہ حضرت امام حسینؑ اپنے دور میں موسیٰ کی جگہ تھے اور یزید آپؑ کے دور کا فرعون تھا۔ حضرت موسیٰؑ، فرعون کو غرق کرنے کے لیے اور حضرت امام حسینؑ یزیدیت کو فنا کرنے کے لیے تشریف لائے۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو غرق کر دیا جبکہ حضرت امام حسینؑ نے یزید کو زندہ چھوڑ کر ایسا غرق کیا کہ اس کے خاندان، بلکہ ابوسفیان کے خاندان کا نام و نشان تک دنیا میں نہ رہا! چنانچہ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

زندہ حق از قوت شبیری است　　باطل آخر، داغ حسرت میری است

حق شبیر کی قوت سے زندہ ہے۔ باطل آخر داغ حسرت لے کر مرنے والا ہے۔

پھر فرماتے ہیں:

چون خلافت رشتہ از قرآں گسیخت　　حریت را زہر اندر کام ریخت

یعنی جب خلافت نے قرآن پاک سے رشتہ توڑ لیا تو حریت کے منہ میں زہر ڈال دیا۔ قرآن حکیم خلافت کے متعلق کہتا ہے۔ "انی جاعل فی الارض خلیفہ۔" "انی جاعلک للناس اماماً۔" "انا جعلناک خلیفہ فی الارض۔" میں (اللہ) ہی زمین میں خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں۔ میں (اللہ) ہی اے ابراہیمؑ تجھے لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔ اے داؤدؑ! میں (اللہ) نے ہی تجھے زمین میں خلیفہ مقرر کیا۔ لیکن لوگوں نے اپنے ہاتھوں سے خلافت بنالی۔ اس لیے حریت مرگئی!

خاست آن سر جلوۂ خیر الامم　　چون سحاب قبلہ باران در قدم

بر زمین کربلا بارید و رفت　　لالہ در ویرانہ ھا کارید و رفت

یعنی وہ اس امت مسلمہ کا سردار (امام حسینؑ) قبلہ و کعبہ کے بادل کی طرح، (جس میں بارش

Marfat.com

ہوتی ہے) اٹھا، اور کربلا کی سرزمین پر برسا اور گیا۔ ویرانوں میں اس (امام حسینؓ) نے لالہ وگل اگا دیے، اور گیا۔ یہی نہیں، بلکہ

تا قیامت قطعِ استبداد کرد		موج خون او چمن ایجاد کرد

اس (حضرت امام حسینؓ) نے قیامت تک کے لیے، سلسلۂ استبداد کو کاٹ ڈالا۔ امام حسینؓ کے خونِ مصفا کی موج نے باغ ایجاد کردیا۔

بہر حق در خاک و خون غلطیدہ است		پس بنائے لا الہ، گردیدہ است

امام حسینؓ حق کے لیے خاک و خون میں غلطاں ہوگئے اور اس طرح "لا الہ الا اللہ"۔ کی بنیاد بن گئے۔ علامہ اقبالؒ نے یہ شعر، حضرت خواجۂ خواجگان، معین الدین چشتی سنجری اجمیریؒ کی اس رباعی سے لیا ہے:

شاہ است حسینؑ، پادشاہ است حسینؑ		دین است حسینؑ، دین پناہ است حسینؑ

سر داد، نداد دست در دست یزید		حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ

امام حسینؓ شاہ اور بادشاہ ہے۔ حسینؑ دین ہے اور دین پناہ ہے۔ اس نے راہ حق میں سر دیدیا لیکن یزید کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دیا۔ یعنی اس کی بیعت نہ کی۔ خدا کی قسم، کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ" کی بنیاد ہی حضرت امام حسینؓ ہیں، اگر حسینؓ بنا نہ رکھتے تو اسلام کا قلعہ نہ بنتا۔ اگر حسینؓ حق کی خاطر شہید نہ ہوتے، تو دین اسلام زندہ نہ رہتا۔ اور سیئے علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

مدعایش سلطنت بودے اگر		خود نہ کردے با چنین سامان سفر

یعنی اگر آپؓ کا مدعا، سلطنت ہوتا، تو آپؓ ایسے ساز و سامان کے ساتھ سفر نہ کرتے۔ یعنی پاکدامن عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور ضعیفوں کو ساتھ نہ لیتے۔

دشمنان چون ریگِ صحرا لاتعد		دوستان او بہ یزدان ہم عدد

آپ امام حسینؓ کے دشمن تو، ریت کے ذروں کی طرح بیشمار، اور آپؓ کے دوست، یزدان (ی۔ز۔د۔ا۔ن= "یزداں" کے ہم عدد تھے۔ (۱۰+۷+۴+۱+۵۰=۷۲ (شہداء کربلا)

تو کیا اتنی چھوٹی و مختصر جماعت کو لے کر کوئی سلطنت لینے جایا کرتا ہے؟

سر ابراہیمؑ و اسماعیلؑ بود		یعنی آن اجمال را تفصیل بود

عزم او چون کوہساران استوار		پایدار و تند سیر و کامگار

یعنی حضرت امام حسینؑ، حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیلؑ کا راز یعنی اس اجمال کی تفصیل تھے، آپ کا عزم مصمم، پہاڑوں کی طرح مضبوط و مستحکم، پائیدار، تند سیر اور کامیاب تھا۔

تیغ بہر عزت دین است و بس		مقصد او حفظِ آئین است و بس

Marfat.com

ما سوائے اللہ را مسلمان بندہ نیست　　　پیش فرعونے سرش افگندہ نیست
خون او تفسیر این اسرار کرد　　　ملت خوابیدہ را بیدار کرد
تیغ لا چوں از میاں بیرون کشید　　　از رگ ارباب باطل خون کشید
نقش الا اللہ بر صحرا نوشت　　　سطر عنوان نجات ما نوشت
رمز قرآن از حسین آموختیم　　　ز آتش او، شعلہ ھا اندوختیم
شوکت شام و فر بغداد رفت　　　سطوت غرناطہ ہم از یاد رفت
تار ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز　　　تازہ از تکبیر او ایمان ہنوز
اے صبا اے پیک دور افتادگان　　　اشک ما، برخاک پاک او رسان

تلوار دین کی عزت کے لیے اور اس کا مقصد آئین دین ہی کی حفاظت ہے۔

مسلمان، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا بندہ نہیں، کسی فرعون کے سامنے اس کا سر جھکا ہوا نہیں۔ امام حسینؑ کے خون نے ان اسرار کی تفسیر کی اور سوئی ہوئی امت کو جگا دیا۔ امام حسینؑ نے جب میان سے لا الہ الا اللہ کی تیغ نکالی، اہل باطل کی رگوں سے خون کھینچ لیا۔ الا اللہ کا نقش، صحرائے کربلا پر کیا لکھا، گویا ہماری نجات کے عنوان کی سطر لکھ ڈالی۔ ہم نے حسینؑ سے قرآن کی رمز سیکھی اور آپؑ کے سوز عشق سے ہم نے شعلے جمع کیے۔ شام کی شوکت اور بغداد کی کر وفر چلی گئی اور غرناطہ کا دبدبہ بھی فراموش ہوگیا جبکہ ہمارا تار اس (حسینؑ) کے مضراب سے ابھی تک لرزاں ہے اور اس کی تکبیر سے، ایمان ابھی تک تازہ ہے۔ اے باد صباء اے دور افتادوں کی قاصد، ہمارے آنسو، امام حسینؑ کی پاک خاک پر پہنچا، کیونکہ آنسو محبت کی علامت اور مودّت کی گہرائی بتلاتے ہیں۔

مسلک شبیری کے بارے میں علامہ اقبال کے مندرجہ بالا کلام بلاغت نظام کے عمیق مطالعہ سے ان کے عقیدہ و اعتقاد کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال اپنی کتاب مستطاب بانگ درا، ص ۵۱ میں اپنے مسلک کے بارے میں بذات خود فرماتے ہیں:

ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا　　　تفضیل علیؑ ہم نے سنی اس کی زبانی

یہی نہیں، بلکہ ایک اور جگہ اور فرماتے ہیں:

بغض اصحابؓ ثلاثہ سے نہیں اقبال کو　　　دق مگر اک خارجی سے آکے مولائی ہوا

(باقیات اقبال)

سو فکر اقبال سے ثابت ہوا کہ علامہ اقبال مرحوم، مولائی تھے اور بس!

☆☆☆

Marfat.com

اقبال اور ایران

محمد عباس ☆

دنیا میں کبھی کبھی ایسی ہستیاں پیدا ہوتی ہیں جو اپنے زمانے کے حالات کا رخ بدل کر رکھ دیتی ہیں اور ان کے تصورات، خیالات اور نظریات کی وجہ سے سیاسی، فکری اور تہذیبی لحاظ سے بنی نوع انسان کی تاریخ کا دھارا مختلف رخ اختیار کرلیتا ہے۔ علامہ اقبال کا شمار بلاشبہ ایسی ہی ہستیوں میں ہوتا ہے۔ اقبال ایک ایسے صاحب بصیرت دانائے راز تھے جنہوں نے شاعری کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور مسلمانوں تک اپنا پیغام پہنچایا۔ چنانچہ انہوں نے اعتراف کیا ہے:

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوے قطار می کشم ناقہ بے زمام را

جس زمانے میں اقبال نے اپنا حیات افروز پیغام سنانا شروع کیا مسلم امہ افسردگی اور مایوسی کا شکار تھی۔ ان کی آواز اہل اسلام کے کانوں میں پڑی تو نئی امیدیں بندھ گئیں اور ان کا کلام انقلاب اور ترقی کا زبردست محرک بن گیا۔ وہ اردو کے پہلے شاعر ہیں جو مفکر ہیں اور صاحب پیغام بھی۔ اگرچہ ان کا بیشتر کلام فارسی میں ہے پھر بھی انہوں نے جو کچھ اردو میں لکھا وہ سیدھا برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں میں اتر گیا کیونکہ ان کی شاعری کی بنیاد اسلامی نظام فکر پر استوار ہے۔ پھر وہ ایسے لوگوں میں سے نہیں جو صرف سوچ سوچ کر رہ جائیں یا سمجھ سمجھ کر پچھتائیں اور نہ ہی وہ زندگی کے انفرادی اور اجتماعی مسائل سے فرار ڈھونڈتے ہیں۔ وہ عمل پیہم کی تعلیم دیتے ہیں اور اپنے انقلابی خیالات سے لوگوں کے دلوں کو گرماتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

اک ولولہ تازہ دیا میں نے دلوں کو

پھر یہ بھی کہا کہ:

☆ مکان نمبر ۲۲۱، سٹریٹ ۴۱، G-9/1، اسلام آباد

Marfat.com

یقین محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

وہ حکیمانہ نگاہ لے کر پیدا ہوئے تھے اور زندگی کو متحرک، ترقی پذیر اور جدوجہد کا میدان سمجھتے تھے۔ فرماتے ہیں:

زندگی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

انہوں نے نہ صرف برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو بیدار کر دیا بلکہ عالم اسلام میں بھی زندگی کی نئی لہر پیدا کر دی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

پس از من شعر من خوانند و دریابند و می گویند
جہانے را دگرگون کرد یک مرد خود آگاہی

علامہ اقبال ہمارے قومی شاعر اور حکیم مشرق کی حیثیت سے تقریباً تمام عالم اسلام میں پہچانے جاتے ہیں اور ان کے فلسفیانہ خیالات اسلام سے عین مطابقت رکھتے ہیں۔ وہ عالم اسلام کے اتحاد کے داعی اور اسلام کو ایک انقلابی نظریۂ حیات سمجھتے تھے۔ یہی نقطۂ نظر ان کا زندگی کے بارے میں ہے۔ کہتے ہیں:

جس میں نہ ہو اضطراب موت ہے وہ زندگی

وہ تغیر اور انقلاب کے قائل اور داعی تھے، آزادی کے نقیب تھے اور نتیجتاً مسلمانوں کو محنت، غیرت، ہمت اور جدوجہد کا پیغام دیتے رہے۔ ان کا یہی پیغام ہماری قومی زندگی کے احیا کا بڑا سبب تھا۔ انہوں نے ۱۹۳۰ء میں پاکستان کا تصور پیش کیا اور ۱۹۴۷ء میں پاکستان وجود میں آ گیا۔

اقبال ایک عظیم مفکر، شعلہ نوا شاعر اور امت مسلمہ کے بہت بڑے محسن تھے۔ اس دیدہ ور کے فکر و فن پر بیشمار کتابیں اور مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے کلام کا ترجمہ دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ سلسلہ جاری ہے اور جاری رہے گا۔ فی الحقیقت اقبال پورے عالم اسلام کی متاع عزیز ہیں۔ مشہور کتاب اسباب زوال امت کے مصنف علامہ اقبال کے مداح شکیب ارسلان کے قول کے مطابق دنیائے اسلام نے گذشتہ ہزار سال میں اقبال سے بڑا مفکر پیدا نہیں کیا، تاہم اقبال دوستی اور پاکستان سے باہر اقبال شناسی میں ہمارے برادر ملک ایران کو سب پر سبقت حاصل ہے۔ اقبال نے ایران کی خوبصورت شیریں اور ہر لحاظ سے غنی زبان فارسی کو ذریعہ اظہار بنایا اور ہمیں معلوم ہے کہ ان کا بیشتر کلام فارسی میں ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ ان کے کلام کا ترجمہ دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں

Marfat.com

ہو چکا ہے۔ اٹلی کے مشہور مستشرق جناب الیگزینڈر بوسانی نے علامہ کی کتاب **جاوید نامہ** کا ترجمہ اطالوی زبان میں کیا جو ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا۔ انگریزی، روسی، عربی اور فرانسیسی میں بھی ان کے کلام کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اقبال اور ایران کی باہمی وابستگی کے سلسلے میں ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ وہ اپنی زندگی میں کبھی ایران نہ جاسکے مگر ان کے کلام میں شیراز، اصفہان، تہران اور تبریز کا ذکر بار بار آتا ہے۔ ایک شعر میں کہتے ہیں:

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گل ایراں وہی تبریز ہے ساقی

دوسری اہم بات جو اس سلسلے میں کہنا مناسب ہوگی وہ یہ ہے کہ جنوبی ایشیا بشمول پاکستان میں فارسی اور دین اسلام ایرانی صوفیہ اور علما کے توسط سے روشناس ہوئے۔ مسلمان حکمران خواہ وہ غزنوی ہوں یا ترک یا مغل سب فارسی زبان تھے اور یہ زبان تقریباً سات صدیوں تک سرکاری، علمی اور مذہبی زبان رہی۔ ان سات صدیوں میں فارسی ادب کمال کو پہنچا اور فارسی شعرا اور ادبا کی بڑی تعداد نے فارسی ادب کی ترویج و ترقی میں حصہ لیا۔ اس کہکشاں میں علامہ اقبال کو ایک ایسے چمکدار ستارے کی حیثیت حاصل ہے جو سب سے ممتاز اور نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کا امتیاز نہ صرف محاسن کلام کی بنیاد پر ہے بلکہ ان کا پیغام بھی فکر انگیز ہے۔ اقبال کو شروع ہی سے فارسی اور ایران سے دلی لگاؤ تھا۔ انہوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے جو مقالہ لکھا وہ ایران کے متعلق تھا۔ ایک ایرانی اسکالر کے بقول حق تو یہ ہے کہ اقبال کو ایرانی ادب سے والہانہ عشق تھا، وہ فقط محبّ دین اور محبّ مشرق ہی نہ تھے بلکہ محبّ ایران بھی تھے۔ انہیں ایران کی ادبی، سیاسی اور دینی تاریخ پر پورا پورا عبور حاصل تھا۔ اقبال فی الواقع فارسی زبان کو تمام اسلامی ممالک تک رسائی کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے شعر برائے ادب کی بجائے شعر برائے زندگی اور ادب برائے حیات کے نئے مکتب کی بنیاد رکھی۔

ایران میں اقبال کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ جس ایرانی سے بات کریں وہ اقبال کا مداح نظر آتا ہے خواہ وہ ایران کے روحانی رہنما آیت اللہ سید علی خامنہ ای ہوں یا کابینہ کے وزرا یا عام ایرانی مسلمان، سبھی اقبال کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔ ایرانیوں سے ملاقات کرتے ہوئے ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اقبال پاکستان کی پہچان ہیں۔ کتابوں کی دکانوں میں گھومیں تو تہران کی ہر دکان پر اقبال کی کتابیں نظر آتیں ہیں۔ ایران کے اسلامی انقلابی مفکر ڈاکٹر علی شریعتی مرحوم نے ایک کتاب **ما و اقبال** کے نام سے لکھی ہے۔ آیت اللہ شہید مطہری نے اپنی کتاب **نہضت ھای اسلامی در صد سال اخیر** میں اقبال کا تفصیل سے

Marfat.com

ذکر کیا ہے۔ آیت اللہ سید علی خامنہ ای کی کتاب میں بھی علامہ اقبال پر مفصل بحث اور ان کی تصویر موجود ہے۔ حجت الاسلام ہادی نجف آبادی کی کتاب میں علامہ اقبال کا ذکر ہے۔ اقبال شناسی پر ایران میں بہت سی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ معروف ایرانی شاعر ملک الشعرا بہار نے صحیح کہا ہے'' قرن حاضر خاصہ اقبال گشت۔'' ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی نے ۱۹۵۲ء میں ایک کتاب رومی عصر کے عنوان سے لکھی جو ایران میں چھپی۔ اس کتاب میں ایران اور اقبال کے باہمی تعلق کی تفصیلات موجود ہیں۔ ڈاکٹر علی شریعتی اقبال کے انقلابی تصورات، آفاقی خیالات اور اسلامی نظریات سے بہت متاثر تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے اسلامی تصورات کو ایران میں مقبول بنانے میں ڈاکٹر شریعتی نے ایک اہم کردار ادا کیا۔ قیام پاکستان سے پہلے ۱۹۴۵ء میں مشہد میں بزم اقبال قائم ہوئی۔ ڈاکٹر شریعتی نے اقبال کو ضد استعمار کی حیثیت سے ایران میں متعارف کرایا اور حسینیہ ارشاد میں باقاعدگی کے ساتھ یوم اقبال منانے کا اہتمام کیا، ایک ایرانی عالم احمد سروش نے اقبال کے کلیات کو مرتب کر کے شائع کرایا۔ فی الواقع ایران اقبال کو اپنا سمجھتا ہے۔

اقبال ایران سے اپنے قلبی اور ذہنی رابطہ کا برملا اظہار اپنے کلام میں جگہ جگہ کرتے ہیں۔ ارمغان پاک کے مصنف جناب ایس ایم اکرام کے مطابق اقبال کے ہاں حافظ کا تغزل اور رومی کی گہرائی ہے۔ وہ حکیم سنائی، فرید الدین عطار اور محمد حسین نظیری نیشا پوری کے خیالات سے بہت متاثر تھے۔ ارمغان حجاز میں کہتے ہیں:

ز چشمِ مستِ رومی وام کردم
سرورے از مقامِ کبریائی

اور پھر کہا:

نصیب از آتشے دارم کہ اول
سنائی از دل رومی برانگیخت

اورنظیری کے بارے میں کہتے ہیں:

بہ جام جم ندہم ایں مصرع نظیری را
''ہر کہ کشتہ نشد از قبیلہ ما نیست''

یہاں تک کہ اپنی مثنوی اسرار خودی کو وہ نظیری کے اس شعر سے شروع کرتے ہیں:

نیست در خشک و تر بیشہٗ من کوتاہی
چوب ہر نخل کہ منبر نشود دار کنم

Marfat.com

علامہ اقبال نے مثنوی گلشن راز جدید محمود شبستری کی مثنوی ''گلشن راز'' سے متاثر ہو کر لکھی۔ کہتے ہیں

بطرز دیگر از مقصود گفتم
جواب نامۂ محمود گفتم

مولانا روم تو اقبال کے پیر و مرشد تھے ہی لیکن حکمت اور فلسفیانہ افکار میں وہ سنائی، عراقی اور محمود شبستری سے بھی متاثر تھے۔ پھر وہ معروف ایرانی شعرا کے اشعار تضمین کے طور پر اپنے کلام میں لاتے ہیں کبھی وہ سعدی، خاقانی، بیدل، اور طالب آملی کا رنگ لیے ہوئے نظر آتے ہیں اور کبھی وہ غزل میں عرفی، شیرازی اور نظیری کا جلال و جمال اپنا لیتے ہیں۔ خود کہتے ہیں:

تنم گلی از خیابان جنت کشمیر
دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز است

اقبال کا مقام ہمارے ایرانی بھائیوں کی نظر میں کیا ہے اس کے لیے عبدالحمید عرفانی صاحب کی کتاب *اقبال ایرانیوں کی نظر میں* بہت مفصل معلومات کی حامل ہے۔ اقبال اتحاد ملت کے داعی تھے اور مسلمانوں کو ایک متحد فعال اور قوی معاشرہ کی صورت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا آئیڈیل جمال الدین اسد آبادی تھے جو پان اسلامزم کے مبلغ تھے اور استعماری طاقتوں کے خلاف ساری عمر سیاسی جہاد کرتے رہے۔ پھر ہمیں یہ بات نہیں بھولنا چاہیے کہ علامہ اقبال تہران کو عالم اسلام کا جنیوا دیکھنے کی آرزو رکھتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اگر ایسا ہوجائے تو جہان اسلام کی قسمت بدل سکتی ہے۔

پاکستان اور ایران نہ صرف جغرافیائی ہمسائے ہیں بلکہ ان کے درمیان مثالی دینی، تاریخی اور ثقافتی روابط بھی قائم ہیں۔ دینی تعلق اور جغرافیائی ہمسائیگی کے بعد ان دونوں برادر ممالک کے درمیان فکری اور ثقافتی لحاظ سے اقبال مضبوط ترین رابطہ ہیں۔ مفکر پاکستان علامہ اقبال کو ہمارے ایرانی بھائی احترام اور پیار سے اقبال لاہوری کہتے ہیں۔ پہلی حقیقت یہ ہے کہ اقبال کا بیشتر کلام فارسی زبان میں ہے۔ ان کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ'' ایران میں فلسفہ ما بعد الطبیعات کا ارتقا'' ایران سے متعلق ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے اقبال کو ایران سے والہانہ لگاؤ تھا اور وہ تمام عمر ایران ہی کی طرف دیکھتے رہے۔ ایرانی ادب، شعراء، صوفیہ اور علمی شخصیات سے بے حد متاثر تھے۔ محمد حسین نظیری نیشاپوری ہوں یا ابو سعید ابوالخیر، عطار ہوں یا رومی، اقبال ان سب سے متاثر تھے۔ دوسری طرف اہل ایران نے بھی اقبال کو

Marfat.com

جاننے اور پہچاننے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اقبال کی ایران میں مقبولیت کی کئی وجوہات ہیں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اقبال ایک انقلابی شاعر تھے۔ اسلامی اور مشرقی فلاسفر تھے، دین اسلام اور امت مسلمہ کا درد رکھتے تھے۔ ایران کے اسلامی انقلاب کے بعد اقبال کی بے پناہ مقبولیت سے قبل بھی وہاں اقبال پر بہت کام ہوا اور ان کے کلام کے مجموعے بکثرت شائع ہوئے مگر اقبال کے انقلابی خیالات سے بے اعتنائی برتی گئی تاہم ڈاکٹر علی شریعتی اور ان کے والد نے اقبال کے انقلابی پیغام کو عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ تہران میں قائم حسینیہ ارشاد میں اقبال پر بہت کام ہوا ہے اور اس مرکز کے آڈیٹوریم میں علامہ اقبال کے اشعار سنگ مرمر کی تختیوں پر کندہ کرا کے تمام ہال میں لگائے گئے ہیں۔

سب سے حیران کن اور اہم بات یہ ہے کہ ایران کے موجودہ روحانی رہنما حضرت آیت اللہ خامنہ ای علامہ اقبال پر ایک اتھارٹی ہیں۔ انہوں نے علامہ اقبال کا تقریباً سارا کلام پڑھا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ مارچ ۱۹۸۶ء میں ایران کی وزارت ارشاد اسلامی اور تہران یونیورسٹی کے باہمی تعاون سے اقبال پر ایک بین الاقوامی کانگریس منعقد ہوئی تھی جس میں دنیا بھر سے اقبال شناس شامل ہوئے۔ پاکستانی وفد میں علامہ اقبال کے فرزند جاوید اقبال بھی شامل تھے۔ اس کانفرنس کا افتتاح حضرت آیت اللہ خامنہ ای نے کیا۔ انہوں نے اپنی افتتاحی تقریر میں جو فی البدیہہ تھی اور ایک گھنٹہ پینتیس منٹ جاری رہی علامہ اقبال کے پیغام اور ان کی شاعری پر سیر حاصل بحث کی۔ میرے خیال میں علامہ اقبال پر اس سے بہتر تقریر کبھی نہیں ہوئی۔ ان کی یہ تقریر بعد میں ایران کے اہم روزنامہ جمہوری اسلامی کے مجلہ صحیفہ میں شائع ہوئی۔ اس مجلہ میں ایران کے معروف ماہر تعلیم، ڈاکٹر غلام علی حداد عادل نے بھی اقبال کو منظوم خراج تحسین پیش کیا تھا۔

اسی زمانے میں ایران کے ایک وزیر تعلیم سے ملاقات ہوئی جو علامہ اقبال کے عاشق اور معتقد نکلے۔ ایرانی بھائیوں کی اقبال سے محبت کے سلسلے میں یہ بات بھی میرے لیے حیران کن تھی کہ آیت اللہ خزعلی نے اپنے ایک خطبۂ جمعہ میں علامہ اقبال کو خراج تحسین پیش کیا۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ایران میں ہائی اسکول تک درسی کتابوں میں اقبال کا کلام بھی شامل ہے۔

ایران کے ایک مصنف نے پاکستان کو ایک مسجد سے تشبیہ دی ہے جو ایران کے پڑوس میں تعمیر ہوئی ہے۔ میرے خیال میں اہم ترین بات یہ ہے کہ علامہ اقبال نے ایران کے انقلاب کی پیش گوئی کی تھی۔ انہوں نے اپنی نظم ''خطاب بہ جوانان ایران'' میں نہ صرف ایران میں اسلامی انقلاب کی پیش گوئی کی بلکہ یہ اشارہ بھی کیا تھا کہ ایران میں انقلاب ایک

Marfat.com

بڑے رہنما کی قیادت میں وقوع پذیر ہوگا۔ علامہ اقبال نے اس خطاب میں کہا تھا:

می رسد مردی کہ زنجیر غلامان بشکند
دیدہ ام از روزن دیوار زندان شما

غالباً کوئی غیر ملکی شخصیت ایران میں اتنی مقبول نہیں جتنی علامہ اقبال کی شخصیت ہے۔
ان سب حقائق سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دین اسلام کے بعد اقبال ہی دونوں برادر ممالک پاکستان اور ایران کے درمیان مضبوط ترین فکری رابطہ ہیں۔

منابع

ما و اقبال، ڈاکٹر علی شریعتی
فلسفہ مابعد الطبیعات در ایران، علامہ محمد اقبال
مسلمانان در نہضت آزادی ہندوستان، آیت اللہ سید علی خامنہ ای
اقبال در کتاب ہای درسی ایران، وزارت آموزش و پرورش ایران
رومی عصر، عبدالحمید عرفانی
کلیات اقبال، احمد سروش
روزنامہ وفاق لاہور، (مضمون از ابرار مصطفی)، ۱۱ ستمبر ۱۹۸۳ء
کلیات اقبال، اردو، مطبوعہ پاکستان
کلیات اقبال، فارسی، مطبوعہ پاکستان
قرآن اور مسلمان کے زندہ مسائل، ڈاکٹر برہان الدین فاروقی
اقبال کا فارسی کلام ایک مطالعہ، رفیق خاور، بزم اقبال، کلب روڈ، لاہور

☆☆☆

Marfat.com

اقبال کا ذوقِ جمال

ڈاکٹر فقیرا خان جلدون فقری☆

ایستھیٹکس (Aesthetics) کا لفظ تاریخ جمالیات میں سب سے پہلے بام گارٹن نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں ۱۷۳۲ء میں استعمال کیا، جسے اس نے یونانی لفظ ایستھیسس (Aesthesis) سے وضع کیا جس کے معنی ''ادراک حسی'' کے ہیں۔ اس طرح فلسفہ، جمالیات سے حسی ادراک مراد لیتا ہے۔ اس لیے پہلے ہم محسوسات و موجودات یعنی آب و گل کے حوالے سے تخلیق کائنات پر بات کرتے ہیں کیوں کہ ہماری ظاہری آنکھوں کے سامنے قدرت کا جتنا جلال و جمال بکھرا ہوا ہے، وہ موجودات و مظاہر ہی کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تخلیق کائنات کی ایسی منظم ترتیب و ترکیب کیونکر معرض وجود میں آئی جس میں ہمارے فہم و ادراک سے بڑھ کر اعلیٰ و ارفع درجے کی حسن کاری سے کام لیا گیا ہے بلکہ جس کے مقابلے میں ہمارا ادراک کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا دکھائی دیتا ہے۔

یہ حسن کاری، حسن در حسن کے جلال و جمال سے معمور و پرنور ہوتے ہوئے نظر افروز و دل فروز ہے۔ اس بنا پر ساری کائنات جلال و جمال کا ایک دلکش و دیدہ زیب مرقع ہے۔ یہی وہ دلکشی ہے جس کی وجہ سے حسن کائنات نے مختلف ادوار میں بیشمار مفکرین کو اپنی طرف متوجہ کیا جنہوں نے اس ''جلالی و جمالی کائنات'' کی تخلیق اور اجزائے ترکیبی کے بارے میں کبھی حقائق بیان کیے اور کبھی محض مفروضوں اور اندازوں سے کائنات کے معرض وجود میں آنے سے متعلق اظہار خیال کیا۔ تاریخ میں دستیاب معلومات کی روشنی میں ''یونانیوں'' نے سب سے پہلے تخلیق کائنات پر غور و خوض کیا۔

''آیونیا'' اور ایلیا'' کے مفکرین اس ضمن میں ہراول دستے کا مقام رکھتے ہیں۔ سب سے پہلے مصر، بابل اور یونان میں اساطیری خداؤں کے عام تصور نے یہ عقیدہ پختہ کردیا کہ کائنات دیوتاؤں کی تخلیق ہے، جبکہ '' آیونائی'' مفکر تھیلز (Thales) نے سوچا کہ کائنات کسی ایک ہی عنصر سے بنی ہے، جو ''پانی'' ہوسکتا ہے۔ وحدت عنصر کی بنا پر تھیلز کے فلسفے میں

☆ استاد شعبۂ اردو، پشاور یونیورسٹی، پشاور

Marfat.com

وحدت الوجود کا عکس نظر آتا ہے۔ بعدازیں ''آیونیا'' ہی کے فلسفی انیکسیمنڈر (Anaximander) نے کہا کہ تخلیق کائنات لامحدود مادہ سے ہوئی ہے۔ اس نے نظریۂ ارتقا بھی پیش کیا یعنی پہلے نچلے درجے کی مخلوقات معرض وجود میں آئیں اور پھر اعلیٰ مخلوقات ظہور پذیر ہوئیں۔ پھر ''آیونیا'' ہی میں ملٹس شہر کے انیکسمنز (Anaxemines) کے مطابق کائنات اور اس میں موجود تمام اشیا ہوا سے بنی ہیں۔ فیثا غورث نے ریاضی دانی کے سبب اعداد سے کائنات کی تشکیل ظاہر کی۔ اس کے بعد ایلیائی مفکرین میں سے زینو فینز (Xenophanes) نے سب سے پہلے ہستی کے متعلق ''احدیت'' (Monism) کا اظہار کیا۔ ایلیا کا دوسرا مفکر پارمینڈیز (Parmenides) بھی احدیت کو مانتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے مطابق ہستی ایک ہے اور موجود ہے۔ زینو نے پارمنڈیز کے نظریہ وحدت الوجود کا پرچار کیا اور رواقیت یعنی (Stiocism) کے نظریے کا بانی ٹھہرا۔ شوپن ہار اسی کے چراغ سے قنوطیت (Pessimisim) کا اندھیرا پھیلاتا نظر آتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اپیکورس کا فلسفہ اپیکوریت (Epicureanism) کے نام سے مقبول و بدنام ہوا جسے لذتیت (Hedonism) پر محمول کیا گیا۔ اپیکورس کہتا ہے کہ فقط کائنات ہی جمال کی مکمل و اکمل جلوہ گاہ ہے اور حسن کے اس فطری جلوے میں انسان کے فن پارے ناقص و نامکمل ہیں۔ اس لیے وہ فنون لطیفہ کو اہمیت نہیں دیتا۔

بہرحال ہراقلیتوس نے انیکسمنز کے نظریے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہ ہوا جلتی ہے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کائنات آگ سے بنی ہے۔ ہراقلیتوس انیکسمنز کے علاوہ ایران کے زرتشت سے بھی متاثر تھا۔ بعد میں نطشے اور برگساں بھی ہراقلیتوس سے متاثر ہوئے اور انہوں نے اپنے اپنے نظریات کو ارتقائی صورت میں پیش کیا۔

ہراقلیتوس کے بعد ایمپیڈوکلیز نے اپنے عہد کے مختلف فلسفیوں سے متاثر ہوکر ارتباطی (Unifying) انداز اپنایا اور اس طرح پانی، ہوا، آگ اور مٹی یعنی چاروں عناصر کو تخلیق کائنات کے ''جلال و جمال'' میں برابر کا شریک ٹھہرایا۔ یوں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ایک دوسرے سے متاثر ہوئے بغیر تعمیر و ترقی اور ایجادات کے مراحل طے نہیں ہوسکتے۔ انکساغورس کے نزدیک بہت سے عناصر کے ایک دوسرے سے خلط ملط ہوجانے کی بنا پر کائنات معرض وجود میں آئی۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ایک نہیں بلکہ بہت سی دنیائیں ہیں جن کی تشکیل کا باعث ایک عالمگیر حرکت ہے۔

اس کے بعد سوفسطائیوں سے فکر یونان کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ پروٹاگورس

Marfat.com

(Protagorass) کے مطابق آدمی ہر شے کا پیمانہ ہے۔ نطشے پر ہراقلیتوس کے علاوہ اسی سوفسطائیت کا اثر ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ جو فلسفی طبیعاتی یا کائناتی فلسفے کے لحاظ سے کائنات کے معرض وجود میں آنے کی علت معلوم کرنے میں لگے رہے کسی ایک نقطے پر نہ پہنچ سکے۔ گویا کہ عقلیت حقیقت کا سراغ نہیں لگا سکتی۔ البتہ عشق ایک ایسی قوت اور تڑپ ہے جو زمان و مکان سے رشتہ بپا عقل کے مقابلے میں طائرسدرہ آشنا ہے اور مرغ لاہوتم و از دوست پیامے دارم کی روشنی میں اقبال عشق ہی کو حقیقت آشنا سمجھنے میں حق بجانب دکھائی دیتے ہیں۔

سقراط سے یونانی فکر اور جمالیات کے نئے عہد کا آغاز ہوتا ہے اور واقعی، کتنی چھنا چھن ناچتی صدیاں، کتنے گھنا گھن گھومتے عالم، جن کا مال اک سانس کی مہلت، سانس کی مہلت عمر گریزاں، جس کی لرزتی روشنیوں میں، جھلمل جھلمل، جھلکے اک مسحور مسافت۔ حد نظر تک وسعتِ دوراں۔ جس کی خونی سطح پر تڑپے، طوق و سلاسل میں جکڑی انسان کی قسمت۔ سقراط نے طبیعات کی بجائے انسان کو موضوع فکر بنایا۔ وہ حسن کو خیر اور علم و حکمت بھی خیال کرتا ہے۔ اس کے نزدیک حسن خیر اور خیر حسن ہے۔

سقراط ہی نے نظریہ ''تعقلات'' بھی پیش کیا۔ افلاطون اور ارسطو اس نظریے سے متاثر تھے۔ افلاطون نے اسے ''نظریۂ اعیان'' اور ''اعیان ثابتہ'' کی صورت میں پیش کیا اور بعد میں ظہور پذیر ہونے والی تصوریت (Idealism) دراصل سقراطی نظریۂ تعقلات کی ترقی یافتہ صورت ہے۔

افلاطون کے مطابق عالم ناسوت، عالم لاہوت یا عالم امثال کا پرتو ہے۔ اس کے مطابق یہ دنیا دھوکہ اور سراب سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ یہ نظریہ بیشمار اعتراضات کی زد میں آتا ہے۔ اس بنا پر اقبال نے افلاطون کو

راہب دیرینہ افلاطون حکیم		از گروہ گوسفندان قدیم

کہہ کر یاد کیا ہے کیونکہ فلاطینوس کے ذریعے جب نو افلاطونیت کا پرچار ہوا تو اقوام عالم بے عملی، سستی، کاہلی، اور رہبانیت کا شکار ہوکر اپنا وقار کھو بیٹھیں، خاص کر عجمی تصوف کے زیر اثر مسلمانوں پر سکر (مدھوشی) کی حالت طاری رہی جس کے نتیجے میں:

قومہا از سکر او مسموم گشت		خفت و از ذوق عمل محروم گشت

نہ صرف افلاطون بلکہ حافظ شیرازی بھی اقبال کی تنقید سے نہ بچ سکے۔ پھر مشترکہ شادیوں کے ''درزغوبل'' کی وجہ سے افلاطون پر معاشرتی نوعیت کے اعتراضات بھی ہیں۔ ارسطو افلاطون کا

Marfat.com

شاگرد تھا۔ ٹہل ٹہل کر خطبہ دینے کی بنا پر اس کا فلسفہ ''مشائیت'' کہلایا۔ جسے اہل یورپ پیری پٹاتک سکول(Peripatetic School) اور ہم مدرسیت بھی کہتے ہیں۔ اقبال نے اپنے کلام میں ارسطو کے فلسفے سے متعلق مشائی اور مدرسہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ارسطو ہراقلیتوس کے برعکس کائنات کو جامد مادے کا ایک ڈھیر سمجھتا ہے جس کی تخلیق مکمل ہو چکی ہے مگر اقبال کے مطابق:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید		کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون
اے کہ تو پاس غلط کردۂ خود می داری		آنچہ پیش تو سکون است خرام است اینجا

یہاں تک ''حکمت بحثیہ'' کی بات ہے۔ اس کے بعد فلاطینوس اسکندری کے حوالے سے ''حکمت ذوقیہ'' کا آغاز ہوتا ہے اور شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی بھی اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ جنہیں سلطان صلاح الدین ایوبی کے بیٹے نے چھتیس سال کی عمر میں قتل کروا دیا تھا۔

جہاں تک اشاعرہ کا تعلق ہے۔ ان کے نزدیک کائنات کی تخلیق چھوٹے چھوٹے جواہر سے ہوئی ہے اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

اقبال نہ ''اشراقیوں'' سے مطمئن ہیں، نہ ''تصوراتیوں'' و ''تجزیاتیوں'' سے، نہ مشائیت سے اور نہ اصحاب علم کلام و منطق سے، اس لیے کہ یہ سب فلسفے ہی کے مختلف روپ ہیں اور فلسفہ و علم کلام خود اندھے ہیں دوسروں کو راستہ کیا دکھائیں گے۔

مکدر کرد مغرب چشمہ ہائے علم و عرفان را		جہان را تیرہ تر سازد چہ مشائی، چہ اشراقی

اقبال فلسفے اور عشق کا فرق کرگس و شاہین کی مثال سے واضح کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

حکیمان گرچہ صد پیکر شکستند		مقیم سومنات بود و ہستند
چسان افرشتہ و یزدان بگیرند		ہنوز آدم بفتراکے نہ بستند

''اقبال کے ذوق جمال'' میں یہ حقیقت صاف طور سے عیاں ہے کہ عقل و فلسفہ پردہ ہائے افلاک چاک کرنے سے قاصر ہیں۔ اس کے برعکس عشق ایسا شورانگیز ہے کہ اس کے نالوں کا جواب افلاک سے آنے لگتا ہے اور ''حسن مطلق'' سارے حجابات سے نکل کر جلوہ گر ہو جاتا ہے:

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش		لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف
تپش می کند زندہ تر زندگی را		تپش می دہد بال و پر زندگی را

اہل فکر یا فلسفیوں کا معجزہ الجھن پہ الجھن ڈالنا ہے جبکہ اہل عشق کے معجزوں کی کیا بات؟ ان کے معجزے سے حقیقت مطلقہ مکمل طور پر جلوہ گر ہو جاتی ہے اور فرعون دریائے نیل

Marfat.com

میں غرق ہو جاتا ہے جبکہ سر بکف کلیم اللہ کے سامنے دریا خشک ہو جاتا ہے:

معجزۂ اہل فکر فلسفۂ پیچ پیچ   معجزۂ اہل ذکر موسیٰ و فرعون و طور

علاوہ ازیں:

دگر است آنسوی نہ پردہ کشادن نظری   این سوی پردہ گمان و ظن و تخمین دگر است

اور

دل گیتی انا المسموم، انا المسموم فریادش   خرد نالان کہ ما عندی بتریاق و لاراقی

حکمت و فلسفہ کرد است گران خیز مرا   خضرِ من! از سرم این بار گران پاک انداز

مزید برآں یہ کہ:

چہ کنم چہ چارہ گیرم کہ ز شاخ علم و دانش   نہ دمیدہ ہیچ خارے کہ بدل نشانم او را

اقبال شرکت میان حق و باطل قبول نہ کرتے ہوئے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیتے ہیں کہ:

مرا از منطق آید بوئے خامی   دلیل او دلیل ناتمامی

برویم بستہ درہا را کشاید   دو بیت از پیر رومی یا ز جامی

مامون الرشید نے فلسفہ و حکمت کو عربی میں منتقل کرانا شروع کیا تو نتیجے کے طور پر مذہب میں عقل پرستی کا دور شروع ہو گیا۔ جس کی بنا پر اسلامی اقدار و عقاید کو سخت دھچکا لگا۔ اقبال اس عقل پرستی اور عجمی تصوف کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔ چنانچہ کہتے ہیں،

تمدن تصوف، شریعت کلام   بتان عجم کے پجاری تمام

حقیقت خرافات میں کھو گئی   یہ امت روایات میں کھو گئی

لبھاتا ہے دل کو کلام خطیب   مگر لذت شوق سے بے نصیب!

بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا   لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا

اس لیے:

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے   گلیم بوذرؓ دلق اویسؓ ، چادر زہراؓ

نہ ایں جا چشمک ساقی، نہ آنجا حرف مشتاقی   ز بزم صوفی و ملا بسے غمناک می آیم

اور یہی وہ عجمی تصوف ہے کہ جس نے مسلمانوں کو ایسا بے عمل اور راہب بنایا کہ وہ ہندو جوگیوں کے چرنوں پہ جا جا کر گرتے اور ناک رگڑتے ہیں۔ آخر ایسے مسلمان جنہیں اپنی خودی تک بھی رسائی نہ ہو انہیں جینے اور حکمرانی کرنے کیا حق ہے؟ ان کے لیے تو بس ابلیس نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ:

Marfat.com

مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے　　پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

اور پھر:

یہ مصرعہ لکھ دیا کس شوخ نے محراب مسجد پر　　یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقت قیام آیا

اور وحید خان جیسے لوگوں کو دیکھیں کہ فخریہ اعتراف کرتے ہیں کہ:

تھے ہم پوت پٹھان کے دل کے دل دیں موڑ　　شرن پڑے رگناتھ کے سکیں نہ تنکا توڑ

ایسے مسلمان برطانوی و امریکی غلامی کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔ یہ سب ''عقل پرستی'' اور ''عجمی تصوف'' کی کرامات ہیں جن کی وجہ سے اقبال کہتے ہیں کہ:

درمیان سینہ دل خون کردہ ام　　تا جہانش را دگرگون کردہ ام

ز روداد دو صد سالش ہمین بس　　کہ دل چون کندۂ قصاب دارم!

بہرحال اقبال چونکہ ازلی و ابدی رجائیت پسند ہیں اس لیے وہ مستقبل سے مایوس نہیں اور ویسے بھی ''شاعر فرداستم'' کے مصداق وہ ہمیشہ روشن مستقبل کی نوید سناتے ہوئے دوش کے آئینے میں فردا کو دیکھتے ہیں اور حاضر کے پتھر کو اس قدر صیقل کرتے ہیں کہ اسے معجزاتی طور پر مستقبل کا آئینہ بنا لیتے ہیں۔ فلسفہ ''تخمین وظن'' ہے اور عشق ''یقین وایمان''۔ اس لیے:

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا　　آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے　　ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

عقل پرستی کے طوفان میں اقبال نے یورپی علوم وفنون کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا اس لیے کہ وہاں ہر چیز پر تصنع کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ یورپ کتے کی ناف سے کستوری بنالیتا ہے، اس کے قالین سے ہمارا بوریا، اور مخمل سے ہمارا کھدر اچھا ہے۔ اقبال کہتے ہیں یورپ کے وزیر کے عوض ہم اپنا پیادہ نہیں دیتے۔ وہ سرتاپا مشینوں کے دھوئیں میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس لیے یورپ انسان کو بھی ایک مشین ہی سمجھ بیٹھا ہے۔ افرنگ کی سیاست بھی ان کی تجارت ہی کی طرح ہے۔ غریب اور کمزور اقوام کا خون چوسنے کے لیے ''اقوام متحدہ'' بنا رکھی ہے۔ اس کی آڑ میں:

غارت گری جہاں میں اقوام کی معاش!　　ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش!

ارسطو کی مدرسیت کے ہاتھوں طفلک مکتب بھی ہلاک ہے، جس میں نہ ادائے کافرانہ اور نہ تراش آذرانہ ہے۔ اس لیے اقبال کہتے ہیں:

چشم بینا سے ہے جاری جوئے خوں
علم حاضر سے ہے دیں زار و زبوں

Marfat.com

کیونکہ علم حاضر نرا فلسفہ ہے، جو موجودات و محسوسات اور آب و گل حاصل کرنے کے در پے ہے جبکہ اقبال کے نزدیک عاشق رومی بجا فرماتے ہیں:

علم را بر تن زنی مارے بود　　علم را بر دل زنی یارے بود

وہی علم منفعت بخش اور حقیقت رساں ہے جو عشق اور واردات قلبی سے لبریز ہو۔ گویا عشق ہی حقیقت رسا اور قلب ساز ہے۔ بغیر عشق کے دل گوشت کا محض ایک لوتھڑا ہے اور جب گوشت کا یہ لوتھڑا تپش سے دل زندہ بن جاتا ہے تو انسان مرد فقیر و مرد مومن کے مقام پر فائز ہو جاتا ہے

مرد حر خود را ز گل بر می کند
خویش را بر روزگاراں می تند
ہمت حر با قضا گردد مشیر
حادثات از دست او صورت پذیر

بلکہ یہاں تک کہ:

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر!　　ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر!

جب مرد فقیر عشق و مستی کی بدولت وقت پر حکمرانی کرتا ہے تو پھر اسے کسی اور بادشاہی و تخت وغیرہ کی ضرورت ہی نہیں رہتی:

اگرچہ زیب سرش افسر و کلاہے نیست
گدائے کوے تو کمتر ز پادشاہے نیست
شایان جنون ما پہنائے دو گیتی نیست
ایں راہگذر ما را آں راہگذر مارا
او نگنجد در جہان چون و چند
تہمت ساحل، باین دریا مبند

چہ عجب اگر دو سلطان بہ ولایتے نہ گنجد　　عجب ایں کہ می نگنجد بہ دو عالمے فقیرے

حضرت بو علی قلندر، اورنگ زیب عالمگیر اور حضرت میاں میر کی مثالوں سے علامہ اقبال واضح کرتے ہیں کہ مرد فقیر کے سامنے تخت و شاہی کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ وہ بادشاہی کو دو جو کے برابر بھی نہیں سمجھتا۔ چنانچہ فقر اور مرد فقیر کا مقام واضح کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں۔

Marfat.com

چیست فقر اے بندگان آب و گل
یک نگاہِ راہ بین یک زندہ دل

فقر خیبر گیر با نان شعیر
بستہ فتراک او سلطان و میر
با سلاطین در فتد مرد فقیر
از شکوہ بوریا لرزد سریر

اور قلب او را قوت از جذب و سلوک پیش سلطان نعرۂ او لاملوک!

مرد فقیر سے اگلا درجہ انسان کامل کا ہے۔ اقبال عاشق رسول ہوتے ہوئے ''انسان کامل'' کا رتبہ حضرت نبی اکرمؐ کے شایاں شان سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ:

آیۂ کائنات کا معنی دیر یاب تو
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو
ہر کہ عشق مصطفیٰ سامان اوست
بحر و بر در گوشۂ دامان اوست
ہر کہ اندر دست او شمشیر لاست
جملہ موجودات را فرمانرواست

اس لیے:

ومید آں لالہ از مشت غبارم کہ خونش می تراود از کنارم
قبولش کن ز راہ دلنوازی کہ من غیر از دلے چیزے ندارم

انسان کامل کی بات ہی اور ہے۔ مرد فقیر کے بارے میں اقبال کہتے ہیں کہ ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما کے مصداق مرد فقیر کو موت نہیں آسکتی:

اے عالم رنگ و بو ایں صحبت ما تا چند
مرگ است دوام تو عشق است دوام من

زندگانی ہے صدف قطرہ نیساں ہے خودی وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خودگر و خودگیر خودی یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے!

یہ سب فلسفے اور عشق کا فرق ہے۔ فلسفہ مجاز اور عشق حقیقت، مجاز فانی ہے اور حقیقت لافانی۔ مجاز مجاز سے آگے نہیں بڑھتا اور عشق حقیقت تک پہنچتے ہوئے عاشق کو بھی وہ مقام دلا دیتا ہے کہ ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق۔

Marfat.com

یہ پائیداری و دلداری، حسن مطلق اور عشق کے مابین راز و نیاز کی مرہون منت ہے لیکن ''جمالیات'' کی رو سے ''موضوعیت'' اور ''معروضیت'' فلسفیانہ اصطلاحیں ہیں۔ مقالے میں اقبال کے ''ذوق جمال'' کا تقابل انہی فلسفیانہ اصطلاحات کی روشنی میں ''تصوریت'' اور ''معروضیت'' سے کیا گیا ہے اور پروفیسر بریڈلے، بارکلے موضوعی جبکہ جی ای مور، لاک، برٹرینڈرسل، جان اسٹورٹ اور ہیوم معروضی و تجزیاتی فلسفیوں کے طور پر زیر بحث لائے گئے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ''وحدت جمال'' عاشقانہ اصطلاح ہوتے ہوئے، عشق کی ترجمانی کرتی ہے اور'' اقبال کا ذوق جمال'' بھی وحدت جمال پر مشتمل ہے۔

دنیائے جمالیات میں ''جمالیاتی حس'' اور ''جمالیاتی ذوق'' بنیادی عناصر ہیں۔ ان میں جہاں تک جمالیاتی حس کا تعلق ہے وہ ''اصل'' اور جمالیاتی ذوق " فروعی'' حیثیت رکھتا ہے، اس لیے کہ حس ایک ہی ہوتی ہے اور ذوق اپنا اپنا جداگانہ رنگ ہے۔ جمالیاتی حس قدر مشترک اور ذوق انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔ اس لیے مختلف علاقوں، نسلوں، قوموں اور افراد کا ''معیارِ حسن'' بہت سی وجوہات سے مختلف ہوتا ہے، لیکن میری ذاتی رائے میں کسی معیار کی بنا پر، بنیادی طور پر حسن کی حیثیت و کیفیت میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی۔ یعنی اگر لوگوں کا معیار حسن بدل جائے یا بدلا ہوا ہو، تو اس کا حسن پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ حسن جیسا ہوتا ہے، ویسا ہی ہوتا ہے۔

موضوعین یا تصوریت پسندوں کے مطابق کائنات اور مظاہر کائنات کا ہونا نہ ہونا حواس کا مرہون منت ہے۔ اس لیے ہابز کہتا ہے روشنی آنکھوں کی وجہ سے اور قوس قزح بھی آنکھوں کی وجہ سے موجود ہے۔ گویا آنکھیں نہ ہوں تو وہ بھی نہ ہو لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب آنکھیں بھی ہوتی ہیں اور رات یا اندھیرا ہوجائے تو پھر کیوں دکھائی نہیں دیتا؟ اسی مقام پر دن کے وقت سب کچھ نظر آتا ہے اور اسی جگہ پر رات کے وقت دیکھیں تو فقط اندھیرا ہی اندھیرا ہوتا ہے۔ پھر اگر قوس قزح ہماری آنکھوں میں ہے تو ہم ہر وقت، خواہ دن ہو یا رات اسے کیوں نہیں دیکھ پاتے۔ کائنات کی وسعتوں میں کروڑوں، اربوں اشیا خصوصاً ایسے ایسے ستارے موجود ہیں جنہیں ابھی تک انسان کی آنکھ یا دوربین دیکھ نہیں پائی، تو کیا وہ موجود ہی نہیں؟ اس ضمن میں ''ول ڈیورانٹ'' بھی خوب کہتے ہیں کہ ''دوربینوں نے دیکھا اور ایک نیا سیارہ دریافت کیا، کیا اس طرح ہم نے نیپتون کو تخلیق کیا تھا؟ اسی طرح میرے پاؤں میں کل ایک خار مغیلاں چبھ گیا اور میں شدت درد سے بلبلا اٹھا۔ میری آنکھوں نے تو اسے نہیں دیکھا مگر وہ موجود تھا۔ اس سلسلے میں رومی بھی خوب فرماتے ہیں:

Marfat.com

حسن یوسفؑ دیدۂ اخوان ندید　　از دل یعقوبؑ کے شد ناپدید

بہر حال ''موضوعیت'' کے نزدیک:

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

جہاں تک ''معروضیت'' کا تعلق ہے وہ مظاہر کو دھوکہ و فریب نہیں سمجھتی بلکہ موجودات و محسوسات ہی کو حقیقت سمجھتی ہے۔

میرے نزدیک ''حسن خدا ہے اور خدا حسن ہے۔ خدا اس لیے خدا ہے کہ خدا حسن ہے اور حسن اس لیے خدا ہے کہ حسن خدا ہے۔'' جب حسن خدا ٹھہرا تو ہر قسم کا حسن لافانی اور لازوال ہوا۔ یونانیوں کے ہاں پہلے پہل ''حسنِ مطلق'' کا تنزیہی تصور تھا جو بعد میں رفتہ رفتہ تجسیمی صورت اختیار کر گیا۔ اس سے ''بت گری'' اور ''اصنام تراشی'' کا فن معرض وجود میں آیا۔ اس طرح خدا کو اپنی ہی شکل و صورت اور عادات و اطوار کے مطابق ظاہر کیا گیا۔ ایلیائی مفکر زینوفینز نے اس رویے کی شدید مخالفت کی اور ناصر علی سرہندی نے کہا:

مرا بر صورت خویش آفریدی　　بیرون از خویشتن آخر چہ دیدی

اور اقبال کے مطابق:

ذوق حضور در جہان رسم صنم گری نہاد　　عشق فریب می دہد جانِ امیدوار را

دل و دیدۂ کہ دارم ہمہ لذت نظارہ　　چہ گنہ اگر تراشم صنمی ز سنگِ خارہ

گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقشبند　　میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں!

یہ ساری جستجو اور ''تجسیم سازی'' اس لیے ہے کہ محبوب حقیقی بلا واسطہ، کہیں دکھائی نہیں دیتا جس کے نتیجے میں کسی نے کعبہ اور کسی نے بت خانہ بنا رکھا ہے۔ چنانچہ:

سرگرم تجلی ہو اے جلوۂ جانانہ　　اڑ جائے دھواں بن کر کعبہ ہو کہ بت خانہ

یعنی کہ اگر:

ہم ایک بار جلوۂ جانانہ دیکھتے　　پھر کعبہ دیکھتے نہ صنم خانہ دیکھتے

علامہ محمد اقبال، ''من عرف نفسہ فقد عرف ربہ'' کی روشنی میں،

ما ترا جوئیم و تو از دیدہ دور
نے غلط ما کور و تو اندر حضور
اگر چشمے کشائی بر دل خویش
درون سینہ بینی منزل خویش

Marfat.com

سفر اندر حضر کردن چنین است
سفر از خود بخود کردن چنین است

حسن کا گنج گرانمایہ تجھے مل جاتا　　تو نے فرہاد نہ کھودا کبھی ویرانہ دل ۔

اللہ تعالیٰ ''حسنِ مطلق'' ہے اور اللّٰہ نور السموت والارض کی روشنی میں، حسن ایک زبردست قوت ہے۔ میں یہاں نور سے مراد حسن لیتے ہوئے، عرض کروں گا کہ حسن یعنی اللہ تعالیٰ زمینوں اور آسمانوں کا حسن و جمال ہے اور حسن وجمال یا جلال ۔ جمال کو میں ایک زبردست باکمال و بے مثال اور لازوال قوت سمجھتا ہوں۔

چونکہ انسان کے پاس ایسا کوئی دوسرا طریقہ نہیں کہ اس کے وسیلے سے ''حسن ازل'' کو بیان کرسکے اس لیے تجسیم اور مجاز ہی کا طریقہ اپنایا گیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جاسکے۔ اس کے علاوہ انسان اور کر بھی کیا سکتا ہے؟ اقبال بھی،

دام ز گیسواں بدوش- زحمت گلستاں بری
صید چرا نمی کنی طائر بام خویش را

کے حوالے سے ''حسنِ مطلق'' کو مجسم انداز ہی میں پیش کرتے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ ''حسن مطلق'' نے بھی اپنے آپ کو کسی نہ کسی حوالے سے مجازی روپ ہی میں پیش کیا ہے۔ اگر طور پہ تجلی گرائی ہے تو طور مجازی ہے اگر مظاہر کے پردے میں جلوہ گری کی ہے تو مظاہر بھی مجازی ہیں، بلکہ ساری کائنات ہی مجاز ہے۔ قرآن حکیم میں اپنی قدرت ثابت کرنے کے لیے مجاز ہی کی قسمیں کھائی ہیں۔ پیغمبروں کو بھیجا ہے تو بھی مجازی روپ میں، اس لیے کہ انسان کو سمجھانے اور منانے کا اس سے بہتر طریقہ اور نہیں ہوسکتا اور جواباً انسان نے بھی،

چند بروے خود کشی پردۂ صبح و شام را
چہرہ کشا تمام کن جلوۂ ناتمام را

کہتے ہوئے مجازی انداز بیان میں اپنے دل کی بات کی ہے۔ اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتا ہے؟

''حکمت بحثیہ'' والے بحث ہی کرتے رہ جاتے ہیں اور ''حکمت ذوقیہ'' والے، عاشق حقیقت کی جھلکیاں راتوں کو ستاروں، سرشار بہاروں اور آبشاروں میں دیکھ لیتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک دعا اور عبادت کے ذریعے بھی حضوری نصیب ہوسکتی ہے۔ خطبات میں اقبال نے عبادت کو بھی دعا ہی کہا ہے:

Marfat.com

نکو ملکیست ملک صبحگاہی
دراں کشور بیابی ہر چہ خواہی
من آں شمعم کہ در شب زندہ داری
ہمہ شب می کنم چون شمع زاری

نظامی گنجوی کی طرح اقبال بھی

ز اشکِ صبحگاہی زندگی را برگ و ساز آور
شود کشت تو ویراں تا نہ ریزی دانہ پے در پے

پر یقین رکھتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ:

عشق شور انگیز را ہر جادہ در کوے تو برد
بہ تلاش خود چہ می نازد کہ رہ سوے تو بردا

حسن مطلق کی معرفت ہر طرح کے حسن مجازی کے بغیر ناممکن ہے۔ حسن فطرت ہو یا حسن انسان بات دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے۔ اس لیے دونوں جگہوں میں معنی مولا ہے جلوہ گر!

ترا حق داد چشمِ پاک بینے
کہ از نورش نگاہے آفرینے

جلوہ دہد باغ و راغ معنی مستور را
عین حقیقت نگر حنظل و انگور را

تجزیاتی فلسفے کے برخلاف اقبال کے نزدیک مظاہر حقیقت نہیں، بلکہ حقیقت کی صفات ہیں اور تصوراتیوں کے برعکس کائنات یا مظاہر فطرت واہمہ و سراب نہیں بلکہ تخلیق بالحق ہیں۔ اس لیے:

گلزار ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ		ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ
کھولی ہیں ذوق دید نے آنکھیں تری اگر		ہر رہگذر میں نقش کف پائے یار دیکھ

فطرت کے علاوہ حسن نسوانی یا حسن انسان بھی معرفت کا ایک ذریعہ ہے۔ اس لیے کہ گل لالہ کے پردے میں جو حسن جلوہ گر ہے، وہی حسن کسی کے رخسار سے بھی جھلک رہا ہے۔ چنانچہ اقبال نے معرفت حسن مطلق کی خاطر اس راستے کی راہ نوردی بھی کی ہے!

مدتے با لالہ رویان ساختم
عشق با مرغولہ مویان باختم

Marfat.com

مگر یہ بھی ہے کہ:

حسرت جلوۂ آن ماہ تمامے دارم
دست بر سینہ نظر بر لب بامے دارم

اور پھر جنت میں حوروں کے اصرار کے باوجود اس لیے نہیں ٹھہرتے کہ:

عشق در ہجر و وصال آسودہ نیست　　بے جمالِ لایزال آسودہ نیست
ابتدا پیش بتان افتادگی　　انتہا از دلبران آزادگی
کیش ما مانند موج تیز گام　　اختیار جادہ و ترکِ مقام

اقبال کہتے ہیں:

غربیان را زیرکی سازِ حیات
شرقیاں را عشق رازِ کائنات

انہوں نے فلسفہ ضرور پڑھا، مگر پھر خرد کی گتھیاں سلجھانے کے بعد صاحب جنوں ہو گئے۔

واقعی وحشت ہے خردمندوں کی صحبت سے مجھے میر
اب جا رہوں گا واں کوئی دیوانہ جہاں ہو
بے شک، خرد افزود مرا درس حکیمان فرنگ
لیکن سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظران

اسی لیے:

پیر رومی خاک را اکسیر کرد　　از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد
راز معنی مرشد رومی کشود　　فکر من بر آستانش در سجود

تب کہیں جا کر

کشودم از رخ معنی نقابے　　بدست ذرہ دادم آفتابے

اور

دو عالم را توان دیدن بمینائے کہ من دارم　　کجا چشمے کہ بیند آن تماشائے کہ من دارم

اقبال یہ سب کچھ فلسفے سے نہیں بلکہ عشق کے بل بوتے پر کرتے ہیں۔ صحبت صاحب نظراں کی بدولت اقبال رومی کے اس فرمان پر عمل کرتے ہیں کہ:

آن نگاہے پردہ سوز از من بگیر　　کو بچشم اندر نمی گردد اسیر
جملہ تن را در گداز اندر بصر　　در نظر رو در نظر رو در نظر
آدمی دید است باقی پوست است　　دید آن باشد کہ دید دوست است

Marfat.com

اقبال کا ایمان ہے کہ،

این بدن با جانِ ما انباز نیست
مشتِ خاکے مانعِ پرواز نیست

یہ مشتِ خاک پرواز کر سکتی ہے اور ''حسنِ مطلق'' کا دیدار بھی کر سکتی ہے۔ اس لیے اقبال حسن مطلق سے عرض کرتے ہیں کہ:

چند بروے خودکشی پردۂ صبح و شام را چہرہ کشا تمام کن جلوۂ ناتمام را
از زیان صد شعاع آفتاب کم نمی گردد متاعِ آفتاب

کیوں کہ:

چشم در کشتِ محبت کاشتم از تماشا حاصلے برداشتم
اگر مقصودِ کل میں ہوں تو مجھ سے ماورا کیا ہے؟ مرے ہنگامہ ہائے نو بنو کی انتہا کیا ہے؟

حسن کو جب مجسم صورت میں پیش کیا جائے تو ''فن'' کہلاتا ہے۔ میں نے فن کار کے لیے، ''حسن کار'' اور ''فن پارے'' کے لیے ''حسن پارہ'' کی اصطلاح تجویز کی ہے۔ ''اقبال کا ذوقِ جمال'' حسن و عشق، خودی اور حرکت و عمل سے تکمیل پاتا ہے۔ اس لیے وہ ان چاروں عناصر کو فن کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں۔ ورنہ فن کا افادی پہلو ختم ہو جاتا ہے۔

اقبال فن کے ''کسبی'' اور ''وہبی'' ہونے پر برابر یقین رکھتے ہیں۔ کیوں کہ:

ہر چند کہ ایجادِ معانی ہے خدا داد
کوشش سے کہاں مردِ ہنرمند ہے آزاد

اس لیے کہتے ہیں کہ:

درمیانِ کارزارِ کفر و دین ترکشِ ما را خدنگِ آخرین

میری چالیسویں کوشش کا نتیجہ ہے اور یوں بھی ہے کہ:

جز نالہ نمی دانم گویند غزل خوانم ایں چیست کہ چوں شبنم بر سینہ من ریزی

اقبال کے نزدیک معجزۂ فن کی نمود خونِ جگر سے ہوتی ہے۔ اس لیے کہ خونِ جگر کے بغیر ''حسن کاری'' کے سبھی نقوش ناتمام ہیں۔ وہ کہتے ہیں افادی حسن کاری کے لیے ضروری ہے کہ فرد و ملت کے اتحاد و رابطے پر زور دے۔ اقبال اجتہادِ فکر و نظر پر بھی زور دیتے ہیں۔ تقلید سے پرہیز اور تسخیرِ فطرت بھی ان کی حسن کاری کا مطمحِ نظر ہے۔ تقلید و پیروی سے اقبال کو غلامی کی بو آتی ہے:

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب

Marfat.com

نے ز سحر ساحران لالہ روست نے ز عریاں ساق و نے از قطع موست
محکمی او را نہ از لادینی است نے فروغش از خط لاطینی است
قوت افرنگ از علم و فن است از ہمیں آتش چراغش روشن است
علم و فن را اے جوان شوخ و شنگ مغز می باید نہ ملبوسِ فرنگ

اور اجتہاد سے ان کی مراد انقلاب و مثبت تبدیلی ہے جس کے تحت وہ ایک ایسا " ولولۂ تازہ" بخشتے ہیں کہ ممولے کو شہباز سے لڑا دیتے ہیں اور کبوتر کے تن نازک میں شاہین کا جگر پیدا کردیتے ہیں۔ تسخیر فطرت کا نظریہ انہوں نے افلاطون کی تصوریت اور جان رسکن کی فطرت کے ردعمل کے طور پر پیش کیا:

ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد عالمے از ذرہ تعمیر کرد

وہ کہتے ہیں کہ غلامانہ علوم وفنون مایوسی و مردنی کی تصویر ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی افادی پہلو نہیں ہوتا۔ وہی ''حسن کاری'' بہترین زندگی کی امین ہوتی ہے جو ملت کو''ہستم اگر می روم گر نہ روم نیستم'' کا پیغام دے۔ حضور نے امراء القیس کو دوزخیوں کا سرخیل اس لیے کہا کہ اس کی شاعری عیش وعشرت کی دلدادہ اور محنت ولگن سے بعید ہے۔ اس کے مقابلے میں حضورؐ نے جب عنترہ کا یہ شعر سنا۔

ولقد ابیت علی الطویٰ واظلہ حتی انال بہ کریمہ الماکل

تو بہت خوش ہوئے اورعنترہ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔

اقبال کہتے ہیں عقل کھدر کو اطلس بنا دیتی ہے، اس کا کمال پتھر کو آئینے میں تبدیل کردیتا ہے لیکن شاعر جادو نگار کا گیت، زندگی کے زہر کو شہد بنا دیتا ہے جو کہ بہت بڑی عبادت و افادیت ہے:

خرد کرپاس را زربینہ سازد کمالش سنگ را آئینہ سازد
نوائے شاعرے جادو نگارے ز نیش زندگی نوشینہ سازد

اقبال کی ''حسن کاری'' جبر و استبداد کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں عدل و انصاف اور ہمدردی و غمگساری کی نورانی قوس قزح ہے۔ وہ مایوسی و ناامیدی کے خلاف ''کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا'' کے مصداق، انسانیت کے ہاتھ میں عزم و استقلال اور امید و یقین کا بلند و بالا علم تھما دیتے ہیں جسے دنیا کی کوئی طاقت سرنگوں نہیں کرسکتی۔ اقبال مظلوموں و بیکسوں کو اپنی قسمت پر پنجرے کے پنچھی کی طرح چپکے چپکے آنسو بہانے کی بجائے ظالم کے خلاف کمربستہ ہو کر اٹھ کھڑے ہونے کا جرأت آموز پیغام دیتے ہیں:

Marfat.com

از خواب گران خوب گراں خواب گراں خیز

از خواب گراں خیز

ان کی حسن کاری جلال و جمال کا ایسا جلیل و جمیل آمیزہ ہے، جس میں بجلی کی کڑک کے ساتھ ساتھ حسن و جمال کی مسحور کن جھلک پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی حسن کاری میں، چودھویں کے چاند کی نکھری ہوئی خنک چاندنی اور آفتاب یوم نشور کی جگر اندوختہ تمازت بھی ہے جس کے اثر سے مردوں کی رگوں میں بھی کشمکش حیات کی ہلچل مچلنے لگتی ہے۔ گویا انہوں نے اپنے نغمے کی صورت میں ایسا صور پھونکا ہے جس کی حرارت سے قوموں کا منجمد خون گرم ہو کر دوڑنے لگتا ہے۔ اس طرح اقبال امنگوں، آرزوؤں، امیدوں، جرأتوں، حوصلوں اور ولولوں کا پیامبر ٹھہرائے جانے کے مستحق ہیں۔ ان کے نزدیک شاعر کا بڑا کارنامہ اور فرض اولین یہی ہے کہ کمزوروں کو نطشے کی طرح ''دبایا'' نہ جائے بلکہ انہیں زندگی کی ولولہ انگیز قوت اور ناقابل تسخیر عزم و ہمت کے ساتھ ''جگایا'' جائے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ اقبال چڑھتے سورج کے ہرگز پجاری نہیں بلکہ وہ غریبوں، دردمندوں اور کمزوروں کے مسیحا ہیں:

بشکوہ بے نیازی ز خدایگان گذشتم　　　صفت ماہے تمامے کہ گذشت بر ستارہ

اور کیا خوب کہا:

بجلال تو کہ در دل دگر آرزو نہ دارم　　　بجز ایں دعا کہ بخشی بہ کبوتران عقابی

اقبال ایسی شاعری کے قائل ہیں کہ جو ''بت گری'' کی بجائے ''آدم گری'' کی صفات سے مالا مال ہوتے ہوئے پیغمبرانہ فرائض ادا کرتی ہو۔ ان کی اپنی حسن کاری اسی کمال لازوال سے عبارت ہے۔ اقبال پیغمبر نہیں مگر قلندر ضرور ہیں:

بیا بہ مجلس اقبال و یک دو ساغر کش　　　اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

سازِ سخن کے پردے میں اقبال نے وہی فریضہ سرانجام دیا ہے جو حضرت ابراہیمؑ سے لے کر آنحضورؐ تک مختلف انبیاء کرام نے اپنی اپنی امتوں کو ودیعت فرمایا۔ اقبال کو اس بات پر فخر ہے کہ وہ آپؐ کے ایک سچے امتی کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کر گئے:

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست　　　سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

جہاں تک اقبال کے مجموعی ''ذوق جمال'' کا تعلق ہے تو اس کا نچوڑ یہی ہے کہ ایک عاشق ہونے کے ناتے اقبال حسن و جمال کے تمام مظاہر سے گذرتے ہوئے ''حسن مطلق'' کی طرف اپنا سفر جاری رکھتے ہیں:

گہے ہر پردۂ فطرت دریدم　　　جمال یار بیباکانہ دیدم

Marfat.com

وہ راستے میں کہیں نہیں ٹھہرتے، خواہ حواران خلد ہی کیوں نہ انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کریں۔ اقبال از یسار و از یمین حوروں کے شور وغوغا کو بھی خاطر میں نہیں لاتے اور:

عشق در ہجر و وصال آسودہ نیست　　　بے جمال لایزال آسودہ نیست
کیش ما مانند موجِ تیز گام　　　اختیار جادہ و ترک مقام

کہتے ہوئے ہر دم جواں اور رواں دواں رہتے ہیں یہاں تک کہ معرفت حق کے اس مقام تک جا پہنچتے ہیں کہ بس:

چشم در کشتِ محبت کاشتم　　　از تماشا حاصلے برداشتم

اور جب اقبال ''حسن مطلق'' سے یہ کہتے ہیں کہ:

چند بروئے خود کشی پردۂ صبح و شام را　　　چہرہ کشا تمام کن جلوۂ ناتمام را

تو جواباً محبوب بھی مظاہر و صفات کے تمام پردے اپنے چہرے سے ہٹا کر انجمن آرائی کرتے ہوئے جلوہ گر ہوجاتا ہے۔ یہی وہ حیرت انگیز اور دل آویز گھڑی ہے جب ''اقبال کا ذوق جمال'' حسن لایزال کے دیدار پر بہار سے ہمکنار ہوجاتا ہے اور معروضی یعنی تجزیاتی اور موضوعی یعنی عینی یا تصوراتی فلسفے اور فلسفیوں کے برخلاف اقبال اپنے ''واردات قلبی'' کی روشنی میں کیا خوب کہتے ہیں:

کوہ و دریا و غروب آفتاب　　　من خدا را دیدم آنجا بے حجاب

الٹ جائیں گی تدبیریں بدل جائیں گی تقدیریں
حقیقت ہے نہیں میرے تخیل کی یہ خلاقی!

☆☆☆

Marfat.com

اقبال کا تصورِ خودی

یونس حسن☆

تیری زندگی اسی سے، تیری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی، نہ رہی تو رُوسیاہی

اقبال کا فلسفۂ خودی کسی ماورائی تصور یا تخیل پر مبنی نہیں بلکہ یہ ایک ایسا لائحہ عمل ہے جسے اقبال نے افراد اور قوم کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے ترتیب دیا۔ خودی یا انانیت کا لفظ اردو میں تکبر وغرور کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مگر اقبال کے نزدیک خودی سے مراد خودآگاہی، ذوقِ طلب، عشق و ایمان بلکہ یہ حیات ہی کا دوسرا نام ہے۔ اقبال اسرار خودی کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

شاعرانہ تخیل محض ایک ذریعہ ہے اس حقیقت کی طرف توجہ دلانے کا۔ لذتِ حیات انا کی انفرادی حیثیت اس کے اثبات، استحکام، اور توسیع سے وابستہ ہے۔ یہ لفظ اس نظم میں بمعنی غرور استعمال نہیں کیا گیا جیسا کہ اردو میں عام طور پر مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم محض احساس نفس یا تعین ذات ہے۔

گویا خودی کی بنیاد من عرف نفسہ، فقد عرف ربہٗ (جس نے اپنے آپ کو پہچانا، اس نے اپنے رب کو پہچانا) پر ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے مضمون ''اقبال و صوفی۔ خودی سے بے خودی تک'' میں رقمطراز ہیں:

اقبال کی خودی کیا شے ہے؟ اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اقبال کے نزدیک یہ سب کچھ ہے۔ انہوں نے مختلف موقعوں پر اس کے الگ الگ معانی بیان کیے ہیں مثلاً خودی، خودحیات کا دوسرا نام ہے، خود عبارت ہے، ذوقِ استیلا سے، خودی ذوق طلب ہے، خودی ایمان کے مترادف ہے، خودی سرچشمۂ جدت و ندرت ہے، خودی یقین کی گہرائی ہے، خودی سوزحیات کا سرچشمہ ہے، ذوقِ تخلیق کا ماخذ ہے۔ غرض اس قسم کے گوناگوں معانی و صفات خودی سے وابستہ ہوئے ہیں۔ یہ سب اثبات خودی کی صورتیں ہیں جو ہر چیز کو ترقی کی اگلی منزلوں کی طرف محرک ثابت ہو رہی ہے۔

اقبال کے نزدیک کائنات کی اصل ایک وجود بیکراں ہے جس کے اندر شعور اور

☆ لیکچرار، گورنمنٹ اسلامیہ ڈگری کالج، قصور

Marfat.com

ارادے کی قوتیں پوشیدہ ہیں۔ ان قوتوں کو بروئے کار لانے کے لیے اس نے اپنے آپ کو خود یا غیر خود یا پھر فلسفے کی اصطلاح میں موضوع اور معروض کو یکجا کر دیا ہے۔ غیر خود کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ خودی اور اس کے مشاہدے کے لیے آئینے اور اس کے ارتقائی عمل کے لیے معمول کا کام سرانجام دے۔ خودی اپنی تکمیل اور استحکام کے لیے غیر خود قوتوں سے ٹکراتی ہے اور اس تصادم کے ذریعے اس کی اندرونی قوتیں نشوونما حاصل کرتی اور اسی طرح ارتقا کا سلسلہ طے کرتی ہیں۔ اس کی ہستی مسلسل حرکت اور عملِ پیہم اور کشمکش سے وابستہ ہے۔ جس نسبت سے کوئی شے اپنی خودی میں مستحکم ہوتی ہے اُسی نسبت سے اس کا کائنات میں درجہ متعین ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو علامہ اقبال نے اپنے فارسی کے درج ذیل اشعار میں بیان کیا ہے:

پیکر ہستی ز آثار خودی است ہرچہ می بینی ز اسرار خودی است
خویشتن را چون خودی بیدار کرد آشکارا عالم پندار کرد
صد جہان پوشیدہ اندر ذات او غیر او پیداست از اثبات او
سازد از خود پیکر اغیار را تا فزاید لذت پیکار را
چون حیات عالم از زور خودی است پس بقدر استواری زندگی است
چون زمین بر ہستی خود محکم است ماہ پابند طواف پیہم است
ہستی مہر از زمین محکم تر است پس زمین مسحور چشمِ خاور است

اقبال کے نزدیک اسی سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی انسان ہے۔ اقبال نے اپنے کلام میں اس کی وضاحت یوں کی ہے:

یہ موج نفس کیا ہے؟ تلوار ہے خودی کیا ہے؟ تلواروں کی دھار ہے
خودی کیا ہے؟ رازدان حیات خودی کیا ہے؟ بیداریِ کائنات
ازل اس کے پیچھے، ابد سامنے نہ حد اس کے پیچھے، نہ حد سامنے
زمانے کے دھارے میں بہتی ہوئی ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
ازل سے ہے کشمکش میں اسیر ہوئی خاک آدمؑ میں صورت پذیر
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

علامہ اقبال کے نزدیک تمام مخلوقات میں بہ اعتبار مدارج انسان اس لیے اعلیٰ ہے کہ وہ اپنی ذات میں خودی کی حقیقت کو اپنا کر اپنے مقصد کا شعور حاصل کرتا ہے اور یہی شعور اس کو تمام چیزوں سے ممتاز کرتا ہے۔ یہ بھی مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہے مگر اس کی ہستی محض

Marfat.com

اعتباری نہیں، بلکہ حقیقی ہے۔ اس کے مقابلے میں عالم فطرت کا وجود محض اضافی اور انسانی مشاہدے اور ادراک کا پابند ہے۔ اس حقیقت کو انہوں نے اس طرح واضح کیا ہے:

این جہان چیست؟ صنم خانہ پندار من است جلوۂ او گروِ دیدۂ بیدار من است
ہمہ آفاق کہ گیرم بنگاھی او را حلقہ ای ہست کہ از گردشِ پرگار من است

اقبال کے نزدیک انسانی زندگی کا نقطۂ آغاز اپنی خودی کا شعور ہے اور اس کی حقیقت اسی میں پوشیدہ ہے کہ انسان خودی کو روز بروز مضبوط اور مستحکم کرتا چلا جائے اور خودی کے استحکام کی یہی صورت ہے کہ انسان اپنے طبعی ماحول سے مسلسل جنگ کرتا رہتا ہے اور اپنے لیے نئے نئے مقاصد کا تعین کرتا ہے اور ان مقاصد کے حصول کے لیے بھرپور کوشش کرتا ہے اور اپنی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ دور کرتا ہے اور مشکلات کا مقابلہ کرکے ان پر غالب آنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح اقبال کے نزدیک اس کی ذہنی صلاحیتیں اور قوتِ عمل مسلسل تیز ہوتی رہتی ہے اور اس کے سینے میں خودی کی تڑپ زیادہ تیز ہوتی چلی جاتی ہے۔ درج ذیل اشعار میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے:

زندگانی را بقا از مدعا است کارِ دانش را درا از مدعا است
زندگی در جستجو پوشیدہ است اصل او در آرزو پوشیدہ است
از تمنا رقص دل در سینہ ہا سینہ ہا از تاب او آئینہ ہا
ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم! از شعاع آرزو تابندہ ایم

یہ سوز آرزو طالبِ خودی کو بے قرار رکھتا ہے اور اسے چین نہیں آتا۔ ایک مقصد کے حصول کے بعد وہ دوسرے مقاصد کے حصول کے لیے جدوجہد کرنا شروع کردیتا ہے۔ اس طرح راہِ طلب میں اس کے قدم آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور اقبال کے نزدیک اسی سعیِ پیہم اور جہدِ مسلسل کا نام زندگی ہے۔ خودی کی منزل زمان و مکان کی تسخیر پر ختم نہیں ہوجاتی۔ خودی کا تصور انسانی تخیل کے اندر جدوجہد کے عمل کو تیز کرتا ہے اور انسان کے لیے نئی منازل کا تعین کرتا ہے۔ اس کی وضاحت اقبال نے درج ذیل اشعار میں کی ہے:

خودی کی ہے یہ منزل اوّلیں مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں جہاں تجھ سے ہے، تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا تیری شوخیِ فکر و کردار کا

Marfat.com

تصورِ خودی کے مآخذ

فلسفۂ خودی کے مآخذ تلاش کرنے میں اقبالیات کے ماہرین نے کئی ایک نظریے قائم کیے ہیں۔ بعض نے تصورِ خودی کی بنیاد ہیگل، نٹشے، فشٹے، برگساں اور لائیڈ مارگن کو قرار دیا ہے، لیکن یہ درست نہیں۔ اگرچہ اقبال نے بعض یورپین مفکرین کے اثرات کو قبول کیا ہے لیکن اقبال نے مغرب اور مشرق کے مفکرین سے استفادہ کرنے کے باوجود تصورِ خودی کے بنیادی ڈھانچے کو قرآنی تعلیمات پر استوار کیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ طیف اقبال میں ''اقبال اور خودی'' کو موضوع بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

میرے خیال میں اقبال نے صوفیوں کا یہ پہلا تصورِ خودی ان کی کتابوں سے حاصل کیا اور اسی کے زیرِ اثر ابتدا میں اقبال کے بیان کے مطابق تصورِ خودی کا ابتدائی ڈھانچہ تشکیل پایا۔ عام طور پر یہ خیال کیا گیا ہے کہ خودی کی پہلی جھلک، پہلا تخیل مغرب کے تین ماخذوں سے اقبال کو حاصل ہوا۔ ان میں پہلا ماخذ جس کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے، بینٹ تھامس کا ساتھیالوجی ہے اور دوسرا ہیگل کا فلسفۂ جدلیات ہے۔ خودی کے اندر پیکار کی آویزش کا جو تصور پایا جاتا ہے، خیال کیا جاتا ہے کہ زندگی پیکار سے ابھرتی ہے۔ ایک جزو دوسرے جزو سے، ایک ذرّہ دوسرے ذرّہ سے اور ایک مادی ٹکڑا، دوسرے مادی ٹکڑے سے ٹکراتا ہے اور اسی سے زندگی نمو پاتی ہے۔ یہ خیال بھی کیا جاتا ہے کہ اقبال کے ہاں فوق الانسان شخصیت یا مردِ کامل کا جو تصور ہے یہ جرمن فلاسفر نٹشے کے نظریۂ فوق الانسان سے لیا گیا ہے اور نٹشے کو اقبال نے اچھے لفظوں سے یاد کیا ہے۔ نٹشے کا نظریۂ فوق الانسان چونکہ اقبال کے نظریۂ خودی کی ہیئت سے ملتا جلتا ہے اس لیے اقبال کو نٹشے سے متاثر قرار دے دیا گیا، اور بعض نقادوں نے کچھ اور مغربی فلسفیوں کے ساتھ ملتے جلتے خیالات بھی ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کی ہے، مثلاً فلسفہ تغیر اور حرکت کو برگساں (فرنچ فلاسفر) کے فلسفۂ تغیر سے متاثر قرار دیا گیا، کیونکہ برگساں کے ہاں تغیر کا جو نظریہ ہے، اس کی مماثلت اقبال کے خودی اور ارتقا کے نظریے سے پائی جاتی ہے اور بعض لوگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ لائیڈ مارگن جنہوں نے ڈارون کے نظریۂ ارتقا پر مزید کام کیا ہے، اس کے یہاں ارتقائے عقل کی بجائے جذبے کی جبلت قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ اقبال کی خودی میں جذبے کا جو عنصر پایا جاتا ہے وہ لائیڈ مارگن کے زیرِ اثر ہے۔ غرض جہاں تک کسی نے اقبال کے فلسفۂ خودی کی مغرب کے فلسفہ سے مماثلت دیکھی، اقبال کو اس سے متاثر قرار دے دیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقبال کا فلسفۂ خودی ابتدا میں صوفیوں کے خیالات سے ابھرا اور بعدازاں انہوں نے انہی خطوط پر چلتے ہوئے مغرب کے مصنفین کے خیالات سے استفادہ کیا۔

یہ حقیقت ہے کہ اقبال کے ہاں خودی کے تصور کی بنیاد صوفیانہ تفکر ہے۔ اقبال نے خود مغربی مفکرین کے افکار و نظریات سے مستفید ہونے سے انکار کیا ہے۔ پروفیسر نکلسن جنہوں نے **اسرارِ خودی** کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا ان کو لکھتے ہیں:

بعض انگریز تنقید نگاروں نے اس سطحی تشابہ اور تماثل سے جو میرے اور نٹشے کے خیالات میں پایا جاتا

Marfat.com

ہے، دھوکہ کھایا ہے اور غلط راہ پر پڑ گئے ہیں۔ "دی اتھم" والے مضمون میں جو خیالات ظاہر کیے گئے ہیں، وہ بہت حد تک حقائق کی غلط فہمی پر مبنی ہیں لیکن اس غلطی کی ذمہ داری صاحبِ مضمون پر عائد نہیں ہوتی۔ وہ انسان کامل کے متعلق میرے تخیل کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے غلط بحث کر کے میرے انسان کامل اور جرمن مفکر کے فوق الانسان کو ایک ہی چیز فرض کر لیا۔ میں نے آج سے تقریباً بیس سال پہلے انسان کامل کے عقیدے پر قلم اٹھایا تھا، اور یہ وہ زمانہ تھا جب نہ تو نطشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا، نہ اس کی کتابیں میری نظر سے گذری تھیں۔

اس تحریر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال نے نطشے کی قطعاً تقلید نہیں کی، لیکن اس کے باوجود بعض مفکرین اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ اقبال نے برگساں اور نطشے کی بجائے فلشے کے خیالات سے استفادہ کیا ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم جو اقبال کے فلسفۂ خودی کی بنیادیں مغربی مفکرین کے افکار میں تلاش کرتے ہیں، اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

اپنی شاعری کے اس دور میں جب اسرار خودی تصنیف کی گئی، اقبال نطشے سے متاثر تھے۔ علاوہ اس داخلی شہادت کے جو اسرار خودی سے بکثرت اور بوضاحت مل سکتی ہے مجھے اس سلسلہ میں شخصی طور پر کچھ معلومات حاصل ہیں۔ یورپ میں قیام کے دوران اقبال کو اس مومن قلب اور کافر دماغ مجذوب کا فلسفہ بہت دلکش معلوم ہوا۔ نطشے کے افکار میں سے اقبال کو تعمیر خودی، استحکام خودی اور عروجِ آدم کے مضامین پسند آئے لیکن نطشے کے افکار تعمیری سے زیادہ تخریبی ہیں۔ ان میں جلال کا پہلو جمال کے پہلو پر اس قدر غالب ہے کہ ہستی محض ایک میدان کارزار بن کر رہ جاتی ہے۔ اقبال خودی کے ساتھ ایک بے خودی کا فلسفہ بھی رکھتا ہے اور ایک کو دوسرے کے بغیر ناقص سمجھتا ہے۔ نطشے کے یہاں انفرادی خود اختیاری کا اس قدر زور ہے کہ فرد کا رشتہ ملت اور کائنات کے ساتھ بالکل مبہم سا رہ جاتا ہے۔ اس کے یہاں قاہری غالب ہے اور دلبری مغلوب۔ اقبال کے نصب العین میں انسان میں ناز کے ساتھ نیاز بھی ہے۔ دعا کے ساتھ تسلیم و رضا بھی ہے۔ نطشے جمہوریت اور مساوات کا دشمن ہے اور غریبوں اور کمزوروں کے لیے اس کے پاس نفرت کے احساس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اقبال بھی جمہوریت کی موجودہ شکلوں کو دھوکہ سمجھتا ہے لیکن ایک اعلیٰ سطح پر مساوات کا متلاشی ہے۔ اقبال کا کام نوعِ انسانی کو ابھارنا ہے۔ نطشے کی نظر چند کامل افراد پر ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے اس میں قطعی مختلف ہے۔ ان کے مطابق اقبال نے اپنے فلسفۂ خودی کی تشکیل کے وقت اپنے ذہن کے دریچوں کو پوری طرح کھلا رکھا اور مغرب کے تمام مفکرین کے افکار کو غائر نظر اور کھلے ذہن کے ساتھ دیکھا اور ان کا مطالعہ کیا لیکن اپنے فلسفے کی بنیاد خالص قرآنی آیات پر ہی رکھی۔ فلاسفہ کے افکار سے اسی حد تک استفادہ کیا ہے، جس حد تک ان کے فلسفے کی بنیادی ضرورت تھی۔ انہیں جو اچھی بات جہاں سے ملی، حاصل کر لی اور خیال رکھا کہ ان کے فلسفہ کے قرآنی اور اسلامی روح کو کسی طرح ذرہ بھر بھی

Marfat.com

نقصان نہ پہنچے۔

فلسفۂ خودی کے سلسلہ میں کچھ تصورات علامہ اقبال نے مولانا روم کی تعلیمات سے بھی اخذ کیے۔ انہوں نے مولانا روم سے جو باتیں اخذ کی ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

پہلی چیز تو خودی کا تصور ہے، جو اقبال کے فلسفے کی اساس ہے۔ اس تخیل کو مولانا روم سے اخذ کیا ہے۔ اقبال کے مطابق اگر خودی کو کھلا چھوڑ دیا جائے تو وہ ایک شیطانی قوت بن سکتی ہے جس کا کام تخریب اور فساد کے سوا کچھ نہیں۔ اس میں اعتدال پیدا کرنا ضروری ہے۔ یہاں وہ مولانا روم سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں اقبال ایک خط میں لکھتے ہیں:

دینِ اسلام جو ہر مسلمان کے عقیدے کی رو سے ہر شے پر مقدم ہے؛ نفس انسانی اور اس کی مرکزی قوت کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کے لیے حدود معین کرتا ہے۔ ان حدود کے معین کرنے کا نام ''شریعت'' ہے اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے۔ جب احکامِ الٰہی خودی میں سرایت کر جائیں تو بعض نے اس کیفیت کو فنا کہا ہے اور بعض نے اسی کا نام بقا رکھا ہے۔

مولانا روم اور ڈاکٹر اقبال کا دور اس حیثیت سے باہم مشابہہ ہیں کہ دونوں ایک ہی قسم کے فتنہ انگیز زمانے میں موجود تھے اور دونوں نے ایک ہی قسم کی بلند آہنگی کے ساتھ اپنے اپنے زمانے کے عقلی رجحانات کی مخالفت کی اور لوگوں کو عشق و محبت کی طرف مائل کیا۔ اسی بنا پر خودی کی تکمیل کے لیے عشق و محبت کا نظریہ انہوں نے ابتدا میں مولانا روم سے لیا اور آخر تک اسی نظریے پر قائم رہے۔

فلسفۂ خودی میں عشق کا مقام

اقبال کے فلسفۂ خودی میں عشق کا مقام اور تصور نمایاں نظر آتا ہے۔ خودی اور اس کے ارتقا میں جو چیز سب سے زیادہ اہم کردار ادا کرتی ہے وہ یہی تصور ہے۔ اقبال اس جذبے کو کبھی آرزو کے نام سے پکارتے ہیں، کبھی خونِ جگر اور کبھی عشق کے نام سے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اسی جذبے کو خودی کے نام سے پکارتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ خودی کے ارتقا کے سلسلہ میں یہ جذبہ سب سے زیادہ اہم ثابت ہوا ہے اور اسی جذبے کی تحریک سے خودی اپنا اظہار ناقابلِ فراموش کارناموں سے کرتی ہے۔ اقبال فرماتے ہیں:

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دمبدم
آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحرگاہی کا نم

Marfat.com

اور

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

اقبال عشق کی کارفرمائی مختلف مظاہر میں دیکھتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں دنیا کا ہر بڑا کام عشق سے پایۂ تکمیل تک پہنچتا ہے اور اسی سے زندگی میں معانی پیدا ہوتے ہیں اور زندگی بامقصد بنتی ہے۔ حیات سے عشق کہیں زیادہ پہلودار، بلند اور گہرا ہے۔ اس کی وضاحت وہ اس طرح کرتے ہیں:

عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود
عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام

اور

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی

چنانچہ زندگی میں نئی نئی تبدیلیوں کے ساتھ عشق میں بھی نئی نئی جہتیں سامنے آتی ہیں۔ گویا خودی کے عمل کو آگے بڑھانے کا جذبہ اور زندگی کو واضح مقصدیت عشق ہی دیتا ہے اور اقبال کے نزدیک کائنات کی تمام رعنائی اسی کی بدولت ہے:

عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام

خودی کی تربیت اور ارتقا میں عشق کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین اپنے مضمون ''اقبال کا تصورِ خودی'' میں اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

> اس راہ میں ایک رہنما کی ضرورت ہے اور وہ رہنما عشق ہے۔ عاشق اس مردِ کامل کو کہتے ہیں جو معرفتِ نفس کے مدارج سے گذر کر خودی کی معراج پر پہنچ چکا ہو۔ محبت کا دوسرا نام تقلید ہے لیکن یہاں عشق اور تقلید کے معانی یہ نہیں ہیں کہ عاشق اپنے آپ کو معشوق کی ذات میں یا مقلد اپنے آپ کو مرشد کی ذات میں کھو دے۔ اس سے روحانی قوت مستعار لے کر مصنوعی تقویت حاصل کرلے، بلکہ اس کو چاہیے کہ وہ اس برتر شخصیت سے تکمیلِ خودی کا راز سیکھے اور خود اپنی قوتوں کو نشوونما دے کر اپنی شخصیت یا خودی کو استوار کرلے۔

عشق خودی کا رہبر اور رہنما ہے اور اسی کی رہنمائی میں خودی اپنی منزل کا تعین کرتی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ خام کاروں کو عشق خود فراموشی اور ازخود رفتگی سکھاتا ہے مگر پختہ کاروں کو خودداری کا سبق دیتا ہے۔ یہاں آکر خودی اور عشق کا ایسا تعلق پیدا ہوتا ہے کہ پھر ان کو

Marfat.com

ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ خودی اپنے ارتقا اور تکمیل کے لیے عشق کی مرہون منت ہے اور عشق کی انتہا خودی کی تکمیل ہے جہاں پہنچ کر عشق اور خودی دونوں لازوال ہوجاتے ہیں۔ اس لیے اقبال نے دونوں الفاظ کو اس طرح استعمال کیا ہے کہ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی چیز کو وہ کبھی خودی کہتے ہیں اور کبھی اسے عشق کا نام دیتے ہیں۔ ان کے ہاں عشق اور خودی ہم معنی الفاظ بن گئے ہیں:

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود ایک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں، عصر رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں، جن کا نہیں کوئی نام

خودی کے بارے میں یہ شعر بھی قابل غور ہے:

ہو اگر خودنگر و خودگر و خودگیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی نہ مرسکے

حاصل کلام

لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ڈاکٹر صاحب کا فلسفہ کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتا بلکہ انہوں نے دوسروں کی خوشہ چینی کرکے انہی کے فلسفہ کو شاعرانہ آب و رنگ کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کردیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے فلسفۂ خودی کے تمام اساسی مضامین درحقیقت قرآن مجید سے ماخوذ ہیں۔ قرآن مجید میں فضیلتِ انسان، تسخیر فطرت، عزم و استقلال، جرأت و شجاعت، حمیت و غیرت اور قدرت و اختیار پر بکثرت آیات موجود ہیں۔ مثنوی مولانا روم میں ان کو جابجا ایسے اشعار، ایسے خیالات اور ایسے نظریات ملے جو قرآن مجید کی تعلیمات کے موافق اور فلسفۂ خودی کے مؤید ہیں۔ نٹشے کے فلسفۂ خودی کے مؤید ہیں۔ نٹشے کے فلسفہ میں انہیں خودی کے جو شیطانی عناصر نظر آئے، ان کو انہوں نے بالکل چھوڑ دیا۔ البتہ اصل مسئلہ کو لے کر اس شیطانی خودی کو خودی بنا دیا۔ اس میں ان کو قرآن مجید کے بعد مولانا روم کی مثنوی سے مدد ملی۔ لیکن اس معاملے میں انہوں نے درجہ بدرجہ ترقی کی۔ پہلے تو انہوں نے اسرارِ خودی کا ایک سادہ مکمل خاکہ قائم کیا جو زیادہ تر حکمائے یورپ بالخصوص نٹشے کے خیالات و نظریات کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا اور اسی خاکہ کو پیش نظر رکھ کر یوروپین

Marfat.com

تنقید نگاروں نے یہ رائے قائم کرلی کہ ان کا فلسفہ تمام تر نٹشے کے فلسفہ سے ماخوذ ہے، لیکن اس کے بعد انہوں نے اس فلسفے کے اجزا و مقدمات میں جو تصرفات اور اضافے کیے اور اس کو جس شاعرانہ آب و رنگ کے ساتھ پیش کیا اس نے ان کے فلسفے کو نٹشے کے فلسفہ اور مولانا روم کے صوفیانہ نظریوں سے بالکل مختلف کردیا۔ انہوں نے بلاشبہ نٹشے اور اس کے ساتھ بہت سے فلسفیوں کا اثر قبول کیا لیکن اثر پذیری اور نقالی میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ جہاں تک افکار کا تعلق ہے انہوں نے رومی کا کامل تتبع کیا ہے، نہ نٹشے کا، نہ برگساں کا نہ کارل مارکس کا، نہ لینن کا۔ اپنے تصورات کا قالین بنتے ہوئے انہوں نے رنگین دھاگے اور بعض خاکے ان لوگوں سے لیے ہیں لیکن ان کے مکمل قالین کا نقشہ کسی دوسرے نقشہ کی ہو بہو نقل نہیں ہے۔ اپنی تعمیر کے لیے انہوں نے افکار کو سنگ و خشت کی طرح استعمال کیا ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

کتاب محمود

کشف المحجوب سید علی ہجویری

ڈاکٹر عارف نوشاہی ☆

آج ہم سب، بالخصوص اہل لاہور کے لیے یہ موقع بے حد مسرت اور ایک گونہ اعزاز کا ہے کہ ایرانی فضلا کے ایک وفد کے میزبان ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی میں دوسرے ممالک سے آنے والے علمی وفود کا حال تو مجھے معلوم نہیں ہے، لیکن ایران سے خالص علمی اور تحقیقی مزاج رکھنے والے فضلا کی آمد یہاں کم کم ہی ہوتی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ پنجاب یونیورسٹی سعید نفیسی، بدیع الزمان فروز انفر، علی اصغر حکمت اور محمد حسین مشائخ فریدنی جیسے اکابر ایرانی دانش وروں کی میزبان رہی ہے، بلکہ محمد حسین مشائخ فریدنی کو تو پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی سند بھی دی گئی۔ اب یہ سب لوگ مرحوم ہو چکے ہیں۔ ان کے بعد کی ایرانی فضلا کی نسل جن کے علم و فضل کی شہرت اطراف و اکناف عالم میں پھیلی ہوئی ہے اور ہمارے ہاں بھی فارسی ادب، تصوف اور ایرانیات پر جو کام ہوتا ہے، اس سے ان فضلا کی تحقیقات سے برابر استفادہ کیا جاتا ہے۔ ہم انہیں بھی اپنے درمیان دیکھنے کے آرزومند ہیں، جیسے استاد ایرج افشار جو اپنی تحریروں میں پاکستانی فضلا ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، پیر حسام الدین راشدی، سید وزیر الحسن عابدی (مرحومین) کا ذکر ہمیشہ احترام اور تحسین آمیز کلمات سے کرتے ہیں یا ڈاکٹر محمد رضا شفیعی کدکنی جو نہ صرف فارسی ادب اور تصوف پر اپنی عالمانہ تحقیقات کے باعث، بلکہ اپنی بیدل شناسی اور شاعرانہ حیثیت سے بھی یہاں کے اساتذہ اور طلبہ میں یکساں مقبول ہیں۔ اور ینٹل کالج کے شعبۂ اردو کا رسالہ بازیافت ان کے بارے میں مسلسل مقالات شائع کر کے بتا رہا ہے کہ ڈاکٹر شفیعی کی مقبولیت صرف فارسی حلقے تک ہی محدود نہیں ہے۔

ہماری خوش قسمتی ہے کہ ایران کی موجودہ اور نسبتاً جوان نسل کی نمائندگی کرتے ہوئے

☆ ادارۂ معارف نوشاہیہ، ماڈل ٹاؤن ہمک، اسلام آباد

Marfat.com

اہل علم و دانش کے ایک وفد نے سفر پاکستان کی زحمت گوارا کی اور بجا طور پر اپنا پہلا پڑاؤ لاہور میں ڈالا۔ لاہور پاکستان کا علمی اور تہذیبی مرکز تو ہے ہی، یہ جنوبی ایشیا میں بھی فارسی زبان و ادب کا فعال ترین مرکز ہے، بلکہ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ فارسی تہذیب کے حوالے سے ایشیا کے قدیم کلاسیک علمی مراکز بخارا، سمرقند، بلخ، ملتان میں سے اب لاہور ہی ایک ایسا مقام ہے جہاں فارسی زبان و ادب کے چرچے مختلف ذریعوں سے ہوتے رہتے ہیں۔ چاہے فارسی کتب کی تصنیف، تدوین اور اشاعت کی صورت میں، خواہ فارسی شاعری کی صورت میں، خواہ درس و تدریس کی صورت میں، خواہ سماع کی صورت میں، غرض یہ کہ لاہور کی فضا فارسی سے ہم آہنگ ہے؛ اور کیوں نہ ہو؟ یہ شہر سید ہجویر مخدوم امم سید علی بن عثمان سے نسبت رکھتا ہے۔ وہ اس شہر کی آغوش میں آرام فرما ہیں اور ہم سب ان کے دامنِ برکات تلے آسودہ ہیں۔

سید ہجویر کی کشش ان عزیز مہمانوں کو لاہور تک لائی ہے۔ مہمانوں کی اس کہکشاں میں ایک ستارہ ایسا ہے جو تصوف اور حضرت ہجویری سے خاص نسبت رکھنے کے باعث ہمارے لیے عزیز تر ہو جاتا ہے۔ یہ پروفیسر ڈاکٹر محمود عابدی ہیں جو تہران کی دانشگاہ تربیت معلم (ٹیچر ٹریننگ یونیورسٹی) کے شعبۂ ادبیات سے وابستہ ہیں اور نہایت خاموشی اور متانت کے ساتھ جو اصیل فضلا کا خاصہ ہے، کام کرتے چلے آرہے ہیں۔ ۱۹۹۱ء میں جب تہران میں ان کے اہتمام سے مولانا عبدالرحمان جامی کی **نفحات الانس** چھپ کر سامنے آئی تو ڈاکٹر عابدی نے سب کی توجہ اپنی جانب کروالی۔ یہ ایڈیشن نہ صرف **نفحات الانس** کے مصنف کے معاصر اور قدیم ترین قلمی نسخوں پر مبنی ہونے بلکہ اپنے شاندار مقدمے اور جاندار حواشی و تعلیقات کے باعث نفحات الانس کے سابقہ تمام مغلوط ایڈیشنوں کے لیے ''نسخۂ ناسخ'' ثابت ہوا۔ یہ کتاب ایران میں تحقیق و تدوین کے اعتبار سے اس سال کی بہترین کتاب اور انعام کی حقدار قرار پائی۔

۱۹۹۷ء میں ڈاکٹر عابدی کی ایک مختصر کتاب **درویشِ گنج بخش** شائع ہوئی (انتشارات سخن، تہران) جو حضرت داتا گنج بخش کے مختصر سوانح حیات اور **کشف المحجوب** کے انتخاب پر مبنی تھی۔ یہ کتاب دراصل ان کے مستقبل قریب میں ایک دوسرے بڑے کام کی آمد کی خوش خبری لیے ہوئے تھی۔ یہ بڑا کام حضرت داتا گنج بخش کی تصنیف **کشف المحجوب** کی تصحیح و تدوین تھا جو بحمد اللہ ابھی چند ماہ پہلے ۲۰۰۴ء کے اواخر میں ایران ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذیلی اشاعتی ادارے سروش نے پوری آب و تاب کے ساتھ شائع کردی ہے۔ یہ ایڈیشن ۱۲۳۱ صفحات کی ایک ضخیم جلد پر مشتمل ہے، جن کی تقسیم کچھ اس طرح ہے:

Marfat.com

۲۷ صفحات مقدمہ؛ ۶۱۰ صفحات کشف المحجوب کا متن، ۳۳۲ صفحات تعلیقات اور توضیحات ، ۲۰۸ صفحات اشاریے اور آخری ۱۴ صفحات مقدمہ اور تعلیقات کے مآخذ کی فہرست۔ اس ایڈیشن کا آدھا حصہ متن پر مشتمل ہے اور آدھا حصہ اس کام پر جو مرتب نے اضافہ کیا ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ڈاکٹر عابدی نے اس عزیز الوجود کتاب پر کیا کاوش اور محنت کی ہے۔کشف المحجوب کے اس ایڈیشن کو ہم بجا طور پر کتاب محمود کہہ سکتے ہیں۔

کشف المحجوب کی طباعت و اشاعت کے سلسلے میں لاہور کو ایک ایسا امتیاز حاصل ہے جو برصغیر کے کسی اور شہر کو حاصل نہیں۔ کشف المحجوب کی اولین طباعت ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۷ء میں لاہور ہی میں ہوئی۔ اس کے بعد کشف المحجوب کے مزید دس ایڈیشن نکلے جو تمام کے تمام لاہور سے ہیں۔ حیرت انگیز طور پر برصغیر کے کسی اور شہر سے کبھی کشف المحجوب نہیں چھپی یا کم از کم میرے علم میں نہیں ہے۔ ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۲ء میں سمرقند سے کشف المحجوب کا ایک سنگی چھاپہ نکلا۔ لیکن سنجیدہ علمی حلقوں میں جس اشاعت کی پذیرائی ہوئی وہ روسی محقق والنتین ژوکوفسکی (متوفی ۱۹۱۸ء) کا مرتبہ ہے جو پہلی بار ۱۹۲۶ء میں لینن گراڈ سے شائع ہوا اور بعد میں تہران سے اس کا عکس چھپا۔ اب تک تحقیقی حوالوں میں ژوکوفسکی کا ایڈیشن ہی استعمال ہوتا رہا ہے۔

ڈاکٹر عابدی نے کشف المحجوب کی تدوین میں اُسی نسخے کو بنیاد بنایا ہے جسے ژوکوفسکی نے بنیاد بنایا تھا، یعنی آسٹریا کے شاہی کتب خانہ، ویانا کا مخطوطہ ۳۳۴ جس پر تاریخ کتابت تو درج نہیں لیکن قرائن سے اسے آٹھویں صدی ہجری کا کتابت شدہ بتایا گیا ہے اور کشف المحجوب کا یہی مخطوطہ اب تک دستیاب نسخوں میں سے قدیم ترین ہے۔ ژوکوفسکی نے ویانا کا نسخہ استعمال کرتے ہوئے یہ بے احتیاطی کی کہ اس نسخے کے حاشیے پر کسی شخص نے کشف المحجوب کے جدید نسخوں سے مقابلہ کر کے جو اختلافات لکھے تھے انہیں اپنے مرتبہ متن میں داخل کر دیے۔ ڈاکٹر عابدی کی رائے ہے کہ ژوکوفسکی سے متن پڑھنے میں بھی متعدد غلطیاں ہوئی ہیں اور ان کا مرتبہ متن، ویانا کے اصل نسخے کے مطابق نہیں ہے۔ ڈاکٹر عابدی نے اس کے علاوہ پانچ اور نسخے بھی استعمال کیے ہیں جن میں سے ایک نسخہ پاکستان (گنج بخش لائبریری، اسلام آباد) کا بھی ہے۔ ڈاکٹر عابدی نے بوقتِ ضرورت لینن گراڈ اور تاشکند کے تین اور قلمی نسخوں سے بھی رجوع کیا ہے۔ اس طرح کل نو نسخے ڈاکٹر صاحب کے زیر استعمال تھے جن کی مدد سے کشف المحجوب کا ایک ایسا متن ہمارے سامنے آگیا ہے جس کی صحت پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

Marfat.com

ڈاکٹر عابدی نے حضرت ہجویری اور کشف المحجوب کے بارے میں جو عالمانہ مقدمہ لکھا ہے، اس میں بعض جملے تو ایسے ہیں جو دل سے نکلے ہیں اور دل میں اترتے ہیں۔ میں چند مثالیں پیش کرتا ہوں (اردو ترجمہ)

ا۔ تاریخ نے حضرت داتا گنج بخش کے حالات لکھنے کے سلسلے میں جو کوتاہی کی ہے، اس کی تلافی ایک حد تک ان کی تربت پاک کررہی ہے، جو سالہا سال سے عقیدت مندوں کی زیارت گاہ ہے۔ (صفحہ بارہ)

۲۔ وہ لوگ جو گزرے زمانوں سے حضرت ہجویری کی تربت پاک کی پوری عقیدت کے ساتھ زیارت کرتے چلے آرہے ہیں، بلاشبہ اس کا محرک حضرت ہجویری سے منسوب فضیلتیں ہیں۔ اور بیشک یہ فضائل اس کے علاوہ ہیں جو حضرت ہجویری کے بارے میں کشف المحجوب سے اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ حضرت کے بارے میں کشف المحجوب کے مبارک اوراق سے جو کچھ اخذ ہوتا ہے اور جو کچھ ان کے عقیدت مندوں کے حلقے میں ہمیشہ سے ظاہر ہوتا چلا آرہا ہے، شاید اس کتاب کا قاری ان دونوں کے درمیان کوئی مخلصانہ تعلق ڈھونڈ نکالے۔ (صفحات: سولہ، سترہ)

(۳) حضرت ہجویری کی قشیری سے ملاقات کو بلاشبہ ہجویری کی کامیابیوں میں شمار کرنا چاہیے اور حضرت ہجویری نے قشیری کے حال اور قال کے بارے میں جو منصفانہ بات کہی ہے وہ ہجویری کی بہت بڑی ''خوش وقتی'' ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ قشیری اپنے وقت میں کئی علوم و معارف میں ممتاز اور بجا طور پر ''استادِ امام'' اور ''زین اسلام'' تھے اور آج تک اپنے دور کے نابغہ سمجھے جاتے ہیں، لیکن ہماری تاریخ میں کسی ایسے معاصر مصنف کا بہت کم سراغ ملتا ہے جس نے اپنے کسی ہم عصر کے بارے میں وہ بات کہی ہو جو ہجویری نے قشیری کے بارے میں کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''خداوند تعالیٰ نے قشیری کے حال اور زبان (قال) کو حشو سے محفوظ رکھا ہے۔'' حضرت ہجویری کی اس انصاف پسندی کو یقیناً ان کی ''خوش وقتی'' سمجھنا چاہیے۔ (صفحہ بائیس)

(۴) حضرت ہجویری نے کشف المحجوب ۴۶۵ھ سے پہلے شروع کی اور ۴۶۹ھ کے بعد ختم کی اور ان کا وصال کس سال میں ہوا؟ کشف المحجوب کے ذریعے وہ ہمیشہ زندہ ہیں اور عقیدت مندوں کے دلوں میں ان کی نیک یاد موجود ہے۔ ہمیں یہ دونوں چیزیں اس سے بے نیاز کردیتی ہیں کہ ہم حضرت کے وصال کا سال ضرور متعین کریں۔ (صفحہ اکتالیس)

یاد رہے کہ ڈاکٹر محمود عابدی نے یہ سب باتیں اس عالم میں لکھی ہیں کہ انہوں نے ابھی تک اپنی آنکھوں سے بارگاہ ہجویری اور وہاں نچھاور ہونے والی عقیدت کے انداز کا مشاہدہ نہیں کیا تھا اور وہ اپنے اس سفر میں پہلی بار آستانہ ہجویری پر جائیں گے۔ یقیناً لاہور سے

Marfat.com

ہزاروں میل دور چشمِ تصور سے آستانہ ہجویری کا مشاہدہ، چشمِ حال کے مشاہدے سے ایک دوسرا ہی تجربہ ہوگا۔

آخر میں ایک بات جس کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ ڈاکٹر عابدی صاحب نے تو اپنا فریضہ انجام دے دیا۔ دس سال کشف المحجوب کی تدوین و تصحیح میں صرف کرکے اب یہ علمی سوغات یا یوں کہیے کہ حضرت داتا گنج بخش کی "نذر" لے کر خود ہمارے پاس آئے ہیں۔ کیا اب ہم پر یہ واجب نہیں کہ ڈاکٹر عابدی کی اس تحقیق کو اردو میں منتقل کرکے اسے جنوبی ایشیا میں عام کیا جائے جہاں حضرت داتا گنج بخش کے عقیدت مندوں کی کثیر تعداد بستی ہے؟ اب تک کشف المحجوب کے کئی اردو، عربی اور انگریزی تراجم ہو چکے ہیں لیکن ظاہر ہے سب کی بنیاد ایسے ایڈیشنوں پر تھی جن کی صحت مشکوک ہے اور ان کے ذریعے جو کچھ پیش کیا گیا وہ بھی قابل رشک نہیں۔ اب جب کہ ایک مستند متن ہمارے سامنے ہے تو اس کی بنیاد پر ایک صحیح اردو ترجمہ یقیناً آنے والی نسلوں کو — جو فارسی سے ہم سے زیادہ بیگانہ ہوں گی — ہجویری شناسی اور تصوف کی حقیقت کو سمجھنے میں مدد دے گا۔ مگر یہ کام کون انجام دے؟ یقیناً پنجاب یونیورسٹی کی مسند ہجویری ہی اس علمی منصوبے کی سرپرستی کرسکتی ہے۔(۲۵ فروری ۲۰۰۵ء کو سینٹ ہال، پنجاب یونیورسٹی، لاہور میں ایرانی وفد کے اعزاز میں منعقدہ تقریب میں پڑھا گیا۔)

☆☆☆

Marfat.com

دیوان امام خمینیؒ... صحیفۂ عرفان

جاوید اقبال قزلباش☆

از غم دوست در این میکده فریاد کشم
داد رس نیست که در ہجر رخش داد کشم
سالہا می گذرد حادثہ ہائی آید
انتظار فرج از نیمہ خرداد کشم!(۱)

شعر حال دل ہے انسانی جذبات، احساسات و ہیجانات کے پرتلاطم سمندر کا سینہ، قرطاس پر منتقل ہو کر صدیوں کی تاریخ، ثقافت اور تمدن کو چند سطروں میں سمو دینے کا نام، گویا یہ بشری احساسات کا عصارہ اور اس کا تقطیری عمل ہے۔ یہ دیومالائی داستانوں، جنگوں، عشقیہ داستانوں، انقلابات تاریخ انسانی، انسان کے الٰہی رشتوں پر مشتمل ایک ایسی دنیا ہے جہاں عشق کے چمن زاروں میں بلبلوں کی دلنواز اور مسحورکن شیرین نغمے ہیں۔ شعر جب الٰہی اقدار کا حامل بن جائے تو وہ انسان کو روح القدس کے پروں پر پرواز کراتا ہوا ملکوتی دنیاؤں کی سیر کرادیتا ہے۔ غرض یہ انسان کے نازک ترین جذبات کا ایک ایسا آبگینہ ہے جس کے بلوریں حسن اور ماہتابی چہرے کی ضیا سے انسان کی روح اپنی تمام تر گہرائیوں سے متاثر ہوجاتی ہے۔ دنیا کی تمام اقوام اور تمام زبانوں میں اس کا پیکر اپنے تمام تر حسن اور رعنائیوں کے ساتھ جلوہ فگن رہا ہے۔ شعر شاعر کی شخصیت، عمق اور وسعت کے اندازے کا بیان بھی ہے جتنی شخصیت عمیق اور وقیع ہوگی شعر کی سبک پروازی اتنی ہی بڑھ جائے گی، یہاں تک کہ بات امام خمینی جیسی عظیم شخصیت تک پہنچ جائے۔ امام خمینی کی آفاقیت ان کے جامع صفات انسانی شخصیت سے ہے۔ وہ بیک وقت صاحب علم و عمل فقیہ، بیدار مغز سیاست دان، سلحشور مبارز و مجاہد، فلسفی و عارف، مصنف، شاعر اور محبتوں اور فیوض کا سرچشمہ بلکہ عین الحیات تھے۔ ان کی

☆ مدیر معاون پیغام آشنا

Marfat.com

ہمہ گیر شخصیت کا بنیادی پہلو ان کا خدا سے عشق اور اس کی ذات اقدس پر محکم ایمان تھا اور انبیاء، ائمہ اور اولیا کے جانشین اور وارث کے طور پر وہ ان ہی کی طرح مظہر صفات الٰہیہ تھے۔ غرض وہ عشق الٰہی کی ایک ایسی جلوہ گاہ پر فروکش تھے کہ جہاں انوار الٰہیہ کی شعاعوں کی تابش سے وہ غرق نور رہے وہیں ان کے اور خداوند تعالیٰ کے درمیان ایسے حالات اور مقامات تھے جن کا بیان نثری زبان میں ممکن نہیں۔

ملا صدرا کے اسفار اربعہ کو اگر مدنظر رکھا جائے تو وہ ''من الخلق الی الخلق مع الحق'' کی منزل پر تھے جو سفر انبیا و ائمہ کا آخری اور ادق سفر ہوتا ہے۔ مخلوق کی راہنمائی اور پیشوائی وہ مشکل ترین الٰہی منصب ہے جس کے لیے انبیا اور ائمہ نے بھی خدا سے لحظہ بہ لحظہ مدد طلب کی تھی۔ اس مرحلے کی آزمائشوں، مشکلات اور مشغولیات سے بھی اگر عرفان الٰہی کا آفتاب گہنا نہ سکے تو اس کی شعاعیں سارے عالم کو اسی طرح احاطہ کرلیتی ہیں جیسے امام نے عشق الٰہی کی ضو سے کائنات کو منور کردیا تھا۔ چنانچہ مخلوق کی مصروفیات سے فرصت پا کر وہ اپنی شبوں کو مناجات و شعر و عشق کی خوشبوؤں سے معطر و منور کرلیتے تھے اور یہ سلسلہ مدام العمر جاری رہا۔ انسان کے الٰہی رشتوں کی حساسیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ امام رات کی تنہائیوں میں جب کائنات کی ہر ذی روح شے آرام کررہی ہوتی عبادت و نیایش اور مناجات کے ساتھ ساتھ گریہ میں غرق رہتے اور اس حد تک گریہ فرماتے کہ رومال کے بجائے ان کے پاس تولیہ رکھ دیا جاتا تھا مگر وہ بھی بھیگ جاتا تھا، وہ بھی کافی نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ عرفان الٰہی کے بحر نور میں غرق ایسی شخصیت کے کلام پر بحث کوئی آسان بات نہیں۔ درحقیقت آپ کی شخصیت امانت کے ایسے عظیم بار کی حامل تھی جس کو اٹھانے سے بفرمان قرآن آسمانوں اور پہاڑوں نے عذرخواہی کی تھی:

کشتم بار امانت با دلی زار　　امانت دار اسرارم تو باشی(۲)

ایسے میں دردِ عرفان و جدائی محبوب جب وہ کسی طور سے قابل برداشت نہ رہتا تو وہ اُسے صفحہ قرطاس پر اشعار کی صورت میں منتقل کردیتے۔ یہی عرفانی اشعار، یعنی درد و غم کے مرثیے اور جدائی محبوب حقیقی کے نوحے جن کا زیادہ تر حصہ مصائب، ابتلاؤں اور سیاست کی کٹھناؤں، زندانوں، ساواک کے حملوں اور تبعیدی سفروں کے دوران ضائع ہوگیا تھا ان میں سے جو کچھ باقی بچ رہا اسے ان کی رحلت کے بعد اب دیوان کی صورت میں شائع کردیا گیا ہے۔ یہ دیوان ان کی زندگی کا ایک ایسا سربستہ راز ہے جو ان کی مبارک زندگی کے بعد سامنے آیا ہے۔ گویا یہ ان کے شبوں کی ریاضت اور عشق الٰہی کا وہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے

Marfat.com

جو انسان کو اپنے اندر محو اور مستغرق کردیتا ہے۔

امام خمینی کے عرفانی کلام کا مطالعہ کیا جائے تو ہر اعتبار سے وہ اپنے دور کے فرید الدین عطار، رومی اور حافظ نظر آتے ہیں۔ اس تحریر میں ہم ان کے عرفانی اشعار کا تیمناً مذکورہ عرفا کے کلاموں سے ایک تقابلی جائزہ پیش کرتے ہیں تاکہ ان کے صحیفۂ عرفان کی الہی ماہیت کا کچھ اندازہ کیا جاسکے۔

معروف عارف فرید الدین عطار جن کو مولانا روم نے ہفت اقلیم عشق کا راہرو قرار دیا تھا، کا شعر ہے:

دلی کز عشق او بیمار باشد
دوای درد او دیدار باشد(۳)

امام نے فرمایا:

من بہ خال لبت ای دوست گرفتار شدم
چشم بیمار ترا دیدم و بیمار شدم(۴)

عطار نے عشق کو بیماری اور اس کی دوا دیدار محبوب کو قرار دیا، جبکہ امام خود محبوب کی نگاہ عشق کی دلنوازی کو بیماری عشق میں اپنے مبتلا ہونے کا سبب بتاتے ہیں۔ اسی طرح عطار ایک اور مقام پر گویا ہیں:

درد دل را دوا نمی دانم گم شدم سر ز پا نمی دانم(۵)

امام نے فرمایا:

درد خواہم دوا نمی خواہم غصہ خواہم نوا نمی خواہم(۶)

گویا امام خمینی درد کے طالب ہیں اور دوا ان کو مطلوب ہی نہیں۔ محبوب حقیقی کا ایسا عشق انسان کو دنگ کردیتا ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں:

آن یوسف خوش عذار آمد وان عیسی روزگار آمد(۷)

امام نے فرمایا:

کوتاہ سخن کہ یار آمد با گیسوی مشکبار آمد(۸)

ایسی کوتاہ اور خوبصورت مختصر بحر میں اقلیم سخن کے شہنشاہ سخن کو کوتاہ کرکے مشکبار گیسوئے محبوب کی لطافتوں میں کھو جاتے ہیں؛ محبوب کی زلفوں کی خوشبو ان کے مشام جان کو معطر کرکے اپنے سحر میں جذب کرلیتی ہے۔ کوئے دوست کی خاک پر بیٹھے سعدی کا کہنا ہے:

Marfat.com

شادی بہ روزگار گدایان کوی دوست　　　بر خاک رہ نشست بہ امید روی دوست(۹)

جستجو وفراق محبوب میں مبتلا امام حسرت دیدار کوئے دوست میں کہتے ہیں کہ:

عمری گذشت راہ نبردم بہ کوی دوست　　　مجلس تمام گشت و ندیدیم روی دوست(۱۰)

اسی طرح سعدی لذت وصال کی منزل کی خبر دیتے ہوئے کہتے ہیں:

یک امشبی کہ در آغوش شاہد شکرم　　　گرم چو عود بر آتش نہند غم نخورم(۱۱)

اسی سے ملتا جلتا امام کا جذب وشوق ملاحظہ ہو:

یک امشبی کہ در آغوش ماہ تابانم　　　ز ہرچہ در دو جہان ہست روی گردانم(۱۲)

آپ محبوب کے وصال کو دونوں جہانوں کی تمام نعمتوں سے منہ موڑنے کے لیے کافی سمجھتے ہیں۔ آپ اپنے کلام معجز بیان میں جابجا لسان الغیب یعنی حافظ شیراز کی آسمانی اسرار سے بھرپور غزلوں کی طرف ملتفت رہتے ہیں اور تمام شہرہ آفاق عرفا وشعرا کی مانند مختلف عرفانی اصطلاحات مثلاً رند، شراب، لب، زلف، خال، میکدہ، سبو، ابرو، می، دوست کا فراوان استعمال کرتے ہیں۔ ایک مقام پر حافظ کہتے ہیں:

یاد باد آنکہ سرکوی تو ام منزل بود　　　دیدہ را روشنی از خاک درت حاصل بود(۱۳)

جبکہ امام نے اسی تمنا کا اظہار اس پیرائے میں کیا:

کاش روزی بہ سر کوی توام منزل بود　　　کہ در آن شادی و اندوہ مرادِ دل بود(۱۴)

اشعار کے ان چند نمونوں کا جائزہ لینے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے کہ امام خمینی متقدمین کے آثار کا تتبع فرماتے ہوں بلکہ ایک مجذوب وغرق عشق الٰہی شخصیت کے طور پر وہ ماضی کے دوسرے عشاق سے ایک نوع اثر قبول کرتے ہیں، بالکل جیسے ایک ہی منزل کے دو مسافر احساس قربت وتعلق کرکے ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں۔ آپ راہ عرفان کے وہ سالک تھے جو دنیوی تعلقات، انسانی روابط اور دیگر مشغولیات حتیٰ کہ کوچۂ علم کے پیچ وخم اور اس کی اصطلاحاتی دنیا کو راہ عرفان کا حجاب سمجھتے تھے۔ چنانچہ اپنی بہو فاطمہ طباطبائی کے نام ایک عرفانی خط میں یوں لکھتے ہیں:

جوانی میں زرق و برق علمی مفاہیم و اصطلاحات کی تحصیل میں سرگرم رہا۔ ان سے نہ تو کوئی نتیجہ حاصل ہوا اور نہ ہی حال۔ ملا صدرا کی طویل و عریض ''اسفار اربعہ'' نے مجھے محبوب کی جانب پرواز سے روکا۔ محی الدین عربی کی ''فتوحات'' سے کوئی فتح حاصل ہوئی نہ ''فصوص الحکم'' سے حکمت ہی ہاتھ آئی۔ باقی علوم کا تو ذکر ہی کیا! چنانچہ فرماتے ہیں:

از ''فتوحات'' نشد فتحی و از ''مصباح'' نوری　　　ہرچہ خواہم در درون جامہ آن دلفریب است(۱۵)

Marfat.com

ایک اور مقام پر فلسفہ اور عرفان کے تمام مفروضوں، منزلوں اور مقامات سے روگرانی کا عندیہ ملاحظہ ہو:

بشکنیم آینۂ فلسفہ و عرفان را		از صنم خانۂ این قافلہ بیگانہ شویم
فارغ از خانقہ و مدرسہ و دیر شدہ		پشت پایی زدہ بر ہستی و فرزانہ شویم(۱۶)

آپ خانقاہ و دیر و مدرسہ میں محبوب کو تلاش نہیں کرتے بلکہ اس تلاش میں بالآخر ہستی کی تمام نعمتوں کو مسترد کردینے کو ہی عقلمندی کی دلیل سمجھتے ہیں، کیونکہ بقول ان کے عاشق دل باختہ کے لیے ان سب میں بہ جز حرف دلخراش کے ہوتا ہی کیا ہے؟

از قیل و قال و مدرسہ ام حاصلی نشد		جز حرف دلخراش پس از آن ہمہ خروش(۱۷)

آپ اپنی بہو فاطمہ طباطبائی کو اور بالواسطہ طور پر تمام نوجوانوں کو وصیت کرتے ہیں:

آپ اور تمام موجودات اسی ذات کا جلوہ اور ظہور ہیں۔ کوشش اور ریاضت و مجاہدہ کریں تاکہ اس میں سے ایک چنگاری آپ کو بھی میسر آجائے اور اس میں اس طرح محو ہوسکیں کہ نیستی سے ہستی مطلق کی منزل کو پہنچ جائیں۔

اسی نامے میں ایک مقام پر آپ اپنی بہو کو ہدایت فرماتے ہیں:

حضرت حق کی اپنے خاص بندے سے سرگوشی اس وقت تک صورت پذیر نہیں ہوسکتی جب تک کہ بندہ کا جبل ہستی ایک صاعقے کوند اور دھماکے سے ریزہ ریزہ نہ ہوجائے (کوہ طور کی طرح) ''رزقنا اللہ و ایاک'' خدا ہمیں اور آپ کو اس منزل عشق صادق پر فائز ہوجانا عطا فرمائے۔

آپ جلوۂ دوست کے دیدار کی منزل تک پہنچنے کی سعادت کو حضرت ابراہیمؑ جیسی شخصیات کا حصہ سمجھتے ہوئے اپنے دیوان میں حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے جلوہ دوست کے مشاہدے کے راز کو ان کے اس بیان یعنی ''انی لا احب الافلین'' یعنی میں غروب ہوجانے والوں سے محبت نہیں کرتا، میں مضمر سمجھتے ہوئے کہتے ہیں:

زد خلیل عالم چون شمس و قمر را بہ کنار		جلوہ دوست نباشد چو من و آفل من(۱۸)

راہ عشق پر سفر کے لیے آپ کی ایک اور ہدایت ملاحظہ ہو:

با قلندر منشین گر کہ نشستی ہرگز		حکمت و فلسفہ و آیہ و اخبار مخواہ
مستم از بادۂ عشق تو و از مست چنین		پند مردان جہان دیدہ و ہشیار مخواہ(۱۹)

ایک اور مقام پر آپ خود محبوب حقیقی کو اپنا محرم راز قرار دیتے ہوئے اس سے یوں مخاطب ہیں:

محرمی نیست کہ مرہم بنہد بر دل من		جز تو ای دوست کہ خود محرم اسرار منی(۲۰)

Marfat.com

آپ عشق کی آخری منزل پالینے کے لیے جان سے گذر جانے تک کو تیار ہیں:

باید از آفاق و انفس بگذری تا جان شوی و آنکه از جان بگذری تا درخور جانان شوی(۲۱)

یعنی پہلے تو منزل حیات کو حاصل کرلینے کے لیے آفاق اور انفس کی منزلوں سے توجہ ہٹانے کی ضرورت ہے اور جب یہ مطلوبہ جان حاصل ہوجائے تو اسے محبوب پر فدا کردینے سے اس کی توجہ حاصل ہوجاتی ہے۔ تقریباً اسی مضمون کو غالب نے یوں باندھا ہے:

جان تم پر نثار کرتا ہوں میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

امام خمینی راہ عشق میں منصور کی طرح دار کو قبول کرنا اپنے لیے افتخار سمجھتے ہیں، لیکن اس منزل کا پہلا مرحلہ اپنی ذات کی نفی کو قرار دیتے ہیں:

فارغ از خود شدم و کوس انا الحق بزدم
مثل منصور سر دار خریدار شدم(۲۲)

خلاصۂ بیان یہ کہ امام خمینی کی عرفانی شخصیت عشق محبوب حقیقی و ازلی میں ڈوب ہوچکی تھی۔ وہ جمال الٰہی کے مشاہدے میں اس حد تک مستغرق تھے کہ تمام دنیاوی علایق اور پیوند ان کے لیے بے معنی ہوچکے تھے۔ وہ ساری کائنات کو جلوہ گاہ دوست اور دریائے جمال الٰہی تصور کرکے ساری مخلوقات کو اس دریا ہی کی امواج سمجھتے تھے اور ملحدین و منکرین الٰہی کے وجود الٰہی سے انکار پر تعجب کرتے ہوئے فرماتے کہ کیا یہ عجیب نہیں کہ امواج تو موجود ہوں مگر خود دریا کا وجود نہ ہو؟

ما ہمہ موج و تو دریای جمالی، ای دوست
موج دریاست، عجب آنکہ نباشد دریا!(۲۳)

۱۴ خرداد کو یہ موج دریائے عرفان سمندر عشق الٰہی میں ضم ہوکہ سمندر بن گئی۔ آج جب وہ ہم میں نہیں تو ان کا دیوان یعنی صحیفۂ عرفان عشاق کے دلوں کو گرماتا اور منور کرتا ہے۔ گویا آج بھی عشاق کو محبوب کی جانب بلاتے ہوئے فرماتے ہوں کہ:

این شیفتگان کہ در صراطند ہمہ
جویندۂ چشمۂ حیاتند ہمہ

حق می طلبند و خود ندانند آن را
در آب بہ دنبال فراتند ہمہ(۲۴)

Marfat.com

منابع

۱۔ دیوان امام، موسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، تہران، ۱۳۷۳ شمسی، ص ۱۵۴
۲۔ ایضاً، ص ۱۸۱
۳۔ دیوان عطار، بہ اہتمام وتصحیح تقی تفضلی، مرکز انتشارات علمی و فرہنگی، تہران، ۱۳۶۲ شمسی، ص ۲۱۱
۴۔ دیوان امام، ص ۱۴۲
۵۔ دیوان عطار، ص ۴۵۱
۶۔ دیوان امام، ص ۱۶۰
۷۔ دیباچہ دیوان امام، ص ۲۷
۸۔ دیوان امام، ص ۲۷
۹۔ غزلیات سعدی بتصحیح حبیب یغمائی، موسسۂ مطالعات وتحقیقات فرہنگی، تہران، ۱۳۶۱ شمسی، ص ۴۰۳
۱۰۔ دیوان امام، ص ۴۸
۱۱۔ دیباچہ دیوان امام، ص ۲۷
۱۲۔ دیوان امام، ص ۲۷
۱۳۔ دیوان حافظ، انتشارات خوارزمی، تہران، ۱۳۵۹ شمسی، ص ۴۴۲
۱۴۔ دیوان امام، ص ۱۰۴
۱۵۔ ایضاً، ص ۵۱
۱۶۔ ایضاً، ص ۱۷۰
۱۷۔ ایضاً، ص ۱۳۱
۱۸۔ ایضاً، ص ۱۷۴
۱۹۔ ایضاً، ص ۱۷۷
۲۰۔ ایضاً، ص ۱۸۴
۲۱۔ ایضاً، ص ۱۸۵
۲۲۔ ایضاً، ص ۱۴۲
۲۳۔ ایضاً، ص ۴۳
۲۴۔ رہ عشق، نامہ عرفانی حضرت امام، موسسۂ تنظیم نشر وآثار امام، ۱۳۶۸ شمسی، ص ۳۲

☆☆☆

Marfat.com

اردو ہے جس کا نام

ایک تاثر

رابعہ سرفراز☆

سید روح الامین کی مرتب کردہ کتاب اردو ہے جس کا نام اردو زبان و ادب کی ابتدا و ارتقا اور پاکستانی ثقافت کے ارتقائی سفر میں اردو کی حیثیت اور کردار کے مختلف پہلوؤں کے بیان کے حوالے سے ایک اہم کتاب ہے۔ کتاب میں مختلف موضوعات پر سولہ مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ اردو ہے جس کا نام سے شناسائی اور تعارف کے لیے ان مضامین کی فہرست پر ایک نظر ڈالیے:

۱۔ کس شان کی زبان ہے (مولوی عبدالحق)
۲۔ اردو رسم الخط کی عظمت (ڈاکٹر سید عبداللہ)
۳۔ قومی عظمت قومی زبان سے (ڈاکٹر جمیل جالبی)
۴۔ اردو اور پاکستانی زبانیں (ڈاکٹر فرمان فتح پوری)
۵۔ اردو، اُردش اور ہمارا قومی و ملی وجود (پروفیسر فتح محمد ملک)
۶۔ کمپیوٹر اور اطلاعاتی ٹیکنالوجی کے عہد میں اردو کا مستقبل (ڈاکٹر سلیم اختر)
۷۔ قومی ترقی اور قومی زبان (ڈاکٹر نجیب جمال)
۸۔ اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے کچھ تجاویز (ڈاکٹر انوار حسین صدیقی)
۹۔ قومی زبان کا نفاذ (ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار)
۱۰۔ اردو زبان اور قومیت کی تشکیل (ڈاکٹر طاہر تونسوی)
۱۱۔ اردو میں فن ترجمہ اور ترجمہ کاری کی تربیت (ڈاکٹر عطش درانی)
۱۲۔ پاکستانی ثقافت کی تعمیر و تشکیل میں قومی زبان کا کردار (ڈاکٹر روبینہ ترین)

☆معرفت سید روح الامین، عزت اکیڈمی، گجرات

Marfat.com

۱۳۔اردو بطور ذریعہ تعلیم، امکانات مسائل اور تجاویز(ڈاکٹر اللہ رکھا ساغر کبوہ)

۱۴۔اردو رسم الخط کا تحفظ (ڈاکٹر صدیق شبلی)

۱۵۔اردو املا (محترمہ روبینہ شہناز)

۱۶۔ اردو زبان پر انگریزی کے اثرات(سید روح الامین)

موضوعات کی نوعیت سے کتاب کی اہمیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ سید روح الامین نے مختلف نقادوں اور دانشوروں کے پہلے سے لکھے ہوئے مقالوں کے ساتھ ساتھ زبان کی اہمیت، افادیت اور تقاضوں کے حوالے سے نئے مضامین بھی لکھوائے ہیں۔ عصر حاضر میں جب اردو داں اور اردو شناس طبقے میں اپنی زبان کے حوالے سے بہت سے خدشات اور وسوسے پیدا ہورہے ہیں، زبان کے تحفظ اور فروغ کے حوالے سے یہ ایک قابلِ ستائش کوشش ہے۔

اردو زبان کا ظرف مختلف زبانوں کے اثرات اور ذخیرۂ الفاظ کو بخوشی قبول کرتا ہے اور زبان اپنے دامن کو وسیع تر کرتی جاتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد اردو کو پاکستان کی قومی زبان کا درجہ دینے کے باوجود اس کے فروغ کے لیے بہت کم سنجیدہ کوششیں ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رفتہ رفتہ پاکستانیوں کے لیے غیر ملکی زبان اہمیت اختیار کرگئی اور اردو کی دلکشی اور قدرو قیمت میں کمی واقع ہونے لگی۔ اس کی ایک بڑی وجہ ارباب اختیار کی عدم توجہی بھی تھی۔ آج اردو زبان جس دوراہے پر کھڑی ہے وہاں اسے پہلے سے کئی گنا زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ یہ توجہ اہل قلم، اہل زبان اور اہل وطن کی سنجیدہ کاوشوں کی منتظر ہے۔ ان حالات میں سید روح الامین کی محنت کو نظرانداز کرنا ممکن نہیں۔ یہ اردو زبان و ادب سے ان کی محبت ہے جس نے ان سے اتنا اہم کام کرایا ہے۔

لسانیات سے دلچسپی رکھنے والے طلبا و طالبات اور اساتذہ کے لیے اس کتاب میں شامل مضامین معلومات کا بیش بہا خزانہ لیے ہوئے ہیں۔ ان کی اہمیت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہمیں اپنی لائبریریوں میں لسانیات اور اردو زبان کے حوالے سے بہت کم کتب دستیاب ہوتی ہیں۔ اردو ہے جس کا نام میں اردو کے تعارف اور شناخت کے حوالے سے اہم مضامین کی ترتیب و تدوین سے سید روح الامین نے جو ادبی خدمت سرانجام دی ہے وہ اس وقت ملک وقوم کی اہم ضرورت ہے۔

اردو کے مخالفین نے ہر عہد میں اردو کو ختم کرنے کی کوششیں کیں مگر یہ زبان آج بھی اپنی تر صداقتوں کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہیں۔ کبھی انگریزی کو مادی ترقی کا زینہ قرار دیا گیا اور کبھی کمپیوٹر کو ادب کا نعم البدل۔ سائنس و ٹیکنالوجی کے اس دور میں کمپیوٹر اور

Marfat.com

دیگر سائنسی ایجادات کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ زبان و ادب کی تاریخ اور ارتقا کو فراموش کر کے اس سے وابستگی کو شغلِ محض کا درجہ دے دیا جائے۔

سید روح الامین نے ذاتی دلچسپی کی بنا پر جو کام کیا ہے وہ دراصل یونیورسٹیوں اور زبان و ادب کی سرپرستی کرنے والے اداروں کا کام ہے۔ قوم کو اس حقیقت سے آشنا کرانا کہ ہم اپنی زبان کو جدید علوم و فنون سے آگہی کا ایک اہم وسیلہ بنا سکتے ہیں ہر صاحبِ دل پر فرض ہے۔ سید روح الامین نے بطور فرد اپنی اس ذمہ داری کا احساس کیا ہے اور اسے شائستہ انداز میں نبھایا ہے۔ اس ضمن میں ''عرضِ مؤلف'' سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

تاریخ شاہد ہے کہ خود انگلستان میں ترقی کی ابتدا اس دن سے ہوئی جس دن سے انجیل کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا۔ اگر چھوٹی سی کتاب کے ترجمے سے اتنی روشنی پھیل گئی تو اس کا اندازہ لگائیے کہ اگر پورے علوم اپنی قومی زبان اردو میں منتقل ہوجائیں تو اس سے کتنے مفید نتائج برآمد ہوں گے۔ اگر ہم اپنی ثقافت کو قائم رکھنا چاہتے ہیں اور دنیا کی زندہ اور باشعور قوموں کی صف میں اپنا نام رقم کروانا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی زندگی کے ہر شعبے میں دنیا کی دوسری باشعور قوموں کی طرح اپنی قومی زبان اردو کو عملی طور پر نافذ کرنا ہوگا اور یقین جانیے کہ ہماری بقا اور ہم آہنگی کا راز اسی میں مضمر ہے۔ یہ تھے وہ بنیادی محرکات جو اردو ھے جس کا نام کی ترتیب و تدوین کا باعث بنے (۱)

ہر وہ فرد جو اردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھتا ہے اپنے اپنے حوالے سے زبان کی بقا اور استحکام کی اس سنجیدہ کاوش کو ضرور سراہے گا۔ امید ہے سید روح الامین اس موضوع کے حوالے سے معلومات کی ترتیب و تدوین کا سلسلہ جاری رکھیں گے اور ہمیں ہماری اپنی زبان کے مسائل، تقاضوں، رجحانات اور ارتقا کے حوالے سے ہونے والی تحقیق سے باخبر رکھیں گے۔

حوالہ

۱۔ روح الامین سید (مرتب)، اردو ھے جس کا نام، (گجرات: عزت اکادمی)، ۲۰۰۴ء، ص ۲۴

☆☆☆

Marfat.com

لوحِ ایام

انقلاب ایران کی ایک دستاویز

شفیق عجمی ☆

بیسویں صدی کے ربع آخر میں ایران میں برپا ہونے والا انقلاب تاریخ عالم میں کئی حوالوں سے اہم ہے جسکی شدت کو مشرق و مغرب میں محسوس کیا گیا۔ اگر اس عظیم الشان انقلاب نے ایک عالم کو محوِ حیرت کیا تو دوسری طرف قلب ونظر کو حسرت و اہتزاز سے ہمکنار بھی کیا۔ عوام دشمن حکومتیں، بادشاہتیں، ملوکیتیں اور نام نہاد جمہورتیں سناٹے میں آ گئیں اور وحشتِ سیاست کی بدمست قوتیں غضب ناک ہوکر خاک اڑانے لگیں۔

لفظ ''انقلاب'' جو مدتوں سے محض ایک نعرہ بن کے رہ گیا تھا اور سیاسی شعبدہ بازوں نے جسے ''تماشا'' بنا کے رکھ چھوڑا تھا، انقلاب ایران نے اسے ایک زندہ حقیقت کا روپ بخشا۔

انقلاب عوام کے قلب سے پھوٹتا، پھلتا اور پھولتا ہے۔ انقلاب عوام کے ذریعے اور عوام کے لیے ہوتا ہے۔ انقلاب کی حقیقت و ماہیت سمجھنے کے لیے کسی لغت یا فرہنگ دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ انقلاب کے مفہوم کو سمجھنے اور دل و دماغ میں بسانے کے لیے انقلاب ایران پہ نظر ڈالنا اور اس کو دل میں اتارنا کافی ہے اور مختار مسعود نے ''لوح ایام'' میں یہی کام بتمام و کمال کر دکھایا ہے۔

انقلاب ایران نے صرف حیرت زدہ ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں اہل فکر ونظر کو تحقیق و تخصص کی طرف مائل بھی کیا ہے۔ ۱۹۷۹ء میں انقلاب رونما ہونے کے ساتھ ہی اسکے اسباب و اثرات کے تجزیہ وتنقید کا بھی ایک طویل سلسلہ شروع ہوا جو آج بھی کسی نہ کسی صورت میں جاری ہے۔

☆ H-164، گلشن راوی، لاہور

Marfat.com

انقلاب ایران کے حوالے سے اردو میں جو کچھ لکھا گیا وہ توقع سے کم ہے۔ ایران اور پاکستان کے نظریاتی اور جغرافیائی روابط اور اس واقعے کی تاریخی اہمیت اور وسعت کی مناسبت سے جس پیمانے پر کام کیا جانا چاہیے تھا اوّل تو وہ محدود ہے، دوم جو نقطۂ ہائے نظر مختلف مکاتب فکر کی جانب سے باقاعدہ اور سرسری تحریروں کی صورت میں سامنے آئے ہیں وہ بھی بیشتر غیر سائنسی اور غیر حقیقت پسندانہ انداز اور معیار اپنائے ہوئے ہیں۔ ابتدائی دنوں میں، اخبارات اور جرائد میں جو تبصرے اور تجزیے اور اداریے شائع ہوتے رہے ہیں، ان پر بھی عالمی ذرائع ابلاغ کی چھاپ نمایاں تھی۔

انقلاب کے بعد ایک سال کے عرصہ میں جو پہلی قابل ذکر تصنیف اردو میں لکھی گئی وہ سبط حسن کی انقلاب ایران تھی جس میں انہوں نے بڑی دقتِ نظری سے انقلاب اور اس کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا۔(۱)

سبط حسن مرحوم کی اس موضوع کے ساتھ وابستگی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ایران میں انقلابی ہلچل کے آغاز ہی پر سبط صاحب نے دوسرے موضوعات پر اپنے کام کو موخر کرکے اس اہم موضوع پر قلم اٹھانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ان کی تصنیف انقلاب ایران بجا طور پر ایرانی انقلاب کے سماجی و اقتصادی محرکات، انقلاب کے حقیقی کردار اور انقلاب کے بعد ایران میں جنم لینے والے تضادات کا معروضی تجزیہ پیش کرتی ہے۔(۲)

تاریخ اور سماجیات سے خصوصی شغف رکھنے والے سبط حسن مرحوم نے انقلاب ایران سے متعلق اپنے تجزیے کو چودہ ابواب میں بڑی جامعیت کے ساتھ سمویا ہے۔ اس میں محض انقلاب کے اسباب و محرکات کا جائزہ ہی نہیں لیا بلکہ بعض خدشات کا اظہار بھی کیا ہے جو اگلے چند برسوں میں بڑی حد تک درست ثابت ہوئے۔ دراصل انقلاب کا ان کا اپنا تصور بہت واضح اور شفاف ہے اور انہوں نے انقلاب ایران کو بھی اسی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے نزدیک انقلاب انسان کے معاشرتی عمل کا نقطۂ عروج ہے مگر وہ اتفاقاً وقوع پذیر نہیں ہوتا بلکہ اس کی نوعیت ایک تحریک اور ایک پروسیس (Process) کی ہوتی ہے۔ اس اثناء میں وقت کی رفتار تیز ہوجاتی ہے۔ لینن کے بقول زمانہ بیل گاڑی کی بجائے بھاپ کے انجن کی رفتار سے چلنے لگتا ہے۔(۳)

انقلاب کے ابتدائی مراحل ان کے تصور کے عین مطابق طے ہورہے ہیں جن سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ جبر کا بھیانک عفریت بظاہر بہت قوی لیکن درحقیقت بہت کمزور ہوتا ہے۔(۴)

Marfat.com

انقلاب ایران نے ہر مکتبۂ فکر کو غور و فکر کا سامان مہیا کیا جس کے نتیجے میں مشاہدات و تاثرات بھی قلمبند ہوئے، تبصرے اور تجزیے بھی کیے گئے اور مکالموں اور محاکموں کی مختلف صورتیں بھی سامنے آئیں۔ سبط حسن مرحوم انقلاب ایران کے حوالے سے اولین لکھنے والوں میں شامل ہوئے گو کہ ان کے نقطۂ نظر سے اتفاق نہ رکھنے والوں کی بھی کمی نہیں۔

۱۹۸۰ء میں پڑھے جانے والے شمیم احمد کے ایک مقالے کو بہت سراہا گیا بلکہ یہاں تک کہا گیا کہ پاکستان میں "اسلامی انقلاب ایران" پر اتنا خوبصورت اور جامع تجزیہ نہ پہلے کوئی پیش کرسکا اور نہ بعد میں کوئی پیش کر سکے گا۔(۵)

شمیم احمد کا حقیقی انقلاب کا تصور تین بنیادوں پر قائم ہے یعنی اولاً اس کی بنیاد کسی کتاب یا مکمل نظام حیات پر رکھی گئی ہو، ثانیاً معاشرے کی اکثریت اس کی سچائی پر کامل یقین رکھتی ہو اور ثالثاً اکثریت اپنے اعمال کی واحد کسوٹی اس کتاب کی روح کو قرار دیتی ہو۔

اس تصور انقلاب کی عملی صورت ان کی نظر میں دنیائے انسانیت کی تاریخ میں صرف ایک بار اس وقت دیکھنے میں آئی جب حضور اکرمؐ نے مالک حقیقی کی بھیجی ہوئی کامل کتاب کی بنیاد پر پورے معاشرے کو قائم کرنے اور اپنی حیات میں اسے ایک کامل اور حقیقی انقلابی ریاست بنا دینے میں کامیابی حاصل کی جس کے بعد آج تک دنیا میں کوئی انقلابی معاشرہ قائم نہ ہوسکا۔ خلافت راشدہ کے بعد سے چودہ صدیوں میں صرف حضرت عمر بن عبدالعزیز کے چند برسوں کی انفرادی کوششوں کو چھوڑ کر پوری دنیائے اسلام میں ایک دن بھی اسلامی نظام کہیں نافذ نہیں ہوسکا۔ یہ صدیاں صرف مسلمانوں کی بادشاہتوں اور مفاد پرست طبقات کا وہی گھناؤنا نظام اپنے اندر چھپائے بیٹھی ہیں جس کی بیخ کنی کے لیے اسلام آیا تھا۔ انقلاب اسلام کے بعد کی صدیوں میں عالم اسلام جن تاریخی المیوں سے دوچار ہوا، شمیم احمد ان کی نشاندہی کرتے ہیں تاکہ ایران کے انقلاب کی تاریخی معنویت اجاگر ہوسکے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ شاید عالم اسلام اجتماعی طور پر دنیائے اسلام کے کسی واقعہ پر اس قدر نہ چونکا ہو جس قدر ایران کے اسلامی انقلاب کے طرز عمل سے متاثر ہوا ہے۔ انقلاب ایران کو ایک تاریخی موڑ قرار دیتے ہوئے وہ اپنا تاریخی فیصلہ سناتے ہیں کہ جب بھی مسلمان حقیقی طور پر اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے دنیا کے کسی خطے میں اٹھیں گے تو انہیں انقلاب کا وہی راستہ اختیار کرنا ہوگا جو ایران نے اختیار کیا تھا اور وہی راہ اپنانی ہوگی جس پر ایران چلا تھا۔(۶)

شمیم احمد چودہ صدیاں پیشتر برپا ہونے والے اسلامی انقلاب کے علاوہ ہر انقلاب کو جعلی، جبری اور نام نہاد قرار دیتے ہیں جبکہ انقلاب ایران کو اسلامی انقلاب کا ایک مثالی نمونہ

Marfat.com

قرار دیتے ہوئے اس امید کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ اس کی تقلید میں مسلم معاشروں میں انقلابی عمل کا آغاز کیا جاسکتا ہے اور شاید یہ انقلاب ایران کی سرشاری کا نتیجہ ہے کہ اس انقلاب کے ایسے کئی پہلو ان کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں جن کی نشاندہی سبط حسن اور دوسرے تجزیہ نگاروں نے کی ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ انقلاب ایران پر اردو میں جو آٹھ دس کے قریب باقاعدہ کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے بیشتر ۱۹۸۴ء یا اس کے آس پاس اشاعت پذیر ہوئیں یعنی انقلاب ایران برپا ہونے کے تقریباً پانچ سال بعد جبکہ انقلاب بڑی حد تک مستحکم صورت اختیار کرچکا تھا اور حیرت، تعجب، تذبذب اور توہم سے دوچار اذہان ان کیفیات سے باہر آکر انقلاب کو ثابت و سلامت دیکھ رہے تھے اور اسے تسلیم کرنے پر اپنے کو مجبور پاتے تھے۔ بعض اصحاب ایسے بھی تھے جو اسے سرے سے انقلاب ہی ماننے کے لیے تیار نہ تھے اور بعض اسے اسلامی انقلاب قرار دیے جانے پر بھی معترض تھے۔(۷)

بدقسمتی سے ہمارے ہاں بعض ایسے خودساختہ قائد انقلاب بھی ہیں جن کو کبھی انقلاب کی ہوا نے چھوا تک نہیں، وہ بھی انقلاب ایران کو محض افراط و تفریط کا شکار قرار دیتے رہے اور انقلاب سے نظریں چراتے رہے۔

۱۹۸۴ء میں مولانا محمد منظور نعمانی کی ''ایرانی انقلاب'' (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مقدمے کے ساتھ) شائع ہوئی۔(۸) یہ بات دلچسپی سے پڑھی جانی چاہیے کہ ۲۹۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ''شیعیت'' کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے جبکہ اصل موضوع یعنی انقلاب ایران پر ایک صفحہ لکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی گئی۔

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کے ایک سفر خیال کی مختصر سرگزشت ''انقلاب ایران اور اسکی اسلامیت؟'' (عنوان کے آخر میں استفہامیہ قابل غور ہے) میں بھی فقہی اختلافی موقف غالب ہے جس کے بعد معروضی صورت حال پر غیر جانبدارانہ اظہار خیال کی توقع بیکار ہے۔(۹)

اس کے برعکس ارشاد احمد حقانی نے ''انقلاب ایران۔ ایک مطالعہ'' میں اپنے موضوع کے مختلف پہلوؤں کا بھرپور اور جامع تجزیہ پیش کیا۔ مصنف نے سفر ایران کے دوران میں نہ صرف قائدین انقلاب سے ملاقاتوں میں ان کے ارشادات کو سنا بلکہ انقلاب کے بعد کیے جانے والے بعض متنازعہ اقدامات اور ان سے جنم لینے خدشات کا واضح اظہار بھی کیا جس کے بعد ایران کی انقلابی صورت حال کو سمجھنا اور اس کی کسی واضح سمت کے بارے میں پیشین گوئی کرنا آسان ہوگیا۔

Marfat.com

کتاب کے پہلے حصے میں مصنف نے اپنی مشاہداتی رودادبیان کی ہے اور اس حوالے سے دانشگاہِ تہران کی انقلابی جدوجہد، بہشت زہرا کے مناظر اور ایرانی پارلیمنٹ کے اجلاس کا حال بیان کیا ہے۔ دوسرے حصے میں انقلاب ایران کی استعمار دشمنی، ولایت فقیہ کے تصور، ذرائع ابلاغ کے کردار اور انقلاب کو جن داخلی اور خارجی خطرات کا سامنا ہے، ان کا جائزہ لیا ہے۔

۱۹۸۵ء کے عشرے کے ابتدائی سالوں میں جب انقلاب ایران اپنے استحکام کی جانب گامزن تھا تو وطن عزیز بھی اسلام اور اسلامائزیشن کے کھوکھلے نعروں کی زد میں تھا۔
ظاہر ہے ایسی صورت حال میں انقلاب کو موضوع بناتے ہوئے پاکستان کے ساتھ اس کا تقابلی جائزہ ضروری ہوجاتا ہے۔ حقانی کی کتاب کے آخری باب میں پاکستان اور ایران میں نفاذ اسلام کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے واضح طور پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

راقم اسلام کے لیے کام کرنے کی مدعی کسی تحریک یا کسی شخصیت کے فہم اسلام پر اعتماد کا اظہار کرنے کے لیے تیار نہیں جو استعماری طاقتوں اور ان کے عالمی کردار کے خلاف شدید نفرت کے جذبات نہیں رکھتی۔"(۱۰)

ارشاد احمد حقانی کے ہی ایک ہم عصر دانشور صحافی صلاح الدین نے بھی "انقلاب ایران۔ کیا کھویا کیا پایا؟" میں ایران کی صورت حال کا غائر مطالعہ پیش کیا تھا اور اس کے بعد بھی وہ وقتاً فوقتاً اپنے ہفت روزہ جریدے میں انقلاب اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مختلف مسائل پر روشنی ڈالتے رہتے تھے کہ وہ خود کراچی کے مخصوص حالات کا شکار ہوکر چل بسے۔ البتہ حقانی آج تک خود کو ایران کے داخلی و خارجی معاملات سے باخبر رکھے ہوئے ہیں اور اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے رہتے ہیں خاص طور پر صدر خاتمی کے ایران کی دوسری مقتدر قوتوں کے ساتھ بظاہر اختلافات اور ایٹمی اسلحہ کے معائنہ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بحران سے اپنے قارئین کو باخبر رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

ایک اور صحافی اختر کاشمیری کے مشاہدات آتش کدہ ایران کی صورت میں ۱۹۸۴ء میں سامنے آئے۔ ان کا دورہ بھی حکومت ایران کی دعوت پر دارالحکومت تہران میں ہونے والی "عالمی سیرت کانفرنس" اور "ہفتہ وحدت" میں شرکت کے لیے انجام پایا جس کا کل "ثمر" مذکورہ کتاب کو قرار دیا جاسکتا ہے جو کوثر نیازی کے نزدیک ایک ادبی شہ پارہ ہے اور زبان و بیان اور شعر و ادب کی لطافت کے اعتبار سے مصنف کا قلم اپنے شباب پر ہے۔(۱۱)

Marfat.com

اس سفرنامے میں ادبیت سے زیادہ جذباتیت اور خطابت کا بازار گرم نظر آتا ہے۔ اشعار کی بھرمار سے کوئی نثری تحریر ادبی شہ پارہ کا مقام حاصل نہیں کرلیتی۔ اردو میں اگر انقلاب ایران کے حوالے سے لکھی جانے والی کسی تصنیف کو یہ مقام حاصل ہوا ہے تو وہ بلاشبہ مختار مسعود کی لوحِ ایام ہی ہے۔(۱۲) جس میں تخلیق اور تاریخ کا ایک ارفع امتزاج نظر آتا ہے جو منفرد بھی ہے اور بے مثال بھی۔

آوازِ دوست اور سفر نصیب کے مصنف کو اس کا منصب یا پھر اس کا نصیب سرزمین ایران تک لے جانے کا سبب بنا تاکہ وہ تاریخ کے ایک عظیم انقلاب کو برپا ہوتے دیکھ سکے اور پھر اس کو ایک تخلیق کی صورت میں ڈھال کر دوسروں کو بھی اس تخلیقی عمل میں شریک کرسکے۔

انقلاب ایران کے بارے میں اردو میں جو تھوڑا بہت لکھا گیا ہے اور جس کا مختصر جائزہ اوپر پیش کیا گیا ہے اس کے مقابلے میں مسعود نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان سب سے بہت مختلف ہے۔ ایک فرق کی وضاحت تو انہوں نے یہ کہہ کر خود ہی کردی ہے:

> میں نے ایران میں انقلاب کو بچشم خود دیکھا ہے۔ قدم بقدم دیکھا ہے۔ بہ تمام و کمال دیکھا ہے۔ تفصیل اور تصریح کے ساتھ دیکھا ہے۔ میں نے ایران میں انقلاب کے معنی پڑھے اور سنے ہیں بلکہ دیکھے ہیں۔(۱۳)

جبکہ دوسرے اہل قلم نے ایران سے باہر بیٹھ کر انقلاب کو موضوع بنایا یا اگر سرکاری دعوت پر ایران کا دورہ بھی کیا تو اسوقت تک انقلاب کئی کٹھن مراحل طے کرچکا تھا۔ مسعود نے شاہ اور شاہ سے بڑھ کر شاہ پرستوں کے ہاتھوں ایران کی شاہراہوں پر خون کو بہتے، گھروں کو اجڑتے اور بہشت زہرا جیسے قبرستانوں کو آباد ہوتے دیکھا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ایشیا کے طاقتور ترین حکمران کو تخت چھوڑ کر ملک سے بھاگتے اور چودہ برس کی جلاوطنی کے بعد وطن واپس آنے والے اس مردِ درویش کو دیکھا جس نے مطلق العنان بادشاہ سے ٹکر لی تھی۔

انقلاب ایران پر قلم اٹھانے والوں میں سے بیشتر کا تعلق مذہب، سیاست یا ادب و صحافت سے تھا۔لہٰذا کہیں کم کہیں زیادہ مسلک اور مکتب کی چھاپ ظاہر ہو کر رہی ہے مختار مسعود کا تعلق ملازمت سے تھا لیکن انہوں نے اس کی مجبوریوں کو آڑے نہیں آنے دیا۔ خلوص اور صداقت کو شعار اور معیار بنا کر قلم اٹھایا اور پھر انقلاب ایران کی داستانِ خونچکاں رقم کی۔

موضوع کی مناسبت سے انتخاب الفاظ کا سلیقہ، شوکت اور جلالت کا مظہر مزین اور منقش اسلوب جو دل کی گہرائیوں میں الہام بن کر اترتا چلا جائے اور فکر و نظر کو وسعتوں اور

Marfat.com

رفعتوں سے ہمکنار کردے۔ مختار مسعود کا شعری اور شعور بخش نثری اسلوب اور کس کو حاصل ہے؟ مختار مسعود ۱۹۷۸ء کے وسط میں ایران پہنچے تو اس وقت صورت حال یہ تھی کہ ایران کے سب سے بڑے حلیف امریکہ کے صدر کارٹر کو مشرق وسطیٰ کے طوفان اور پرشور سمندر میں صرف ایران ہی سکون اور آسودگی کا جزیرہ نظر آتا تھا۔ وہ اندر کے طوفان سے بے خبر تھا یا بے خبر رہنا چاہتا تھا۔ شاہ کی بے خبری کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے کہ امریکی حمایت اور مطلق العنانیت نے اسے متکبر اور منتقم بنا دیا تھا۔ ''اس شخص کے تکبر کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ اس نے قرآن مجید کا ایک بہت خوبصورت نسخہ طبع کرایا ہے مگر اپنے پیش لفظ اور اپنے دستخط کے ساتھ'' انتقام شہر شہر گلی گلی اور کوچے کوچے میں موت بن کر پھیل گیا تھا۔'' ہفتے میں ایک آدھ بار کسی نہ کسی شہر میں لوگ ذرا زیادہ ہی تعداد میں مرجاتے ہیں۔ ان اموات کو اہل اقتدار نے کبھی قابل توجہ نہ سمجھا۔ اب تہران میں بھی فٹ پاتھ دھونے میں کوئی مستعدی نہیں دکھاتا۔ خون جہاں بہتا ہے وہیں جم جاتا ہے۔ دھبا پہلے دن سرخ ہوتا ہے، دوسرے دن ٹیالا، تیسرے دن سیاہ اور پامال۔ چوتھے دن اس کا داغ بھی نہیں ملتا۔ یہ خون خاک نشیناں تھا رزق خاک ہوا۔'' ''ایران ایک وسیع قبرستان میں تبدیل ہو چکا ہے۔''

متکبر اور منتقم تو ہر مطلق العنان حکمران ہوا کرتا ہے، شاہ ملہم ہونے کی خودفریبی یا فریب کاری میں بھی مبتلا تھا۔'' اطالوی خاتون صحافی (اوریانا فلاشی) سے شہنشاہ کہتا ہے ''ایک الٰہی اور لوگوں کو نظر نہ آنے والی قوت ہر وقت میرے ساتھ رہتی ہے۔ مجھے ربانی پیغامات بھی ملتے رہتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ مجھے القا ہوتا ہے۔'' (۱۴)

انقلاب کی چاپ کو ایران میں ہر شخص سن سکتا تھا سوائے شاہ کے''اور اس کی حالت تو یہ تھی کہ'' مستقبل تو ایک طرف رہا وہ حال اور صورت حال سے بھی ناواقف تھا۔ شاہوں اور مطلق العنان حکمرانوں کو غیر ملکی حمایت بھی حاصل ہوتی ہے، ریاستی طاقت بھی لیکن وہ بصیرت سے محروم ہوتے ہیں۔ اسی لیے تو ان کے ظلم کی رسی دراز سے دراز تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ شاہ عوامی حمایت سے بھی محروم تھا اور بصیرت سے بھی۔ اسی لیے تو نہ دیکھ سکا کہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہنے والی الٰہی قوت اب اس کا ساتھ چھوڑ چکی اور ربانی پیغامات بھی اس کی مدد کے لیے موصول نہیں ہو رہے تھے۔ شاہ کی رخصتی کا وقت آن پہنچا تھا۔ ریڈیو سے ایک انتہائی اہم خبر نشر ہوتی ہے: '' شہنشاہ آج دوپہر ایک بج کر تیس منٹ پر تہران سے روانہ ہو گئے۔'' شام کو شائع ہونے والے ایک ضمیمے کی سرخی صرف دو لفظ پر مشتمل ہے: '' شاہ رفت'' نصف صدی کی پہلوی سلطنت کا قصہ دو لفظ میں تمام ہوگیا۔ شاہ کے ملک بدر ہونے کی خبر جب

Marfat.com

پیرس میں آیت اللہ خمینی کو ملی تو اس کا ردعمل بھی صرف دو لفظ پر مشتمل تھا'' اللہ اکبر''۔ (۱۵)

لوحِ ایام تین ابواب پر مشتمل ہے۔ شاہنامہ، آمرنامہ اور منظرنامہ۔ جبکہ انقلاب کے دو مراحل ہیں'' شہنشاہ کا فرار انقلاب کی کامیابی کا پہلا مرحلہ تھا۔ آیت اللہ کی آمد اور استقبال اس کا دوسرا مرحلہ ہے۔ صاحب لوحِ ایام ثناخوانِ انقلاب ہے اور استقبال انقلاب کے منظر میں دل و جان سے شریک ہے کہ عمر بھر اس نے وطن کے گلی کوچوں میں بھی انقلاب اترنے کا خواب دیکھا ہے جو انقلاب ایران کی صورت میں اب اس کے سامنے پورا ہو رہا ہے۔ وہ لاکھوں کے ہجوم میں اپنے ساتھ پندرہ سولہ سالہ سلمان مسعود کو بھی لیے پھر رہا ہے تاکہ وہ بھی انقلاب کا گواہ بن جائے، انقلاب کے منظر کو اپنی آنکھوں میں بسا کے اپنے دل میں اتار لے اور اپنی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون میں شامل کرلے۔ یہ پندرہ سولہ سالہ سلمان اس نوجوان نسل کی علامت ہے جس کے ساتھ انقلاب کی امیدیں وابستہ ہیں کہ'' جنگ کی طرح انقلاب بھی نوجوانوں کے کاندھوں پر سوار ہو کر آتا ہے۔'' نوجوان نسل کو انقلاب کی بھاری قیمت سے آگاہ کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ'' جب انقلاب کو بھوک لگتی ہے تو چڑھتی جوانیوں کو نگل جاتا ہے'' اور ان کو تنبیہ کرتا ہے کہ'' بڑے بڑے انقلاب ایک درجہ کامیاب ہونے کے بعد غلط رخ پر نکل جاتے ہیں۔'' (۱۶)

لہٰذا انقلاب کو مستحکم اور مستقیم رکھنا بھی ضروری ہے، یہ ثابت کرنا بھی ضروری ہے کہ انقلاب اسی وقت ایک عمل عظیم کہلاتا ہے جب یہ ثابت کیا جاسکے کہ انقلاب عذاب نہیں انعام کا نام ہے۔

نوجوان سلمان کو انقلاب ایران کے مناظر دکھانا ضروری ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بتانا ازحد ضروری ہے کہ ایران میں مقابلہ فقط ایک شاہ کے ساتھ تھا، وطن عزیز میں شاہوں کی تعداد کچھ زیادہ ہے۔ (۱۷)

مختار مسعود کی لوحِ ایام کا موضوع انقلاب، مقام ایران اور مقصد انقلاب بھی ہے۔ مختار مسعود نے اس مقصد کو کچھ اس طرح سے نبھایا ہے کہ گویا ہمارے دلوں کو چھو لیا ہے۔

لوحِ ایام لکھ کر انہوں نے انقلاب ایران کی ایک ایسی دستاویز مرتب کی ہے کہ جس کے ورق ورق سے انسانی جدوجہد پر ہمارا یقین اور اعتماد پختہ تر ہوتا چلا جاتا ہے لیکن ایک لمحے کے لیے ہمارا یقین اور اعتماد اسوقت متزلزل ہونے لگتا ہے جب وہ کسی گمنام ناول نگار کے ناول'' Crash-79 کا تذکرہ کچھ اس انداز سے کرتے ہیں کہ جس سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ ۱۹۷۹ء کا انقلاب ایران بھی شاید کسی امریکی ادارے کی منصوبہ بندی کے نتیجے

Marfat.com

میں رونما ہوا۔(۱۸)

شک کی ایک چنگاری یقین کے ایک پورے سلسلے کو جلا کر خاکستر کرسکتی ہے، ریاضت اکارت جاسکتی ہے، مقصد غارت ہوسکتا ہے۔

ایک معمولی وسوسہ اتنی بڑی حقیقت کو کیسے جھٹلا سکتا ہے کہ جس طرح غیر ملکی امداد سے کبھی خوشحالی اور امارت نہیں آسکتی، اسی طرح غیر ملکی حمایت سے، خواہ وہ امریکی ہی کیوں نہ ہو، نہ جمہوریت پنپ سکتی ہے نہ انقلاب برپا ہوسکتا ہے۔ ہاں پراسرار تاریکی میں فوجی بغاوتیں ضرور جنم لے سکتی ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ *انقلاب ایران* کے عنوان سے سبط حسن کی یہ تصنیف، دانیال کراچی کی طرف سے پہلی بار ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی اور اس کے بعد بھی شائع ہوچکی ہے۔

۲۔سید جعفر احمد، سبط حسن کا فکری کارنامہ، مشمولہ ریسرچ فورم نمبر ۶، کراچی، اگست ۱۹۸۷ء ص ۱۰۲

۳۔*انقلاب ایران*، ص ۸

۴۔ایضاً، ص ۱۰

۵۔شیمم احمد کا مقالہ عنوان ''ہماری تاریخ کا لمحۂ موجود'' ڈاکٹر کلیم صدیقی کے ایک مقالے ''انقلاب اسلامی ایران کے بنیادی مقاصد اور کامیابیاں'' کے ساتھ ایک کتابچے ''اسلام، مسلمان اور انقلاب'' کے عنوان سے علی پبلشرز، کوئٹہ کی جانب سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔شیمم کے مقالے کے بارے میں توصیفی کلمات سید امان اللہ شادیزئی نے اپنے مقدمے میں ادا کیے ہیں۔

۶۔ یہاں شیمم احمد کے خیالات کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے ۔ تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے، اسلام، مسلمان اور انقلاب، ص ۴۸۔۲۹

۷۔پروفیسر محمد عارف خاں نے ایسے اعتراضات کا مدلل جواب دیا ہے دیکھیے ان کی کتاب: *انقلاب ایران*، لالہ زار پبلشرز، آزاد کشمیر، ۱۹۹۱ء، ص ۱۲۰۔۱۰۴

۸۔یہ کتاب، کتب خانہ مظہری، کراچی کی طرف سے دسمبر ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی۔ سرورق پر اس کا عنوان *ایرانی انقلاب* اور اندر کے صفحہ ۲ پر نامِ کتاب *ایرانی انقلاب اور امام خمینی* درج ہے۔ ہمارے پیش نظر اس کا یہی ایڈیشن ہے۔ البتہ پروفیسر عارف نے اپنی تصنیف میں اس کا عنوان ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت لکھا ہے جو مئی ۱۹۸۵ء میں ''دین و دنیا کتاب منزل'' فیصل آباد سے شائع ہوئی اور صفحات کی کتاب ۳۰۴ لکھی گئی ہے۔

۹۔مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی، *انقلاب ایران اور اس کی اسلامیت؟* حاجی عارفین اکیڈمی، کراچی۔ پیش لفظ میں ''لندن ۲۵ مئی ۱۹۸۳ء'' کی تاریخ درج ہے۔

Marfat.com

۱۰۔دراصل مصنف نے ۱۹۸۳ء میں ایران کے سفر سے متعلق اپنے مشاہدات و تاثرات روزنامہ جنگ، لاہور میں قسط وار شائع کیے ہیں جن کو قارئین کے اصرار پر ۱۹۸۴ء میں کتابی شکل میں پیش کیا گیا۔ دیکھیے انقلاب ایران. ایک مطالعہ آئینہ ادب ، لاہور، ۱۹۸۴ء پیش لفظ، ص ۹

۱۱۔انقلاب ایران۔ ایک مطالعہ، ص ۲۳۲

۱۲۔اختر کاشمیری، آتش کدہ ایران، ندیم بک ہاؤس لاہور، ۱۹۸۴ء پیش لفظ ''دریچہ''، ص ۸

۱۳۔مختار مسعود کی لوح ایام پہلی بار فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور کی طرف سے جنوری ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئی اور اب تک مسلسل شائع ہورہی ہے۔ ہمارے پیش نظر اس کا ساتواں ایڈیشن ہے جو ۱۹۹۸ء میں طبع ہوا۔

۱۴۔لوح ایام، ص ۴۴۲

۱۵۔دیکھیے: لوح ایام، بالترتیب ص ۶۱، ۱۴۸، ۱۷۷، ۲۱۴

۱۶۔لوح ایام، بالترتیب ص ۲۲۷، ۲۴۱، ۲۴۸

۱۷۔محترمہ زہرہ نرگس کی ایک نظم کے آخری دو مصرعے'' اگر ہے فرق کہیں پر تو بے ارادہ ہے۔ کہ میرے شاہوں کی تعداد کچھ زیادہ ہے۔'' لوح ایام، ص ۴۸۷

۱۸۔لوح ایام، ناول''Crash -79'' کے بارے میں مصنف کے اشارے دیکھیے ص ۶۵، ۶۶، ۲۴۶، ۲۴۷

☆☆☆

Marfat.com

Marfat.com

PAYGHAM-E-ASHNA

ISLAMABAD-PAKISTAN

Vol-6, S.No. 21, (Spring), April to June, 2005

A Quarterly Journal on the Common Cultural Heritage of Iran, Pakistan and South Asia

Marfat.com